

ممتاز افسانے

ممتاز مفتی



جھکی جھکی آنکھیں

عذرا ان عورتوں میں سے ہے جن سے وصال میں بھی تکمیل حصول کی آرزو میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے۔ جو دلخراش حقائق سے دور کسی رنگین دنیا میں رہتی ہیں۔ یوں تو ہر عورت کی دنیا حقائق سے بے نیاز ہے مگر عذرا میں یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

عذرا کو بار بار دیکھ کر بھی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس لحاظ سے حسین ہے۔ کتابی چہرہ، حساس ناک، مسکین سے ہونٹ، حیران موٹی موٹی آنکھیں اور گداز جسم۔ اس کے حیران خوابیدہ آنکھیں جو اس کی قوتِ تکلم کا بیشتر حصہ سلب کر چکی ہیں، نہ جانے کون سی دنیا میں رہتی ہیں۔ بہر صورت وہ اس مختصر مکان میں جہاں وہ اس کا خاوند اور ساس رہتے ہیں، رہتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کا کمر کا وہ ہلکا خم جس کی وجہ سے اس کی گردن ذرا بائیں طرف مڑی رہتی ہے، بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ کسی وقت مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہی خم اس کی جاذبیت کا راز ہے۔ جب کبھی عذرا کچھ بن رہی ہو یا پڑھ رہی ہو اور جھکی جھکی آنکھوں سے باتیں کرے تو تمہارے دل میں ایک لطیف احساس پیدا ہوگا کہ بے شک زندگی بسر کرنے کے قابل ہے اور مل بیٹھنے میں ضرور راحت ہے۔ لیکن اگر وہ آنکھیں اٹھا کر تمہاری طرف نظر بھر کر دیکھ لے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ تم کیا محسوس کرو گے۔ اس وقت تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عذرا مجھ سے کوسوں دور ہے۔ یقین نہیں پڑتا کہ وہ زندگی کی حقیقت ہے یا محض خواب۔ اس وقت چراغ مدھم پڑ جاتے ہیں اور دنیا گھوم جاتی ہے۔

کوئی دس بارہ مہینے ہوئے ہوں گے جب وہ یہیں سکول میں دسویں جماعت میں پڑھا کرتی تھی۔ مگر ان دنوں اس کے انداز میں یہ بات نہ تھی۔ حیرانیاں تو اس کی نگاہ میں جھپٹنے ہی سے تھیں۔ شاید اس لئے کہ بچپن سے ہی وہ سوتیلی ماں کے پاس رہتی تھی مگر شادی کے بعد اس کی نگاہیں اور بھی حیران ہو گئیں اور اب وہ ترنم سے بھیگ چکی ہیں۔ اس کی گردن کا جھکاؤ کچھ اور جھک گیا ہے اور اس کی پلکیں کسی خوابوں کی بستی کو ڈھانپنے رکھتی ہیں۔

ان دنوں جب سکول سے لوٹا کرتی تو اس کے انداز میں ”بیگانہ روئی“ پیدا کرنے کی کوشش عیاں ہوتی۔ مگر کبھی کبھار کوئی دبی ہوئی مسرت چمک ہی پڑتی، چلتے چلتے ٹھک جاتی یا آنکھ میں ہلکا سا تبسم لہرا جاتا، جس سے صاف ظاہر ہوتا کہ اسے زندگی سے دلچسپیاں محسوس ہو رہی ہیں۔ وہ اپنے انداز میں ایسی بیگانہ روئی پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھی جو والدین کے نقطہ نظر سے ہر شریف بچی میں ہونی چاہیے۔ خدا جانے والدین اپنے بچوں میں بیداری دیکھنے کے متحمل کیوں نہیں ہو سکتے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے

تجھی کلیوں کی طرح سوئے سوئے ہی رہیں اور یونہی سوئے سوئے ہی مرجھا جائیں۔ اس لئے وہ ان میں بیداری پیدا نہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیتے ہیں اور جو پیدا ہو جاتی ہیں اسے نہ دیکھنے کا۔ عذرا کے والد موخر الذکر قسم کے آدمی تھے۔ گھر میں کھانے پینے کے لئے کافی تھا اور جمع کرنا ان کی سرشت میں نہ تھا۔ بیویوں کے معاملے میں وہ اپنے آپ کو بہت بدنصیب سمجھتے تھے۔ انہیں لگے تھے کہ ان کی بیویوں کی شادی کے فوراً بعد ہی عام ہو جانے کی قبیح عادت ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ ایسی بیوی ملے جو گونا گوں ہو اور ان کا ایمان تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی اسے ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس لئے وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ ان کے خیال میں بیوی کا یوں عام ہو جانا اس کی بدنمائی کی دلیل ہے اور وہ اپنے خیال کو اکثر ظاہر کیا کرتے تھے۔

انجینئر صاحب کی بیوی کو دیکھئے اس کی آنکھوں میں بیسیوں نگاہیں ہیں۔ ایک سے ایک نئی۔ کبھی وہ اداسی میں تو کبھی سرخی میں ڈوبی رہتی ہیں۔ کبھی ہم تمہیں جانتے ہی نہیں اور کبھی اب کہئے مزاج کیسے ہیں کی سی نگاہیں اور پھر ان کا تو رنگ بھی ادا بدلتا ہے۔ کبھی گلابی گلابی، گہری گہری گدیری، میلی میلی یہ جو پڑوس میں مسز ملک ہے نہ دیکھنے کے انداز سے دیکھنے میں اسے کس قدر ملکہ ہے اس کے بھرے ہوئے جسم میں کس قدر خم و پیچ مضطرب رہتے ہیں۔ ایک وہ عذرا کی ماں تھی کہ بیٹھ جاتی تو گھنٹوں اٹھنا محال ہو جاتا۔ بس دن بھر آلوہی چھلتی رہتی تھی اور پھر وہ زمر تھی ایک مرتبہ ساڑھی کے لئے بگڑ بیٹھی تو ہفتوں سوچ کر بیٹھ رہی اور کچھ کہہ دیا تو ایک عرصہ تک چہرے کی زردی کے سوا گھر میں کچھ نظر نہ آیا۔

عذرا کی ماں کے بعد انہوں نے زہرہ سے شادی کی تھی مگر وہ بھی چند سالوں کے بعد لقمہ اجل ہو گئی۔ خیر اس بات سے ان کی زندگی میں کوئی خاص فرق پیدا نہ ہوا۔ چونکہ شادی کے چند ماہ بعد ہی انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ زہرہ میں وہ بات نہیں۔ اب گھر میں ان کی بوڑھی ملازمہ حشمت اور عذرا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ خود تو عام طور پر باہر بیٹھک میں بیٹھے رہتے یا کبھی اندر آتے تو عذرا کو کوئی نصیحت کرنے کے لئے کہتے۔

”عذرا دوپٹہ سنبھال لو، بیٹیوں کو یوں ننگے سر بیٹھنا زیب نہیں دیتا۔“

”حشمت وہ کھڑکی کیوں کھلی ہے؟ بند کرو اسے دیکھو تو عذرا بیٹھی ہے اور گلی میں لوگ آتے جاتے ہیں۔“

”عذرا تم یہ مسز ملک و لک کے ہاں نہ جایا کرو لڑکیاں اپنے گھر بیٹھی اچھی لگتی ہیں۔“

ان نصیحتوں کے باوجود انہوں نے کبھی آنکھ بھر کر اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ بیٹی جوان ہو جائے تو جانے کیوں اسے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انہیں کبھی عذرا کی شادی کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ نہ ہی انہوں نے اسے کبھی بیٹی کہہ کر بلایا تھا۔ کیونکہ گو وہ چالیس برس کے

تھے لیکن ابھی جوان ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے دوست احباب انہیں زینت محفل سمجھتے تھے۔ باہر دیوان خانے میں جگمگاتا رہتا تھا اور قہقہوں سے درودیوار گونجتے۔

ایک روز صبح سویرے جب عذرا سکول جانے کی تیاری کر رہی تھی اور اپنا محبوب نیلا سوٹ پہنے بال بنارہی تھی تو معمول کے خلاف اس کے والد اندر آ کر خشمگین انداز سے کہنے لگے۔

”عذرا آج سے تم سکول نہ جایا کرو بس زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔“

”مگر بابا جان امتحان.....؟“ عذرا نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔ اس کا چہرہ حیرانی اور خوف سے بدنما ہورہا تھا۔

”مگر وگر کچھ نہیں۔“ انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”امتحان دینے کی ضرورت نہیں۔“

ایک ساعت کے لئے عذرا کی آنکھیں اٹھیں۔ شعلے کی طرح چمکیں مگر والد جا چکے تھے۔ حشمت نے ان آنکھوں کو دیکھا اور ایسے محسوس کیا جیسے کائنات کا ذرہ ذرہ تھر تھرا رہا ہو پھر وہ جھک گئیں۔ دو موٹے موٹے آنسو رخساروں سے ڈھلک کر لباس میں جذب ہو گئے۔ پھر وہ نگاہیں حیران ہوتی گئیں۔ اپنے ماحول سے سمٹ کر اپنے آپ میں جذب ہوتی گئیں۔ اس دن سے عذرا کو ٹھمکتے ہوئے کسی نے دیکھا اور اسے بیگانہ روئی پیدا کرنے کی شاید ضرورت ہی نہ رہی۔ شام کو وہ کوٹھے پر چلی جاتی اور گھنٹوں کھیتوں کی طرف نگاہیں جمائے ہوئے کھوئی ہوئی سی رہتی۔ حتیٰ کہ پندرہ دنوں کے اندر اندر اس کے والد نے نذر سے نکاح پڑھوا کر اسے رخصت کر دیا۔ غالباً اس لئے کہ عذرا کی بیداری کا زمانہ اس قدر مختصر تھا کہ آیا اور چلا گیا۔ وہ اس قدر گہرا اثر چھوڑ گیا جس طرح کسی ویران وادی میں کسی آوارہ طائر کی لرزتی ہوئی تان۔ چند ایک ساعت کے لئے ان خاموش مہیب چٹانوں میں ابھرا بھر کر خاموشیوں کے مسکن کو اور بھی خاموش اور بھیا تک تر چھوڑ جاتی ہے۔

اس جھٹ پٹ پر خلق خدا کے ماتھے پر شکن پیدا ہونے ہی تھے۔ چہ میگوئیاں ہوئیں، دبی دبی آوازیں اٹھیں، مگر آواز کسے کی نوبت نہ پہنچی۔ ایک تو محلے والیوں کو عذرا سے کوئی گلہ نہ تھا اور عذرا کوئی اس قدر حسین یا شوخ یا طرح دار نہیں سمجھی جاتی تھی کہ محلہ والیاں اس سے کینہ دوزی کرتیں۔ دوسرے انہیں عذرا کے والد سے بھی کوئی رنجش نہ تھی کہ انہیں نشتر کرتیں بلکہ وہ تو ان کی نکتہ رس نگاہوں سے واقف ہونے کے علاوہ ان نگاہوں کی قدر دان تھیں۔ چند ایک مثلاً انجینیر کی بیوی اور مسز ملک جنہیں آواز کسے میں ملکہ تھا۔ ان کا تو یہ گلہ تھا کہ نہ ڈھول نہ چھم چھم۔ نہ تاک نہ جھانک۔ نہ تو تو میں میں۔ یہ بھی کیا شادی ہوئی۔ کئی ایک کو تو مدت سے عذرا کی شادی کی تقریب سعید کا انتظار تھا کہ شادی ہو اور مہمان بن کر جائیں۔ حنا مالدیہ ہاتھ ہوں۔ جھلملاتی ہوئی ساڑھیاں ہوں۔ کا جل، جھمکے

بندیاں چمکیں۔ پلیٹوں سے چوڑیاں بچیں، پان بنائے جائیں اور اس افراتفری میں اچانک کوئی آنکھ تو گھونگھٹ نکالنا تو کیا دوپٹے سنبھالنا بھی مشکل ہو جائے۔ کوئی گستاخ لٹ جھٹک کر منہ پر آگرے اور ناک میں دم کر دے یا پتلی پتلی گوری گوری انگلیاں دوپٹے کو سنبھالنے کی ناکام جستجو میں عریاں رہ جائیں۔ باریک تہوں سے نظریں چھن چھن کر پڑیں۔ سفید سفید باہیں گھونگھٹ سے نکل کر کچھ دیں، کچھ لیں۔ یعنی ایسی شادی ہو کہ نام رہ جائے بلکہ چرچا ہو۔

آخر خلق خدا خلق خدا ہی ہے اور بات بات ہے جو نکل ہی جاتی ہے۔ کسی نے کہا کسی سے آنکھ لڑگئی ہوگی۔ کوئی کہنے لگی ”لو اب ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی تھی۔“ کوئی کہنے لگی ”سنا ہے اس کے ابا نے خط پکڑ لیا۔“ کوئی بولی ”ایلو بی بی وہ تو اس کے ابا نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا، دفتر سے آرہے تھے۔ باغ میں وہ اسے پہلو میں لئے بیٹھا تھا۔ تو بہ کیسا زمانہ آیا ہے۔“ غرضیکہ کئی باتیں نکلیں بلکہ کون سی بات تھی جو رہ گئی، گرد دبی دبی باتیں ہوئیں اور پھر بات آئی گئی ہوگی۔

اس بے چاری کا قصور یہی تھا کہ سکول جاتے ہوئے تانگے میں یوں آنکھیں جھکائے بیٹھی رہتی کہ مرمریں بت کا شہہ ہوتا اگر کسی شوخ چٹم کے دل میں اس بت کو دیکھ کر ایک مصور پیدا ہو جائے اور اسے اس بت میں محو کر دے تو عذرا کا اس میں کیا قصور۔ ہاں سکول کی ویران سڑک پر ہوا کھانے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔

پوری تفصیلات سے مجھے واقفیت نہیں، ہاں سلیم کا اونچا لبا قد اور فراخ شانے اور اس کا انداز بے نیازی۔۔۔۔۔ اس امر کا شاہد ہے کہ تانگ جھانک سے کوئی دلچسپی نہیں، نہ وہ خود ساختہ مصیبت مول لینے کا عادی ہے غرضیکہ وہ ان نوجوانوں میں سے نہیں جو کسی کے تصور میں اوندھے پڑے رہنے، آہیں بھرنے اور شعر پڑھنے کی دلچسپ کیفیت میں مبتلا رہنے کے مشتاق ہیں۔ چند دن تو صبح چھ بجے وہ روز اس سڑک پر اپنے سائیکل پر سوار گھومتا رہا۔ پھر ایک روز جب چھٹی کے وقت عذرا سکول کے پھانک کے قریب کھڑی اپنے تانگے کی راہ دیکھ رہی تھی تو سلیم آکر اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹ کر ایک طرف لے گیا اور اسے شانوں سے پکڑ کر پوچھنے لگا۔

”تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟ تم بولتی کیوں نہیں۔۔۔۔۔؟ اچھا“ اس نے عذرا کو جھنجھوڑ کر کہا۔ ”تم چاہے کوئی بھی ہو تم میری ہو اور تمہیں اب مجھ سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا۔“

اور پیشتر اس کے کہ عذرا سمجھتی کہ یہ کیا ہو رہا ہے یا اسے کیا کرنا چاہیے، سلیم جا چکا تھا۔ پھر اسے یاد نہیں کہ اس روز تانگے والے نے دیر سے آنے کے لئے کیا عذر پیش کیا تھا یا کسی رستے سے وہ آئے تھے یا راستے سے وہ آئے تھے یا راستے میں پھانک پر کتنی دیر انتظار کرنا پڑا تھا یا رکن پڑا بھی تھا یا نہیں اس روز اس کی آنکھیں تبسم سے آشنا ہوئی تھیں اور اس کی چال نے ٹھمکنا سیکھا تھا۔

اسے اس واقعے کی حقیقت پر اعتبار نہ آیا تھا۔ مگر اس کے بلوریں شانوں پر دو تین نیلے نیلے داغ کسی دلچسپ گرفت کے شاہد تھے اور اس کے شانوں پر لذیذ سادر دھور ہا تھا۔

اس روز اپنے طوطے سولی سے کہہ رہی تھی ”سولی چاہے تم کوئی بھی ہو تم میرے ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا کوئی بھی نہیں۔“ وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی پھر اس مصنوعی سنجیدگی نے شاید اسے گدگدا دیا۔ وہ ہنس پڑی۔ ”کیوں سولی ہے نا“ اس کے بعد ان کی دو چار سرسری ملاقاتیں ہوئیں ہوں گی اور دو چار خطوط آئے گئے ہوں گے اور بس۔ سلیم ہمیشہ کے لئے اس کے لئے چند ایک دھندلے دھندلے نقوش، چند ایک دل کی پر کیف دھڑکنیں اور ہاتھوں شانوں اور کمر پر چند ایک لطیف دباؤ اور سینے کی چند مبہم تھرتھراہٹوں کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا۔ جس قدر یہ نقوش مدھم تھے اس کے دل میں ان کے متعلق حیات اس قدر گہری تھیں۔ گاڑی میں عذرا اپنی ساس کے ہمراہ درمیانے درجے کے ڈبے میں بیٹھی تھی۔ وہ جارہی تھی مگر اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ نذر کے ساتھ جارہی ہے اس کا دل کہہ رہا تھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ سمجھتی تھی کہ خواب دیکھ رہی تھی جیسے قدرت اسے چھیڑنے کے لئے مذاق کر رہی ہو کہ وہ ابھی جاگ پڑے گی اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ خواب نہیں تو اور ہو ہی کیا سکتا تھا۔ ایسی بات کیسے ممکن تھی۔

باہر کھیتوں میں گرمی سے جھلسا ہوا پچا سبزہ لہرا رہا تھا اور سبز ہونے کے باوجود آنکھوں میں چبھتا تھا۔ ان کھیتوں کے وسیع پھیلاؤ میں یہاں وہاں بجلی کے ہیبت ناک دیونما کھمبے گرد سے اٹے ہوئے کسانوں میں یوں معلوم ہوتے تھے جیسے ٹھکنوں میں کوئی گلیور کھڑا ہو سورج چمک چمک کر تھک چکا تھا اور اس کی کرنیں زرد پڑ گئی تھیں۔ دور کہیں کہیں افق پر کوئی میلا سا ٹیلا ان جھلسے ہوئے میدانوں کے تسلسل میں دھندلے خواب کی طرح آتا اور گزر جاتا۔ عذرا اپنی خوابوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے ایسے معلوم ہوتا جیسے اس ٹیلے پر سلیم اسے بلارہا تھا جیسے دور سڑک پر جولاری جارہی تھی اس میں سلیم بیٹھا ہے۔ پھر اس کے شانے پر کوئی نامعلوم گرفت محسوس کرتے اور وہ سنتی تم میری ہو۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا۔ اور وہ ٹھٹھک کر بیدار ہو جاتی اور دیکھتی کہ نذر کی ماں اور سولی اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں مگر دونوں کی نگاہوں میں ایک دنیائے اختلاف تھی۔ ماں کی آنکھوں میں تجسس اور تشویش کو اس کی مسکراہٹیں چھپا نہ سکتی تھیں۔ اس کے برعکس سولی کی آنکھیں پر نرم معلوم ہوتی تھیں۔ غالباً وہ دونوں عذرا کے دل کی کیفیت سے واقف تھے مگر دونوں کی نگاہوں میں کوئی بھی مناسبت نہ تھی۔ وہ سوچ رہی تھی سولی بے زبان ہو کر بھی سمجھتا ہے۔ اس وقت غالباً پہلی مرتبہ اس کے دل میں سولی کو آزاد کرنے کی خواہش ہوئی۔ نہ جانے کتنی بہاریں اس نے اس پنجرے میں گزاری ہیں۔ کیا اس کے دل میں بھی اڑنے کی آرزو باقی ہے؟ کیا اس کے دل میں بھی کسی زمانے کی یاد اٹھتی ہے؟ پھر اس نے سنا کہ ماں کچھ کہہ رہی تھی۔ گاڑی اسٹیشن پر

کھڑی تھی۔ ماں پوچھ رہی تھی۔ ”عذرا بیٹی! نذر پوچھتا ہے کچھ پیوگی؟ دیکھو نا کس قدر گرمی ہے تمہیں ضرور پیاس لگی ہوگی، کیوں بیٹی؟“ اس کی آواز میں منت تھی۔ عذرا نے کنکھیوں سے دیکھا، کھڑکی میں کوئی کھڑا تھا اسے کنکھیوں سے بھی ادھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ پھر اس نے ایسے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے شانوں سے پکڑ کر اس کا منہ دوسری طرف پھیر دیا ہو۔

اس نے سنا جیسے میلوں دور کوئی کہہ رہا ہو۔ ”نہیں اماں تم کہو تو دیکھو کس قدر گرمی ہے۔“ اس بھدی آواز میں کس قدر ادا سی تھی۔ ہاں اگر سلیم اسے پوچھتا اگر وہ سلیم کے گھر جا رہی ہوتی۔ مگر سلیم، سلیم جانے کہاں ہوگا، جانے اسے حالات کا پتہ بھی تھا یا نہیں۔ شاید اپنی بے چاری عذرا کو بھول ہی چکا ہو شاید ان رنگین باتوں سے صرف مذاق مقصود ہو یا وقت کٹی۔ مگر اس کے دل کی گہرائیوں میں کوئی کہہ رہا تھا، نہیں نہیں! یہ الزام ہے، سلیم ایسا نہیں۔ پھر دوا داسی بھری متبسم آنکھیں اس کے سامنے معلق ہو جاتیں۔ نہیں! وہ آنکھیں مذاق نہیں کر سکتیں۔ حقیقت سے لبریز ہیں۔ اس کے دل میں یقین سا ہو جاتا، وہ آئے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔ وہ دنیا کا کونہ کونہ چھان مارے گا۔ شاید وہ اسی گاڑی میں موجود ہو۔ کہیں وہ بیمار نہ ہو۔ وہ ایک جھرجھری سی محسوس کرتی۔ نہیں وہ بیمار نہیں، بس نہیں۔ عذرا اپنا سر مارے گا۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹیک دیتی اور اسے ایسے محسوس ہوتا کہ وہ چوکھٹ نہیں، سلیم کے شانے ہیں۔ وہ سمٹ کر ان شانوں پر جھک جاتی۔ چاہے کچھ بھی ہو اب مجھ کو تم سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔

ساس نے اس کمرے میں ایک فراخ پلنگ پر بٹھا دیا۔ کمرے میں دھندلی روشنی تھی۔ تمام مکان سنان محسوس ہوتا تھا۔ دو چار عورتیں عذرا کو دیکھنے آئیں مگر چند منٹ ٹھہریں اور چلی گئیں۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی ویران کھنڈر میں بھوت چل پھر رہے ہوں۔ اس رات لیپ روشن نہیں معلوم ہوتے تھے اور اندھیرا ہی اندھیرا تھا، اس کی جھکی جھکی آنکھوں کے سامنے سلیم کھڑا تھا، وہ محسوس کر رہی تھی جیسے سلیم کے انتظار میں بیٹھی۔

دور ہوا درختوں میں ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی سامنے کھڑکی کے شیشے سے ایک اداس کالا درخت نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا جھوم جھوم کر منڈلا رہا تھا، لیپ کے شعلے میں سلیم کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پریشانی کی جھریاں تھیں۔

عذرا کی آنکھ کھل گئی اس نے اضطراب سے چاروں طرف دیکھا وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ سلیم کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ کیسا بیدار حسین خواب تھا۔ اس نے کروٹ بدل لی اور آنکھیں بند کر لی وہ اس خواب سے بیدار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بند ہونے کے علاوہ اس کی آنکھ میں نیند کا نشان بھی نہ تھا۔ یکلخت باہر سڑک پر کسی تانگے والے کی ”پھاڑی“ کی تان اس کے کان میں پڑی۔ تانگے کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ عذرا کے لئے پھاڑی کی تان سے کہیں زیادہ دلکش تھی۔ اس کے سامنے سکول

والی سڑک لہرا گئی۔ جب وہ آزاد تھ۔ جب وہ تانگے پر آیا کرتی تھی۔ جب پہلی مرتبہ اس نے سلیم کی حیران اور مخمور آنکھ دیکھی تھی۔ سلیم کی پہلی غلطی۔

اس کے بند بند میں درد ہو رہا تھا۔ سولی کی چیخ سن کر وہ اٹھ بیٹھی۔ بے چارہ سولی بھی اس چار دیواری میں قید محسوس کر رہا تھا۔ کمرے کی دوسری طرف کپڑے کی کرسی میں نذر سو یا ہوا تھا۔ جیسے وہ عذرا کی طرف دیکھتا ہوا سو گیا ہو۔ چہرے پر ایک تبسم سا تھا۔ جیسے کوئی خواب میں اسے گدگد رہا ہو۔ باہر فضا میں دھیمی رو پہلی روشنی پھیل رہی تھی۔

ساتھ والے کمرے سے کھڑکھڑاہٹ سی سنائی دی۔ عذرا سٹ کر چارپائی کے کونے پر ہونٹ بیٹھی۔ ”عذرا۔۔۔۔۔ نذر“ نذر کی ماں بلا رہی تھی۔ نذر لپک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر اضطراب چھا گیا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور چاروں طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں عذرا پر آ رکیں۔ پھر اس کے منہ پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے کوئی کسی لطیف خواب کو حقیقت کے لباس میں دیکھ کر کھل جائے۔

”آ یا اماں“ کہتا ہوا وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

اگلے روز دن بھر عورتیں آتی جاتی رہیں۔ ہر کسی کو عذرا کے دیکھنے کا شوق تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں جن کے لئے جوانی کے چند ایک دھندلے نقوش اور بیگانہ سے احساس تھے، عذرا کو اس انداز سے دیکھتیں جیسے کوئی اپنی گزری ہوئی دلچسپیوں کو خواب میں دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔ مگر کوئی دبی دبی ہوئی آہ اس مسکراہٹ کو اداس بنا دیتی۔ وہ شوق سے آتیں مگر کھوئے ہوئے انداز سے لوٹتیں۔ جس طرح کوئی اپنی گزشتہ زندگی کے کسی رنگین واقعے کو یاد کر کے اپنی کھوئی ہوئی جوانیوں پر رک سی محسوس کرتا ہے اور اپنے گرد ایک ادا سی اور مٹی ہوئی دنیا پاتا ہے۔ دو ایک جوانی سے سرشار لڑکیاں بھی آئیں۔ لچکتی ہوئی، ٹھمکتی ہوئی، مسکراتی ہوئی ”ہم جانتے ہیں“ کی سی مسکراہٹیں۔ ”بس یہ ظاہرداری رہنے دو“ ”ابھی تو اس نگری پر کی دبلیز پر بیٹھی ہو“ کی سی نگاہیں اچھالتی ہوئی، بنتی سنورتی، ٹپکتی ہوئیں۔۔۔۔۔۔

مگر عذرا اپنی نگری میں غم صم تھی۔ لیکن جب کوئی نووارد اس کا منہ دیکھنے کے لئے اس کا گھونگھٹ اٹھاتی تو وہ چونک پڑتی۔ پھر اسے یاد آتا کہ وہ کہاں ہے اور کون ہے اور اس کا چہرہ شرم سے تمتمتا اٹھتا۔ وہاں صرف سولی ہی ایسا متنفس تھا جو اس کے دل کی کیفیت سے واقف تھا۔

سولی اپنے پنجرے میں یوں مضطرب تھا جیسے اسے از سر نو قید کیا گیا ہو۔ وہ چاروں طرف دیکھ دیکھ کر پر پھڑپھڑاتا اور ان دیواروں کی اجنبیت محسوس کر کے بار بار چیختا۔

شام کے وقت نذر نے سولی کا پیچھرہ عذرا کے پلنگ کے قریب رکھ دیا۔ سولی نے عذرا کو دیکھ کر چیخا بند کر دیا اپنی گردن موڑ کر

اپنے بازوؤں پر رکھ دی اور عذرا کی طرف ٹکلی باندھ کر بیٹھ گیا۔ عذرا نے سولی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھ میں چمک آگئی۔ صرف سولی ہی اس کا راز دار تھا جس سے وہ سلیم کی باتیں کر سکتی تھی۔

نذر عذرا کے پاس آ بیٹھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی جھلک تھی۔ ”تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا، عذرا کچھ تو کھاؤ، اماں نے تمہاری اتنی منتیں کی ہیں۔“ اس نے دھیمی منت بھری آواز میں کہا۔ ”یہ تمہارا اپنا گھر ہے عذرا تم اس کی مالکہ ہو۔“ اس کا حلق جذبات کی بھیڑ سے رک رہا تھا۔ اس نے اپنے بھدے سے ہاتھوں میں عذرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”عذرا تم چپ کیوں ہو؟“ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی زبان کہنے والے زبان نہ تھی مگر اس کا ہاتھ خاموش اور مدہم زبان سے اپنا مفہوم ادا کر رہا تھا۔ اس وقت وہ بھدا گرم ہاتھ قوت گویائی سے زیادہ متکلم تھا۔ عذرا نے وہ پیغام کانوں سے نہیں بلکہ جسم کے بند بند میں سنا اور اس کی تمام قوت شل ہو گئی۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی مگر وہ اپنے جسم پر قادر نہ تھی۔ کوئی نامعلوم طاقت اس کی مرضی کے خلاف اس کے جسم کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔ صرف دماغ کا کوئی نحیف حصہ جسم کی اس غداری اور اپنی بے بسی پر چیخ و خم کھا رہا تھا۔ جس طرح ڈراؤنا خواب دیکھ کر کوئی چیخ چلا کر جاگ اٹھنا چاہتا ہے، مگر جاگ نہیں سکتا۔ اسی طرح عذرا بت بنی بیٹھی تھی۔ اس میں اپنا ہاتھ چھڑانے کی قدرت نہ تھی۔ اس نے ایک مخموع دھندلکے میں نذر کا ہاتھ دیکھا۔ سلیم کا ہاتھ بھی اسی طرح بڑا اور گرم تھا۔ ہاں سلیم کا ہاتھ متحرک تھا بلا کا شوخ۔۔۔۔۔ اس کے دل میں خواہ مخواہ آرزو پیدا ہو گئی کہ وہ بھدا ہاتھ متحرک ہو جائے۔ اس کی اپنی تمام قوت شوخی زندگی اس گھڑی کے لئے اس بڑے بھدے ہاتھ اور ان مضبوط بانہوں میں منتقل ہو جائے۔ اس کا جسم اس بھدے ہاتھ کے لئے منتظر تھا۔ بے تاب تھا اور وہ اپنی اس خواہش پر شرم محسوس کر رہی تھی اور پریشان تھی۔ مگر وہ احساس شرم اور پریشانی کسی نقار خانے میں طوطی تھے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں، سلیم کا ہاتھ اس کے جسم سے مس ہو رہا تھا۔ اس کی بند آنکھوں کے سامنے سلیم آ کھڑا ہوا۔ تم ہو سلیم۔۔۔۔۔ مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ اس کے شانے جھک گئے۔ سر جھک گیا اور سلیم کے شانوں پر ٹک گیا۔ سلیم کی دو مضبوط بانہیں اس کے گرد آ پڑیں۔ وہ سلیم کے پاس تھی۔

نذر کسی دفتر میں کلرک تھا۔ اس کے والد نذر کے لئے ایک معمولی سا مکان اور چند واجب الادا قریبی چھوڑ کر مرے تھے۔ وہ عذرا کے والد کے بہت گہرے دوست تھے۔ نذر نے کچھ عرصہ پہلے اتفاقاً عذرا کو دیکھ لیا تھا اور عذرا کی ننھی نگاہوں اور اس کی ٹکلی ہوئی لٹ نے اسے کئی دن پریشان رکھا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ عذرا کو اپنے خوابوں میں جگہ دینا اپنا شیرازہ مستی پریشان کرنا ہے۔ مرحوم دوست کے قلاش بیٹے کو کون خاطر میں لاتا ہے۔ جب اس نے اپنی ماں سے سنا کہ عذرا کے والد رضامند ہیں بلکہ جلد نکاح کرنے پر رضامند ہیں تو

اسے یقین نہ آتا تھا۔ اب بھی وہ کبھی کبھی سمجھتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے اور وہ ابھی جاگ اٹھے گا اور اسے احساس ہوگا کہ ایک غریب کلرک کو ایسی مدد ہوش کن خوابیں ان لامتناہی فائلوں کے سامنے کس قدر مہنگی پڑتی ہیں۔ مگر شاید یہ بھی فطرت کی ستم ظریفی تھی کہ عذرا اب صریحاً اس کی تھی۔ نذر کے لئے عذرا کی آمد مسرت کی ایسی لہر تھی جو ہر غیر متوقع خوشی میں ہم رکاب ہوتی ہے۔ اس کی خواہشات میں جو صرف ضروریات زندگی تک محدود تھیں، ساڑھیاں جھلملانے لگیں۔ پھول مہک اٹھے اور طلائی چوڑیوں کی جھنکار نغمہ زن ہو گئی۔ عذرا کے لئے حسین نازک چمک ہو، عذرا کے لئے قد آدم آئینہ ہو، عذرا کے لئے شرتی ریشم ہو، عذرا کے لئے۔۔۔۔۔ عذرا اس کی خواہشات میں بھنور بن کر آئی تھی۔

اس نے ایک چھوٹا سا ٹائپ رائٹر خریدا لیا تاکہ فرصت کے وقت ٹائپ کر کے اپنی آمدنی بڑھائے۔ یہ سب کچھ اس کے دل کی گہرائیوں میں ہوا اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ ان گہرائیوں میں کیا ہو رہا ہے۔ اور اس کی خاموشی حسرت بھری تشویش ہے۔ عذرا کو پہلی مرتبہ ساڑھی میں دیکھ کر نذر کی آنکھ میں ایک مخمور چمک آ گئی۔ بوڑھی ماں نے جھکی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کے تبسم کو محسوس کیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے غسل خانے میں یا کسی اور جگہ کوئی ضروری کام بلا رہا ہو۔ اس کی آنکھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر وہ نذر کی جرابوں میں آن ٹھہریں۔ ”بیٹا یہ جرابیں مجھے دے دو“ اس نے کہا ”دیکھو کیسی میلی ہو رہی ہیں لاؤ میں انہیں دھو دوں۔“

نذر نے چونک کر اپنی نگاہوں کو عذرا کی نیلی ساڑھی سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں اماں یہ تو اچھی بھلی ہیں پرسوں ہی تو پہنی تھیں۔“ ”نہیں بیٹا، نہیں“ ماں نے اصرار سے کہا ”کیا حرج ہے؟“ جرابیں لے کر ماں چلی گئی۔ کچھ دور تک نذر اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر عذرا کی طرف مڑ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”عذرا یہ نیلی ساڑھی تمہیں بہت زیب دیتی ہے میری طرف دیکھو نا عذرا“

نذر نے اپنے ہاتھ سے عذرا کا منہ اپنی طرف پھیر دیا، عذرا نے آنکھیں جھکا لیں۔ ہاں اس کے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا ان کو بھی نیلی پوشاک بہت پسند تھی۔ اس روز پارک میں کس شوق سے دیکھتے رہے تھے کس قدر پیار بھری نگاہیں تھیں۔ کس قدر پیاری آواز تھی۔۔۔۔۔ عذرا تمہیں نیلا لباس کس قدر زیب دیتا ہے اور کس پیار اور منت سے انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا۔ عذرا وعدہ کرو کہ تم ہمیشہ نیلا لباس پہنا کرو گی میرے لئے۔ میری خوشی کے لئے اور وعدہ لے کر کس قدر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ کس دیوانگی سے جھومے تھے۔

اس نے اپنے ہاتھ پر دباؤ محسوس کیا۔ سولی کی چیخ نے اسے بیدار کر دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے چھڑا لیا اور اٹھ کر سولی کے پنجرے کے قریب جا بیٹھی۔ وہ سولی سے باتیں کرنا چاہتی تھی، پوچھنا چاہتی تھی ”تم میرے ہونا سولی؟“ وہ محسوس کر رہی تھی کہ صرف سولی ہی ایسی ہستی ہے جس سے بات کرنے کے لئے بولنے کی ضرورت نہیں۔

انہیں نیلا رنگ پسند تھا سولی؟ وہ مجھے نیلی کہا کرتے تھے، تم جانتے ہونا، اس میں ان کے ہاتھوں کی بو ہے۔ ان کے پیار کی سلوٹیں ہیں۔ ان پھولوں کا رس ہے جو وہ میرے لئے توڑ کر لایا کرتے تھے۔ کیوں سولی تم جانتے ہونا؟ مگر تم نہیں جانتے تم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تم صرف سمجھتے ہو۔ اور سولی ان کے نچلے ہاتھ بڑے بڑے پیارے پیارے بے تکلف ہاتھ اور چھیڑ دینے والی شوخ بانہیں۔۔۔۔۔ اس کے کندھوں کے گزشتہ دباؤ تازہ ہو رہے تھے۔ وہ اٹھ بیٹھی اور اندر جا کر چار پائی پر لیٹ گئی۔ اس کی نیم وا آنکھوں نے اس مختصر کمرے کو اپنے دامن سے جھٹک دیا۔

یوں ہی دن گزر گئے، راتیں گزر گئیں، مہینے گزر گئے۔

یوں تو رہنے کو عذرا اس مکان میں رہتی تھی مگر اس کی نیم وا آنکھوں کو وہ چار دیواری قید نہ کر سکی۔ یا شاید اس چار دیواری کی وجہ سے ہی وہ آنکھیں دوہین ہو گئیں۔ وہ اپنے دل کی دنیا ان نیچی نگاہوں کی جھلکی ہوئی مڑگاں پر اٹھائے پھرتی اور شاید جھلکی ہوئی ہونے کی وجہ سے ان نگاہوں نے نذر کی دنیا بدل ڈالی۔

گو نذر ان کھوئی کھوئی نگاہوں کو دیکھ کر جیتا تھا، کبھی کبھی ان نگاہوں کی وسعتوں کو محسوس کر کے اسے ڈر محسوس ہوتا تھا مگر شاید وہ ہلکا ڈر ان نگاہوں کو نذر کے لئے اور بھی جاذب بنا رہا تھا۔ عذرا جب کبھی اپنے دل کی دنیا سے چونک پڑتی اور دیکھتی کہ نذر اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے تو وہ آنکھوں کی جھکالیتی۔ وہ ایک تبسم نذر کے لئے پیام حیات بن جاتا۔ وہ اس حیا سے لبریز تبسم کے لئے اپنی زندگی اپنا آپ۔۔۔۔۔ سبھی کچھ دینے کے لئے تیار تھا۔ پھر اس کی نظر نیلی ساڑھی پر پڑ جاتی اور وہ محسوس کرتا کہ وہ دن بدن پہننے کے ناقابل ہو رہی ہے۔ اس میں وہ چمک نہ رہی تھی۔ وہ سوچتا، دیکھو کتنی جگہوں سے پھٹ رہی ہے بوسیدہ ہو چکی ہے۔ چمک نہیں۔ پھر بھی عذرا اسے میرے لئے پہنی پھرتی ہے۔ اس لئے کہ میں اسے نیلی ساڑھی میں دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ صرف میری خوشی کے لئے۔ حالانکہ اس کے پاس سرخ ساڑھی بھی تو ہے بلکہ سرخ ساڑھی تو اور بھی قیمتی ہے۔ کتنی پیاری ہے وہ عورت جس کو خاوند کی خوشی زیبائش سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ ہندوستانی عورتیں۔۔۔۔۔ دیویاں ہوتی ہیں۔

مگر یہ ساڑھی تو بس اب پہننے کے قابل نہیں۔ گو نذر ارام کہہ رہا تھا، ایسی ساڑھی چالیس روپے کی ملے گی، چالیس روپے۔

ساڑھیاں بھی کس قدر مہنگی پڑتی ہیں۔ اس کے منہ سے بے ساختہ آہ نکل جاتی اور پھر وہ کمر جھکا کر اپنے ٹائپ رائٹر کے سامنے جا بیٹھتا۔ اس کے صبح و شام چالیس روپے کی آرزو میں بسر ہو رہے تھے۔ وہ سوچتا تھا جب چالیس روپے لے کر وہ ساڑھی لائے گا۔ عذرا دیکھے گی، خوشی بھری، تعجب بھری، محبت بھری نگاہ۔۔۔۔۔ اس لمحہ کی نگاہ حاصل کرنے کے لئے وہ عمر بھر محنت کرنے کے لئے تیار تھا۔ عذرا اس کے پاس بیٹھی رہتی۔ مگر اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نذر کو نہ دیکھا تھا بلکہ وہ نذر کے وجود یا موجودگی کے احساس سے قطعی بیگانہ تھی۔ وہ اس کے چہرے کی بناوٹ سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھی۔ صرف اس کی پیشانی اور دانت دیکھتی۔ باقی خدو خال کو اپنی نگاہوں میں اٹکنے نہ دیتی۔ شاید اس لئے کہ نذر کی پریشانی اور دانتوں میں کچھ سلیم کی سی جھلک تھی۔ وہ دونوں اکثر ایک دوسرے کے پاس بیٹھے رہتے مگر پاس بیٹھنے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور تھے۔ دن بھر وہ سولی سے باتیں کرتی رہتی اور پھر سلیم کے پاس پہنچنے کے لئے اسے صرف آنکھیں جھکانے کی ضرورت تھی۔

ایک روز دوپہر کے وقت جب عذرا اماں کے پاس بیٹھی کچھ بن رہی تھی، کوئی اجنبی عورت آ کر ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ پھر ماں جب نماز پڑھنے کے لئے گئی تو اس عورت نے عذرا کا ہاتھ پکڑ کر اس میں لپٹا ہوا کاغذ کا گولہ رکھ دیا اور اس کی مٹھی بند کر دی۔ اس نے دبی دبی ہوئی آواز سے کہا ”یہ انہوں نے دیا ہے وہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔“ پہلے تو عذرا حیرانی سے اس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی، پھر اس نے اپنی مٹھی کھول کر دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک مڑاڑا لفافہ تھا۔ اس نے لفافے کو غور سے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون آئے ہوئے تھے اور وہ بڑھیا کون تھی۔ اس کی طبیعت میں تشویش اور ڈر پیدا ہو گیا مگر وہ عورت جا چکی تھی۔

غالباً وہ اپنے خیالی سلیم سے اس قدر مانوس ہو چکی تھی اور اپنی دنیائے تصور میں اس قدر کھوپچکی تھی کہ اسے کسی جیتے جاگتے سلیم کا انتظار نہ رہا تھا۔ خیال تک بھی نہ رہا تھا۔ شاید اگر سلیم بذات خود اس وقت اس کے سامنے آ موجود ہوتا تو اسے بیگانہ محسوس ہوتا۔ بہر صورت اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ لفافہ کس کا تھا۔ اس کے دل میں اس لفافے کو کھولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی اور وہ سخت پریشانی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اس کاغذ کے گولے کو پھر سے اپنی مٹھی میں دبایا۔ اٹھ بیٹھی۔ اندر چلی گئی۔ پھر باورچی خانے میں گئی۔ صحن میں آئی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے یا کس لئے یہاں وہاں گھوم رہی ہے۔ جس طرح طوفان آنے سے پہلے کسی ویران ساحل پر کسی نامعلوم آنے والے کو ڈر محسوس کرتے ہوئے پرندے کالی اداس چٹانوں پر دیوانہ وار منڈلاتے ہیں۔

وہ چاہتی تھی کہ مٹھی میں اس کاغذ کے گولے کو بھیج بھیج کر ناپید کر دے اور اپنی دنیا کو محفوظ کر لے۔ کمرہ گھوم رہا تھا۔ اس نے اپنے

آپ کو اپنے ٹرنک کے اوپر بیٹھے ہوئے پایا۔ ٹرنک کھلا تھا۔ وہ لپٹا ہوا لفافہ اس کی گود میں پڑا تھا۔ اس نے کھوئے ہوئے انداز میں اسے پھاڑ کر کھولا۔ اس کی آنکھوں تلے الفاظ ناچ رہے تھے۔ دل دھڑک رہا تھا۔ نگاہیں تیزی سے لفظوں پر سے پھسل رہی تھیں جیسے وہ مضمون کے سحر سے بچنا چاہتی ہو۔ اس نے صرف یہی سمجھا کہ وہ آئے ہوئے ہیں اور اس کو ساتھ لے کر جانے پر مصر ہیں۔ اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زبان حال سے کہہ رہی ہو۔ بس مجھے اسی کا ڈر تھا اور یہی ہو کر رہا۔ وہ بھاگی پھر رہی تھی مگر خط کا مضمون اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اور بوند بوند اس کے دل کی گہرائیوں میں ٹپک رہا تھا۔ اس پر غلبہ پارہا تھا۔ آخر وہ پلنگ پر لیٹ گئی اور ایک ایک سطر اس کے سامنے ناچ گئی۔ جانا۔۔۔۔۔ چلے جانا۔۔۔۔۔ اس کا دل کانپ اٹھا۔۔۔۔۔ دماغ میں خلا سا پھیل گیا۔ ماحول میں کوئی مفہوم نہ رہا۔۔۔۔۔ اس وقت کائنات اس کے لئے ایک بے معنی پھیلاؤ تھی۔

رات کو وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ اس رات سلیم کی بجائے کئی اور خوفناک شکلیں اس کے خوابوں میں کھس آئی تھیں۔ بھدے بھدے ہاتھوں اور سفید سفید دانتوں والی ڈاؤنی شکلیں۔ نذر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے عذرا کو تھام لیا۔ ”کیا ہے عذرا؟“ اس کا چہرہ فکر اور خوف سے بھیا نک ہو رہا تھا۔ ”آج تمہیں کیا ہے؟ تم بیمار تو نہیں؟“ عذرا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میلوں دور کو کئی کچھ کہہ رہا ہو۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کی یادداشت صاف ہو رہی تھی۔ ”ہاں وہ عورت۔۔۔۔۔۔ دوپہر۔۔۔۔۔۔ وہ خط۔۔۔۔۔۔ ان کا خط۔۔۔۔۔۔ سلیم کا۔۔۔۔۔۔ وہ یہاں آئے ہوئے وہ مجھے لے جانا چاہتے ہیں۔“ اس نے جھرجھری لی۔ نذر کسی سے خدا جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ عذرا نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کا سر کسی کے شانوں پر جا ٹکا۔ آج پہلے دن عذرا کا سر سلیم کے شانوں پر نہ تھا، جانے تکیہ پر تھا یا پتھر پر۔۔۔۔۔۔ مگر نذر کے شانوں پر عذرا کا سر تھا اور عذرا کے بالوں کی دھیمی دھیمی خوشبو نذر کو فکر مند اور پریشان کر رہی تھی۔

عذرا کا دل کئی ایک خواہشات میں جھول رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خواہشات ایک دوسرے سے جھگڑ رہی تھیں۔ ایک حصہ سولی کی شکل میں کہہ رہا تھا۔ تم ان کی ہو عذرا۔۔۔۔۔ اور اب ان سے تم کو کوئی بھی چھین نہیں سکتا۔ فراخ پیشانی اور سفید سفید دانت کہہ رہے تھے۔ عذرا تم بیمار تو نہیں؟ تم کیا ہے؟ عذرا۔۔۔۔۔ دو بھدے ہاتھ کہہ رہے تھے۔ تم آنکھیں جھکا لو۔ عذرا تمہاری دنیا تو پاس ہے۔ سامنے سلیم کھڑا تھا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا۔ ڈراؤنی ہنسی؟ پیاری ہنسی۔۔۔۔۔

شام کو وہ سولی سے کہہ رہی تھی۔ ”سولی! تم اکیلے رہ سکو گے؟ اگر میں چلی جاؤں تو مجھے یاد کرو گے؟ مجھے برا تو نہیں کہو گے سولی؟ کیا میں ان کے ساتھ چلی جاؤں۔ وہ آج رات کو دو بجے شیشم کے درخت کے نیچے آئیں گے۔ وہ درخت جو میرے کمرے کی کھڑکی

کے باہر دکھائی دیتا ہے۔ کیوں سولی میں ان کے ساتھ چلی جاؤں؟ دنیا کیا کہے گی؟ ابا جان کیا کہیں گے؟ سولی۔۔۔۔۔ تم تو جانتے ہو۔۔۔۔۔ تم تو سمجھتے ہونا؟“

شام کو اس نے نیلی ساڑھی کو لپیٹ کر ایک پارسل بنالیا۔ اور اسے میز پر رکھ دیا۔ اس کا دل ہلکا درد محسوس کر رہا تھا۔ پھر وہ جلد ہی اپنے کمرے میں جالیٹی۔ اس روز وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سوچنے سے ڈر رہی تھی۔ اس نے ایک پرانا رسالہ اٹھالیا۔ پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر الفاظ اس کی آنکھوں تلے ناچ رہے تھے۔ صفحات کبھی سفید ہو جاتے اور کبھی الفاظ ایک دوسرے سے ٹکرا کر گھوم جاتے۔ اس نے باہر پاؤں کی چاپ سنی۔ اس روز اس کی قوت سامعہ بہت تیز ہو رہی تھی۔ اس نے نذر کی ماں کے کمرے میں جاتے ہوئے سنا۔ اس کے پاؤں کی آہٹ بتا رہی تھی کہ نذر کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ عذرا کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی۔ کھڑکی باہر سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے بوڑھا شیشم کا درخت تھا۔ سلیم آج وہاں آنے والا تھا۔ وہ اس بات کو بھول نہیں سکتی تھی۔ اس کی نظر بار بار کھڑکی سے باہر درخت پر جا جیتی۔ اس وقت کھڑکی بند تھی مگر شیشے میں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ باہر سڑک پر کبھی کبھی راہ گیر گزرتا تو اس کے پاؤں کی چاپ صاف سنائی دیتی۔ شیشم کا درخت متانت سے کھڑا تھا۔ عذرا یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ درخت اس کے راز سے واقف تھا۔ صحن والی کھڑکی میں سولی کا پنجرہ تھا۔ سولی دو روز سے خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے باتیں کرنا چھوڑ دی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سولی تمام دنیا سے بیزار ہو چکا ہو۔ پھر عذرا کی نگاہ میز پر پڑی۔ نیلی ساڑھی والے پارسل کو دیکھ کر عذرا لپک کر اٹھی۔ اس نے پارسل اٹھایا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کہاں رکھے۔ دروازے کے قریب جا کر اس نے سنا، ماں بیٹا باتیں کر رہے تھے۔

”تم نے تو اپنا آپ تباہ کر لیا ہے۔ صبح شام کام دن رات کام ہر وقت کی ٹک ٹک۔۔۔۔۔ ایک ساڑھی کے لئے اپنا آپ حلال کر رکھا ہے۔“

”نہیں اماں یہ نہ کہو“ نذر بار بار کھانس رہا تھا ”جب سے وہ آئی ہے ہم نے اسے دیا ہی کیا ہے مگر اماں وہ ایسی اچھی ہے کہ کبھی گلہ تک نہیں کیا۔ میں اسے دے ہی کیا سکتا ہوں۔ تنخواہ میں بمشکل گزارا ہوتا ہے۔“ مگر بیٹا اس کے پاس اور بھی تو ساڑھیاں ہیں وہ کیوں نہیں پہن لیتی۔ پھر وہ نیلی ساڑھی کے لئے اس قدر بے تاب ہے میں تو نہیں سمجھتی۔۔۔۔۔ ہمارے زمانے میں۔۔۔۔۔ اماں تم بھولتی ہو اس نے تو مجھے نہیں کہا۔۔۔۔۔ مگر یہ تو معمولی بخار ہے تم فکر نہ کرو۔“

نذر آیا اور آتے ہی لیٹ گیا۔ اسے تیز بخار تھا۔ عذرا کھڑکی کے سامنے چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی خاموشی کسی گہری دلی کشمکش کی چغلی کھا رہی تھی۔ اس کے بچنے ہوئے ہونٹ کسی چھپے ہوئے ہنگامے کا حال کہہ رہے تھے۔ ”تم سو جاؤ عذرا“ نذر نے دھیمی

آواز میں کہا ”تم کیوں میرے لئے بے آرام ہو میری فکر نہ کرو میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ بخار کی شدت میں کچھ کہہ رہا تھا جو اس نے کبھی نہ کہا تھا۔ جو وہ کبھی نہ کہہ سکا تھا۔ اس لئے ہاتھ میں عذرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”تم نہ ہو تیس عذرا تو میری زندگی میں یہ بات نہ ہوتی تم میری زندگی ہو۔۔۔۔۔۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں تمہیں دیکھ کر مجھے کوئی دکھ نہیں رہتا۔“ اس نے اضطراب سے دو ایک کروٹیں بدلیں۔ پھر وہ عذرا کے پاؤں کے قریب ہو گیا۔ اس قرب پر وہ خوشی محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی بچہ بڑے پیار سے کھلونے سے کھیلتا ہے۔ عذرا بت بنی بیٹھی تھی۔ شاید وہ اس کی باتیں نہیں سن رہی تھی۔ یا نہ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر یک لخت اس نے اپنے پاؤں پر دو گرم ہونٹوں کو مس کرتے ہوئے محسوس کی۔ وہ چونک اٹھی۔ کانپ اٹھی۔ اس کی نگاہیں جھک کر نذر پر جم گئیں۔ آج پہلی مرتبہ اس نے نذر کو نگاہ بھر کر دیکھا تھا اور پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ وہ نذر کے پاس ہے۔

رات کا بخار سے بے چین وہ بار بار بڑبڑا اٹھتا۔ ”چالیس روپے۔۔۔۔۔۔ نیلی۔۔۔۔۔۔ چالیس روپے“ وہ اکثر عذرا عذرا چیخ کر اٹھ بیٹھتا۔ پھر وہ عذرا کی طرف دیکھ کر کہتا ”تم میرے پاس ہونا عذرا؟۔۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔۔ تم میرے پاس ہو۔“ پھر وہ آرام سے لیٹ جاتا۔ ”تم آرام کرو عذرا تم اب سو جاؤ۔۔۔۔۔۔ تم بیمار ہو جاؤ گی میری فکر نہ کرو میں اب اچھا ہوں۔“ اس وقت عذرا کی آنکھیں کھڑکی سے ہٹ جاتیں اور وہ کسی الجھاؤ میں پڑ جاتی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس کا حلق خشک تھا۔ وہ سوچ بچار کے ناقابل تھی۔ باہر چاند کی چاندنی میں شیشم کا درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا تھا اور کوئی دھندلی سی شکل اس کے نیچے کھڑی نظر آ رہی تھی۔ عذرا بڑبڑا رہی تھی وہ آئے ہیں۔ ہاں!۔۔۔۔۔۔ عذرا کا جی چاہتا تھا کہ وہ سلیم سے جا ملے۔ کوئی اس کا دامن پکڑ لیتا۔ عذرا اٹھ بیٹھی۔ اسے پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے یا کیا کرنا چاہتی ہے۔ باہر ہوا زور سے چل رہی تھی اور درختوں کی ٹہنیاں لپٹ لپٹ کر رو رہی تھیں۔ عذرا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی نیلی ساڑھی اٹھالی۔ نذر بڑبڑا رہا تھا۔ ”نیلی چالیس روپے“ عذرا ڈر گئی۔ اس کا سر انگارے کی طرح گرم محسوس ہو رہا تھا۔ سولی نے چیخ ماری۔۔۔۔۔۔ دردناک چیخ۔ عذرا نے اسے دیکھا۔ غریب اپنے پنجرے میں یوں پھڑ پھڑا رہا تھا جیسے وہ عذرا سے کچھ کہنے کے لئے مضطرب ہو۔ میز پر پنسل پڑی تھی۔ دفعتاً عذرا نے وہ پنسل پکڑ لی وہ پارسل پر لکھ رہی تھی ”میں نہیں آ سکتی“ اس نے پنسل اپنے آپ سے چھین کر پھینک دی اس ڈر کے مارے کہ وہ لکھا ہوا کاٹ نہ دے۔ اس نے کھڑکی کھولی اور باہر دیکھے بغیر ہی وہ پارسل سڑک پر پھینک کر جھٹ دروازہ بند کر لیا جیسے وہ کھڑکی کے کھلے رہنے سے ڈر رہی ہو۔ وہ دھندلی سی شکل آگے بڑھی۔ عذرا پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بھیج کر بند کر لیں۔ اور اپنے کانوں میں انگلیاں دے دیں۔ اس کے کانوں میں ایک شور محشر سنائی دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دیکھا کوئی پارسل ہاتھ میں پکڑے جا رہا تھا۔ وہ چیخ کر

اسے بلا لینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے دل میں شکست کی آواز سنی اور دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”یہ میں نے کیا کر دیا“ یہ میں نے کیا کر دیا۔“ اس کے دل سے دیوانہ وار آوازیں آرہی تھیں۔ اس کی آنکھ سے آنسو گر رہے تھے۔ بے اختیار اس کے منہ سے چیخ پھکی کی شکل میں نکل گئی۔

نذر اٹھ بیٹھا ”کیوں عذرا۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ تم روتی ہو؟ کیوں رو رہی ہو؟ عذرا میں یہاں ہوں۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارا ہوں عذرا تم فکر نہ کرو۔ سو جاؤ۔“ نذر نے عذرا کا سراپے شانوں پر رکھ لیا۔ عذرا کی ہچکیاں رکتی نہ تھیں۔ ”میں نے کیا کر دیا“ میں نے کیا کر دیا۔ سلیم تم نہ جاؤ سلیم۔۔۔۔۔ سلیم۔“

اس نے اپنا سر جھکا لیا آنکھیں بند کر لیں۔ سلیم سامنے کھڑا تھا۔ پھر اس کا سر سلیم کے شانوں پر جھک گیا۔ ”سلیم مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔“

پھر اس نے سنا جیسے میلوں دور کوئی کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔ ”عذرا میری وفا کی دیوی“



بیگانگی

رشید نے اٹھ کر آنکھیں ملیں۔ دو ایک انگڑائیاں لیں اور کھوئے ہوئے انداز میں سیڑھیوں کے قریب جا بیٹھا۔ اس نے کوٹھے پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ تمام چار پائیاں خالی پڑی تھیں۔ سب لوگ نیچے جا چکے تھے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی سامنے اونچے اونچے مکانوں کا انبار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے لئے دنیا ایک بے معنی پھیلاؤ تھی۔ اچھا اب تو صبح ہو چکی ہے۔ اس نے ایک اور انگڑائی لیتے ہوئے محسوس کیا۔ جیسے وہ نہ ختم ہونے والے دن کی کوفت کا بوجھ محسوس کر رہا ہو۔ اس کے لئے دن ایک مسلسل کوفت تھی۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ اس کے نزدیک چھٹی سے بڑھ کر کوئی عذاب نہ تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ گھر کے تمام لوگ اس کے وجود سے ہی منکر تھے۔ اس لئے انہیں اپنے وجود اور عظمت کا احساس دلانے کے لئے اس پر لازم ہو جاتا کہ وہ آپا کے چنگی لے یا محمود کا منہ چڑائے یا محمود کے پالتو طوطے کی دم کھینچ لے۔ اور نہیں تو چیزیں ادھر ادھر کر دے۔

رشید نے ایک اور انگڑائی لی۔ اب میں کیا کروں؟ وہ مبہم طور پر محسوس کر رہا تھا۔ تمام گھر میں اسے کوئی ایسا کونہ تک نظر نہیں آتا تھا جسے وہ اپنا سکتا یا جہاں اس کی موجودگی سے بیگانگی نہ برسی۔ اس نے اکتائے ہوئے انداز سے قمیض کے دامن سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ شانے جھٹکے اور دیوار سے سہارا لگالیا۔ زندگی اس کے لئے ناقابل فہم بیگانگی سے بھری ہوئی تھی۔ وہ صرف یہ سمجھ چکا تھا کہ دنیا میں یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ کیا سے کیا ہو جائے گا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیوں رشید ہے اور محمود کیوں محمود ہے اور اس نے محمود کا سابر تاؤ کر کے آزمادیکھا تھا مگر اس کے باوجود گھر والے اس پر ”رشیدیت“ ٹھونس رہے تھے۔

اس کی نگاہیں اکتائے ہوئے انداز میں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں گھوم رہی تھیں۔ سامنے محمود کا طوطا پنجرے میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر حقارت کی ایک لہری دوڑ گئی۔ محمود کا طوطا، محمود کا طوطا۔۔۔۔۔ اس کے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا۔ جیسے اسے چھیڑ رہا ہو۔ پھر اس کی نظر سامنے کھڑک پر جا پڑی جو گلی میں کھلتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ صبح شام کی مسلسل کوفت میں صرف وہ کھڑکی ہی خوشی کی ایک امید گاہ تھی مگر وہ بوڑھا فقیر جس پر رشید اس کھڑکی میں سے پتھر پھینکا کرتا تھا، دو روز سے نہیں گزرا تھا۔ دو روز اس نے بوڑھے فقیر کے انتظار میں گزارے تھے۔ اس نے ایک جھر جھری لی اور لا شعوری طور پر اس نے ایک پتھر اٹھا کر زور سے کسی طرف پھینک دیا۔

رشید ابھی چھ ماہ کا نہ ہوا تھا اور اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ایک بڑی بہن کا بھائی ہے اور ماں باپ نے اسے سک سک کر پایا ہے۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ بذات خود کیا ہے۔ آیا وہ باپ کا نام قائم رکھنے یا ماں کا سہاگ مستحکم کرنے کے لئے ہے یا ماں باپ کے کسی خاص مقصد کے لئے ہے یا ویسے ہی ہے۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ اول تو وہ ہے ضرور اور دوسرے وہ کوئی بڑی اہم ہستی ہے اور وہ ماں باپ کی آنکھوں کا نور ہے۔ گو ہستی اور نور کے متعلق اس کے احساسات واضح نہ تھے۔ وہ جانتا تھا کہ بار بار ”اگو“ کہہ کر وہ اپنی ماں کو بلا سکتا ہے یعنی اپنی کوئی خواہش پوری کرنے کے لئے اسے صرف ہونٹ ہلانے کی ضرورت تھی۔ جب چھ سال کی مسلسل منتوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا تو ماں باپ کے لئے اسے نظر انداز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جب رشید کو پوری طرح اپنی قوت کا احساس ہو گیا تو اسے دودھ پیتے، سونے اور باقی وقت نکلے پڑے رہنے یا فضول اپنا انگوٹھا تلاش کرنے یا دور پڑی ہوئی چیزوں کو پکڑنے کی کوشش میں چنداں دلچسپی نہ رہی۔ البتہ لوگوں کو نیچا نا ضرور باعث فرحت تھا۔ اس دلچسپ شغل میں اس نے دو سال بسر کئے۔ اس عرصے میں ہزاروں انکشافات کے علاوہ اس پر یہ بھی آشکار ہوا کہ وہ بد صورت ہے۔ ابتدا میں تو اسے بد صورتی کی تفصیلات کے متعلق کوئی واقفیت نہ ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ اسے معلوم ہوتا گیا کہ اس کی ناک چھٹی ہے۔ پیشانی چھوٹی اور ہونٹ موٹے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اسے یہ نہ معلوم ہوا کہ بد صورتی عیب سمجھی جاتی ہے یا وصف۔ وہ صرف یہ جان سکا کہ ماں باپ اسے بد صورت کہہ کر یا اس کے ناک، ہونٹ اور پیشانی کے متعلق کہہ کر فرط انبساط سے اسے گود میں اٹھا کر پیار کرتے تھے۔ اس لحاظ سے تو بد صورتی بہت پیاری خصوصیت تھی۔

اس زمانے میں دنیاویوں بے معنی نہیں تھی۔ بلکہ مخصوص اصولوں پر چلتی تھی۔ اس کا ہنسنا، رونا، روٹھنا یقینی نتائج پیدا کر سکتا تھا۔ وہ دو سال اس کی زندگی میں ایک گزشتہ مگر قابل حصول رنگینی سے سرشار تھے۔ ان دنوں زندگی اس قدر پیچیدہ اور لوگ اس قدر ضدی اور اندھے نہ تھے۔ ان دنوں اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے اسے کسی دقیق عمل کی ضرورت نہ تھی۔ مگر جلد ہی وہ دن آ گیا جب وہ بات نہ رہی۔

اس روز وہ اپنی بہن کی گود میں بیٹھ کر حسب معمول قواعد کروا رہا تھا کہ ان کی ملازمہ رضیہ دوڑی دوڑی آئی اور کہنے لگی ”بی بی تمہیں مبارک ہو خدا نے تمہارے گھر ایک اور ننھا بھائی دیا ہے۔“ سلیمہ نے یہ سنا تو رشید کو یوں پنک کر بھاگ گئی جس طرح وہ خود نئے کھلونے کی آمد پر پرانے کھلونے پھینک دیا کرتا تھا۔ یہ پہلا دن تھا جب رشید کی یوں تحقیر کی گئی۔ رشید کی تحقیر۔۔۔۔۔۔ سلیمہ کی اتنی جرات۔ پہلے تو وہ حیران چپ چاپ زمین پر بیٹھا رہا۔ پھر ان سب باتوں کو سوچ کر اس نے یکھخت رونا شروع کر دیا۔ اس کی دانست

میں رونے سے بڑھ کر کوئی قوت نہ تھی۔ مگر خدا جانے اس روز اس کے رونے میں کیوں اثر نہ تھا۔ حتیٰ کہ آنسوؤں والا رونا بھی کام نہ آیا۔ پھر اسے تازہ دم ہو کر رونا پڑا۔

آخر رضیہ آئی۔ اس نے رشید کو جھنجھوڑ کر اٹھا لیا۔ اول تو رضیہ اسے منانے کو آئے۔ رضیہ ایک ادنیٰ ملازمہ۔۔۔۔۔ کس قدر بے عزتی کی بات تھی اور پھر وہ بھی اسے جھنجھوڑ کر اٹھائے۔ اس روز اس کے خیال میں دنیا کے اصول ہی بدل رہے تھے۔

[illegible]

پھر اسے یہ معلوم ہوا کہ ماں بیمار ہے اور اس نے اخذ کیا کہ بیمار اسے کہتے ہیں جس کے ارد گرد بھیڑ لگی رہے۔ جس کے لئے مٹھائیاں منگوائی جائیں اور جس کی اتنی ہی دیکھ بھال ہو جتنی کسی زمانے میں اس کی اپنی ہوا کرتی تھی۔ یعنی بیماری میں بھی وہی تاثیر تھی جو کسی زمانے میں اس کے رونے میں تھی اور اب دن بدن ضائع ہو رہی تھی۔ بیمار بن کر اس کی حکومت شاید لوٹ آئے مگر اسے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کس طرح بیمار پڑ جائے۔ اس نے دو ایک مرتبہ اپنی بیمار ماں کو اس امید پر لیٹ کر چوما کہ شاید اس طرح ماں کی بیماری اسے لگ جائے مگر اس کے باوجود گھر والے اسے بیمار سمجھنے سے منکر رہے۔ بہر حال ان دنوں اپنی مٹی ہوئی اتانیت حاصل کرنے کے لئے رونے، روٹھنے اور ضد کرنے کے علاوہ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا اور ان کے استعمال میں اس نے بڑی فراخ دلی سے کام لیا۔ مگر ان کے استعمال سے مزید مشکلات پیدا ہو رہی تھیں۔

مانا کہ ماں کے دودھ کے علاوہ وہ مٹھائی اور گوشت کے ٹکڑے بھی کھانے کا عادی تھا مگر ماں کے دودھ سے بالکل محروم کر دینا۔ کھیلنے کو بھی نہ دینا کس قدر کمینہ پن تھا۔ اس سے پہلے تو اسے بے روک ٹوک کھیلنے کی اجازت تھی۔

پہلے پہل تو اسے یہ آس رہی کہ صحت ہونے پر ماں وہی پہلی سی ماں ہو جائے گی مگر ماں نے بستر چھوڑ دیا چلنا پھرنا شروع کر دیا مگر اسے وہ محبت نہ ہوئی۔ پیار تو وہ کرتی تھی مگر وہ پیار مقابلتا ظاہری اور پھیکا محسوس ہوتا۔ ماں کا دھیان تو ہر وقت ننھے کی طرف لگا رہتا تھا۔ اسی کو ساتھ سلاتی اور رشید جب رات کو جاگتا تو وہ دیکھتا کہ وہ تن تنہا کھٹولے پر پڑا ہے۔ وہ بے چارہ اس اندھیر پر رو پڑتا اور چاہتا کہ ماں اسے پاس بلائے مگر ماں کس بیگانگی سے ہاتھ بڑھا کر اسے تھپک دیتی، جس طرح دور سے کتے کو روٹی کا ٹکڑا پھینکتے ہیں۔ آخر رشید لوگوں کی عدم توجہی سے تنگ آ کر احتجاجی حرکات کو جائز قرار دینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی حرکات سے متاثر تو کیا، ماں باپ نے انہیں سمجھنے تک کی تکلیف گوارا نہ کی۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ درد دل کا اظہار لفظوں کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ وہ سمجھتے رہے کہ رشید کو بستر پر پیشاب کرنے کی قہج عادت پڑ گئی ہے۔ اور وہ رات کو بلبل اٹھتا ہے اور اسے اسے اسہال کی شکایت ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جو گالیوں، بد دعاؤں یا لفظوں سے اپنے غصے اور دنیا کی بیوفائی کا اظہار نہیں کر سکتے، وہ درد دل کا اظہار مٹانے اور معدے سے کر سکتے ہیں۔

ماں سے مایوس ہو کر رشید نے ابا سے از سر نو رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو اس معاملے میں بالکل مجبور تھے۔ کیونکہ وہ ہر وقت سنتے تھے کہ محمود کی شکل ان پر تھی اور بد صورتی تو خیر رشید کی شکل بالکل ان پر نہ تھی۔ باپ کے لئے اس اہم تفصیل کو نظر انداز کرنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ کس طرح محمود سے غداری کر سکتے تھے۔

آخر آہستہ آہستہ رشید پر انکشاف ہو گیا کہ بلی کی دم کھینچنے اور مرغی کے پر نوچنے میں بھی راحت ہوتی ہے۔ گویہ راحت ماں باپ کا نور نظر اور گھر کا چراغ ہونے کے مقابلے میں پیچ تھی مگر راحت ضرور تھی۔ ماں باپ تو اس گوشت کے لو تھڑے میں جسے وہ محمود کہہ کر پکارتے تھے اپنا وجود کھو چکے تھے۔ صبح سے شام تک محمود کا ذکر۔ محمود کی آنکھوں، پیشانی اور ہونٹوں کے قصے۔ محمود کی صحت، مسکراہٹ اور کھیل کا رونا اور محمود بھی وہ جسے رونے تک کی تمیز نہ تھی۔ کیسی بے سری الاپتا تھا۔ رشید نے کئی دفعہ محمود کا منہ تک نوچنا گوارہ کیا کہ ماں کا قرب حاصل ہو یا اس کا منہ چومنے سے وہ خود محمود بن جائے۔ مگر والدین بھی پتھر کے بنے ہوتے ہیں۔ ان پر ان باتوں کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

ایک روز جب رشید ابا کی چھڑی کا گھوڑا بنا کر سواری کر رہا تھا اور ان کے کاغذات کو پاؤں تلے روند رہا تھا تو انہوں نے بہت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ جب رشید نے جواب میں چیخوں سے درد دل کا اظہار کیا تو انہوں نے دو ایک تھپر جڑ دیئے اور جلال میں کہنے لگے ”بہت بد معاش ہوا جا رہا ہے۔ کبھی آپا کو مار، کبھی ماں سے لڑ، گھر میں کہرام مچا رکھا ہے۔۔۔۔۔“ پاجی اس سرزنش کے دوران میں

ماں محمود کا پوٹا اٹھیک کرنے میں مصروف رہی۔ گوادھر سے پیار کی کوئی امید نظر نہ آتی، پھر بھی اسے مجبوراً فریاد لے کر ماں کے پاس جانا ہی پڑا لیکن ماں نے بھی ----- ”ہر وقت سر کھپاتا رہتا ہے“ کہہ کر ایک تھپڑ مار دیا۔ اتنا ضرور ہوا کہ ماں نے ”یہاں مر“ کہہ کر جھنجھوڑ کر اسے اٹھا لیا اور پاس لٹالیا۔ یہی تو اس کی خواہش تھی کہ وہاں مرے۔ کسی سے تھپڑ کھا کر اسے وہاں مرنے نصیب تو ہوا۔ اس کی معلومات میں یہ ایک اضافہ تھا۔

اب رشید تیسری جماعت میں تھا۔ چونکہ پچھلے سال وہ فیل ہو گیا تھا۔ رشید کے والد کو یقین تھا کہ رشید فطری طور پر کند ذہن ہے بلکہ ان کا خیال تھا کہ اس کے دماغ میں عقل سلیم کا خانہ خالی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ تیسری جماعت میں فیل ہو گیا تھا۔ گھر میں اپنے اس خیال کے متعلق اکثر بات کرنے کے عادی تھے یا وہ محمود کو ایسے انداز میں تعریف کرتے جس سے رشید کی نااہلیت اخذ ہو۔

”محمود سوالوں میں طاق ہے اگر رشید کا ذہن بھی اچھا ہوتا تو کیسی اچھی بات تھی مگر یہ رشید کا قصور نہیں۔۔۔۔۔ اس کی یادداشت ٹھیک نہیں۔۔۔۔۔ بے چارے کو باتیں یاد نہیں رہتیں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ محمود کی ماں۔۔۔۔۔ تم نے سنا۔۔۔۔۔ ادھر آنا۔۔۔۔۔ باہر محمود کا استاد آیا ہوا تھا۔ کہتا تھا، محمود تو فر فر سبق سنا دیتا ہے۔“

کسی وقت جب دونوں بچوں کے مستقبل کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ اکثر کہا کرتے۔ ”محمود۔۔۔۔۔ محمود کو تو انجینئر بنائیں گے۔ اسے رڑ کی بھیجیں گے۔۔۔۔۔ رڑ کی۔ رڑ کی سے بڑھ کر ہندوستان میں کوئی انجینئر نگ کا لُج نہیں۔ سنا تم نے محمود کی ماں۔ رڑ کی میں بہت بڑا کالُج ہے۔۔۔۔۔ شاندار“

اس دوران میں وہ محمود کی طرف اس زاویے سے دیکھتے جیسے کوئی مصور اپنے شاہکار کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر وہ چونک کر ایک موہوم سی آہ بھر کر رشید کی طرف دیکھتے۔ ”رشید محمود کے طوطے کو دق نہ کر، تمہیں تو ہر وقت شرارت سوچھتی ہے۔ محمود کی ماں! دیکھا تم نے پنجرے کو بل رہا تھا شیطان۔ محمود کی ماں۔۔۔۔۔ اگر رشید بھی ذہین ہوتا تو اسے بھی رڑکی بھیجتے۔ مگر کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ یہ تو قدرتی باتیں ہیں۔ انسان کو ان باتوں میں دخل نہیں۔ ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کیوں محمود کی ماں۔۔۔۔۔ یہ تم کیا دھور ہی ہو۔ تمہیں تو ہر وقت کام ہی رہتا ہے۔ ہاں رضیہ کہاں ہے؟ رشید میں کہتا ہوں اس پنجرے کو نہ چھیڑ۔ سنا نہیں؟“

رشید باپ کی ان پیچیدہ باتوں کے دوران جمائیاں لے لے کر تھک جاتا۔ پھر دفعتاً اس کا جی چاہتا کہ زور سے مرغی کی دم کھینچے یا

آپ کی ٹانگ میں چٹکی لے یا کسی رینگتی ہوئی چیونٹی کو پاؤں سے مسل دے۔ دنیا میں سب سے زیادہ بدنما چیز اس کے نزدیک محمود کا طوطا تھا۔

رشید اپنی جگہ سے اٹھا۔ ایک اور انگڑائی لی۔۔۔۔۔ ”اچھا تو اب کیا کروں؟“ اس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی مگر کوئی چیز اس کے لئے باعث دلچسپی نہ تھی۔ سیز ہیویوں سے نیچے اتر کر اس نے دیکھا کہ ماں، آپا اور رضیہ باورچی خانے میں ہیں۔ ابا اور محمود کی آوازیں بیٹھک میں سے آرہی تھیں۔ وہ باورچی خانے میں داخل ہوا۔ @ ”اماں“ اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”بھوک لگ رہی ہے۔“

اماں بولی ”آگئے آنکھ کھل گئی ہزار دفعہ کہا ہے کہ صبح اٹھ کر سکول کا کام کیا کرو۔“

آیا کہنے لگی ”اماں! محمود نے آج صبح دس سوال نکال لئے ہیں۔“

رشید نے ان باتوں پر دھیان نہ دیا۔ اس نے چاروں طرف سرسری سی نگاہ ڈالی اور پھر ماں سے لسی کا گلاس لے لیا۔ ماں نے کہا ”منہ ہاتھ تو دھو لیا کر، کتنا گند ہے۔“

مگر رشید کی پی چکا تھا۔ وہ اپنی قمیض سے منہ پونچھ کر گلاس صندوق پر رکھ کر باہر نکل آیا۔ کمرے میں سامنے چاقو پڑا تھا اس نے چاقو اٹھالیا اور سرسری طور پر میز کا کونہ کھرچنا شروع کر دیا۔ باہر بیٹھک سے ابا اور کسی مہمان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

”یہ بھی کیا عمر ہے۔۔۔۔۔ بادشاہی عمر۔۔۔۔۔ بچپن سے بڑھ کر زندگی میں کوئی خوشی نہیں۔“

رشید سوچ رہا تھا۔ بچپن سے بڑھ کر کوئی عمر نہیں۔ یہی بچپن۔۔۔۔۔ آخر وہ کیا بات ہے جس کی بنا پر لوگ بچپن کو اس قدر سراہتے ہیں۔ کیا باقی بچپن سے بھی زیادہ اکتا دینے والی ہے۔ اس نے ایک جھرجھری لی۔۔۔۔۔ باہر ابا کہہ رہے تھے۔

”محمود۔۔۔۔۔ محمود تو سوالوں میں بے حد طاق ہے۔ رڑکی۔۔۔۔۔ رڑکی سے بڑھ کر کوئی درس گاہ نہیں۔ سو روپیہ ماہوار خرچ۔ نصیب کی باتیں ہیں۔ وہ ہمارا رشید۔۔۔۔۔ دو سال اس سے بڑا ہے بالکل کند ذہن، کام چور، نکما۔۔۔۔۔“ ”اللہ کا ہر حال میں شکریہ ادا کرنا چاہیے۔“

رشید اٹھ بیٹھا اور برابر والے کمرے میں چلا گیا۔ شاید اس لئے کہ وہاں ابا کی آواز نہیں پہنچتی تھی یا اس لئے کہ سامنے پڑی ہوئی چٹائی سے تنکے کھینچنے کی خواہش اسے مجبور کر رہی تھی۔

باورچی خانے میں ماں کہہ رہی تھی کہ ”رضیہ وہ کہاں غائب ہو گیا ہے جاد کیجئے تو کہیں میرے صندوق میں سے کپڑے نکال کر بھاڑ

تو نہیں رہا۔ میں بھی کتنی بھول کرتی ہوں۔ صبح صندوق کو کھولا تو اسے بند نہیں کیا۔ جا دیکھ تو۔۔۔۔۔ تو بہ میں تو اس لڑکے سے عاجز آ چکی ہوں۔“

رضیہ کی آہٹ سن کر رشید چٹائی کو چھوڑ کر پرے جا بیٹھا اور ایک لوہے کے ٹکڑے سے ناخن کریدنے میں مشغول ہو گیا۔ رضیہ اندر آئی۔ اس نے نفرت سے کھولتی ہوئی نگاہ رشید پر ڈالی۔ مگر رشید بظاہر اپنے کام میں ہمہ تن مشغول تھا۔ پھر جب رضیہ صندوق کو تالا لگا رہی تھی تو نہ جانے رشید کو کیا ہوا۔ اس نے اپنے بازو میں شدید اکڑی محسوس کی۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر لپکا اور انگلیوں سے بڑھ کر رضیہ کی کمر پر چٹکی لے لی۔ اس نے بھاگتے ہوئے ”اوئی“ سنا اور پھر رضیہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ مگر وہ غسل خانے پہنچ کر بالٹی میں ہاتھ ڈبو رہا تھا اور گرتے ہوئے قطروں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ قطروں کو گرتے ہوئے دیکھ کر اسے وہ بوڑھا فقیر یاد آ گیا جس پر وہ جو بارے کی کھڑکی میں سے پتھر پھینکا کرتا تھا۔

بوڑھے کی عاجزانہ نگاہ۔۔۔۔۔ بے بسی۔۔۔۔۔ اور بے چارگی۔۔۔۔۔ اس روز جب اس کی آنکھوں سے پانی قطروں میں گر رہا تھا کس قدر مضحکہ خیز شکل تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ باہر ماں غصے سے پوچھ رہی تھی۔

”رضیہ محمود کے طوطے کا پنجرہ یہاں دھوپ میں کس نے رکھا ہے؟“

رضیہ بولی ”تو بی بی! میں نے تو ابھی اسے چوبارے میں رکھا دیکھا تھا۔ میں تو کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگاتی۔ میری تو بی بی یہ عادت ہی نہیں۔“

ماں نے ہاتھ ہلا کر کہا ”بس یہ اسی شیطان کی کارستانی ہے۔ نہ جانے محمود کے طوطے سے اسے کیا سیر ہے۔ اور بھانگی ہوتے ہیں آپس میں پیارا اور محبت سے رہتے ہیں۔ اس لڑکے پر تو محمود کو دیکھ کر بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ رضیہ!۔۔۔۔۔ لے اسے چوبارے میں رکھ اور اس کی کٹوری میں پانی ڈال دے۔“

رشید دروازے سے جھانک رہا تھا۔ ”محمود کا طوطا“ اس کے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا۔ ”کیا ہوا محمود کے طوطے کو؟“ ابا اندر آ کر کہہ رہے تھے۔ ”ہاں بس ایسا کون کام کرے گا اس لڑکے میں تو ذرہ بھر رحم نہیں۔ قصائی ہے قصائی۔ صبح شام چیزیں الٹ پلٹ کرنے کے علاوہ اسے کوئی کام نہیں۔ کل میرے دفتر کے کاغذات کی بیڑیاں بنا رہا تھا۔ نامعقول۔۔۔۔۔ لے رضیہ اسے چوبارے میں لے جا۔ محمود تو طوطے پر جان چھڑکتا ہے۔ جب تک اسے کھانا نہ لے، خود نہیں کھاتا۔ اسے جانوروں سے کس قدر محبت ہے۔ محمود کی ماں

-----محمود کی ماں!“

”کیوں اباجی۔۔۔۔۔۔“ محمود نے اندر آتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں بیٹا“ باپ نے جواب دیا ”رشید نے تمہارا طوطا دھوپ میں رکھ دیا تھا بے چارے کا گرمی کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟“

اس پر محمود بولا ”نہیں اباجی! میں نے خود طوطے کو دھوپ میں رکھا تھا۔ اس نے پانی کی کٹوری الٹ دی تھی اور پانی میں تر ہو رہا تھا۔ میں نے اسے سکھانے کے لئے دھوپ میں رکھ دیا تھا۔ پھر اسے اٹھانا مجھے یاد نہیں رہا۔“

”محمود کی ماں! محمود کی ماں۔۔۔۔۔۔“ باپ کہہ رہا تھا۔ ”تم نے سنا! محمود نے خود طوطے کو دھوپ میں رکھا تھا۔ محمود کی یہ بہت اچھی عادت ہے۔ دیکھو نا بچ بچ کہہ دینے سے بالکل نہیں گھبراتا۔ لو اگر رشید طوطے کو دھوپ میں رکھتا تو چاہے کچھ ہی ہو جاتا وہ کبھی اقرار نہ کرتا۔ رضیہ۔۔۔۔۔۔ رضیہ کہاں ہے رشید؟ رضیہ۔۔۔۔۔۔!“

”ابھی یہیں تھا“ ماں نے کہا ”جانے کہاں چلا گیا ہے؟ گلی میں ہوگا میں تو اس لڑکے سے تنگ آ چکی ہوں۔“

”خیر کوئی بات نہیں تم تو گھبرا جاتی ہو۔ یہیں کہیں ہوگا۔“ باپ نے اسے تسلی دی۔

رشید دبے پاؤں غسل خانے سے نکل کر چوبارے میں چلا گیا۔ بوڑھے فقیر کے آنے کا وقت ہو رہا تھا مگر وہ بوڑھا دودن سے نہیں آیا تھا۔

رشید کے بدن میں ناامیدی سے سستی سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس واحد عشرت سے وہ گزشتہ دو دنوں سے محروم تھا۔ اس نے چھ سات موٹے موٹے پتھر چن لئے اور کھڑکی میں بیٹھ گیا۔ سامنے مکانوں کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ گلی میں خاک اڑ رہی تھی۔ دھوپ سے آنکھیں چندھیائے جاتی تھیں۔ مکانوں سے پرے ریت کے ٹیلے کھڑے تھے۔ کہیں کہیں بگولے ناچ رہے تھے۔ وہ ان بگولوں کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

آخر وہ فقیر کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ اس نے جھر جھری لی۔ دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اپنی ٹھوڑی اس پر ٹکا دی۔ اور معصومیت بھرے انداز میں بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کسی مظلوم کے دکھ کو دیکھ کر وہ خدا سے اس کی نجات کے لئے دعا کر رہا ہو۔

انتظار اور مایوس ہو کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ سامنے والے مکان کے روشن دان پر پڑی۔ روشن دان میں سرخ شیشے کو

دیکھ کر ایک بیگانہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔ اس نے ایک پتھر اٹھا لیا اور اس سے کھیلنے لگا۔ پھر نہ جانے کیا سوچھی۔ اس کے بازو نے زور سے جھٹکا کھایا۔ پتھر سے سرخ شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ پھر وہ کھڑکی سے ہٹ کر چوکی پر آ بیٹھا۔ سامنے محمود کا طوطا پھڑپھڑا رہا تھا۔ محمود کا طوطا۔۔۔۔۔ اس کے دل سے آواز آئی۔ جیسے کوئی اسے چھیڑ رہا ہو۔ محمود کا طوطا۔۔۔۔۔ محمود کا طوطا۔۔۔۔۔ تمام فضا آوازوں سے بھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے لپک کر پنجرہ اتار لیا اور اسے دھوپ میں رکھ دیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ چوکی پر ابا کا استرا دیکھ کر رشید ٹھٹھک گیا۔ اس نے استرا اٹھا لیا۔ پتہ نہیں اس کے دل میں کیا خیال آیا۔ منہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ ”محمود کا طوطا“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ وہ پنجرے کے قریب ہو بیٹھا۔ پنجرے کا دروازہ کھل گیا۔ دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ حتیٰ کہ اسے بوڑھا فقیر بھی یاد نہ رہا۔ خچ خچ۔۔۔۔۔ لہو کی بوندیں اس کے ہاتھوں پر گر رہی تھیں۔۔۔۔۔ سرخ رنگین مخمل سالہو۔ کھڑکی سے باہر رنگین سنہری سرخی ناچ رہی تھی۔ دو بگولے آسمان پر مچلی قوس بن کر جھوم رہے تھے۔

”محمود کا طوطا“ اس کے دل کا کوئی کونہ تمسخر سے کہہ رہا تھا ”محمود۔۔۔۔۔!“



آپا

جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا بلوری دیا آ جاتا ہے جو مدھم لو سے جل رہا ہو۔ مجھے یاد ہے ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں آپا اور امی جان کہ چھوٹا بدو بھاگتا ہوا آیا۔ ان دنوں بدو یہی چھ سال کا ہوگا۔ کہنے لگا ”امی جان میں بھی باہ کروں گا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ ابھی سے۔“ اماں نے مسکراتے ہوئے کہا پھر کہنے لگیں ”اچھا بدو تمہارا بیاہ آپا سے کر دیں؟“

”اوہہ۔۔۔۔۔“ بدو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اماں کہنے لگیں ”کیوں آپا کو کیا ہے؟“

”ہم تو چھا جو باجی سے بیاہ کریں گے۔“

اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگی ”کیوں؟۔۔۔۔۔ دیکھو تو آپا کیسی اچھی ہیں۔“

”میں بتاؤں کیسی ہے؟“ وہ چلایا

”ہاں بتاؤ تو بھلا“ اماں نے پوچھا۔

بدو نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ چو لہے پر آرکی۔ چو لہے میں ایلے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ بدو نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا ”ایسی“ پھر بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگا ”اور چھا جو باجی ایسی“ اس بات پر ہم سب دیر تک ہنستے رہے۔ اتنے میں تصدق بھائی آ گئے۔ اماں کہنے لگیں ”تصدق بدو سے پوچھنا کہ آپا کیسی ہیں۔“ آپا نے تصدق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا تو منہ موڑ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ہنڈیا پکانے میں منہمک ہو۔

”ہاں تو کیسی ہے آپا؟ بدو“ وہ بولے ”بتاؤں؟“ بدو چلایا۔ اور اس نے ایلے کا ٹکڑا اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اسے

ہاتھ میں لے کر ہمیں دکھانا چاہتا تھا مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی ”اوہہ“ بدو رونے لگا تو ماں کہنے لگی ”پگے اسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے۔ اس میں چنگاری ہے۔“ ”وہ تو جلا ہوا ہے اماں“ بدو نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ اماں بولیں۔

”میرے لال یہی تمہیں معلوم نہیں اس کے اندر آگ ہے اوپر سے دکھائی نہیں دیتی۔“ بدو نے بھولے پن سے پوچھا ”کیوں آپا“

اس میں آگ ہے کیا؟“ اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ ”میں کیا جانوں؟“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی اور پھٹکنی سے اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں بے مصرف پھونکھیں مارنے لگی۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جیتی تھی۔ اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق تھیں کہ بات ابھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز بدو نے کیسے پتے کی بات کہی تھی مگر میں کہا کرتی تھی۔ ”آپا تم تو بس بیٹھ رہتی ہو۔“ اور وہ مسکرا کر کہتی ”پنگی“ اور اپنے کام میں لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی اسے کسی نہ کسی کام کے لئے کہہ دیتا اور ایک ہی وقت میں اسے کئی کام کرنے پڑ جاتے۔ ادھر بدو چیختا ”آپا میرا دلایا“ ادھر ابا گھورتے ”سجادہ ابھی تک چائے کیوں نہیں بنی؟“ بیچ میں اماں بول اٹھتی ”بیٹا دھو بی کب سے باہر کھڑا ہے۔“ اور آپا چپ چاپ سارے کاموں سے نپٹ لیتی۔ یہ تو میں خوب جانتی تھی مگر اس کے باوجود جانے کیوں اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا کام کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی ہی رہتی ہے اور اسے ادھر سے ادھر گردن موڑنے میں بھی اتنی دیر لگتی ہے۔ اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میں نے آپا کو قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں سنا۔ زیادہ سے زیادہ مسکرا دیا کرتی تھی اور بس۔ البتہ وہ اکثر مسکرایا کرتی۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ہاں تو میں سمجھتی تھی کہ آپا بیٹھی ہی رہتی ہے۔ ذرا نہیں ہنستی اور بن چلے لڑھک کر یہاں سے وہاں پہنچ جاتی ہے۔ جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ کتنے مزے میں چلتی تھی جیسے دادرے کی تال پر ناچ رہی ہو۔ اور اپنی خالہ زاد بہن سا جو باجی کو چلتے دیکھ کر میں کبھی نہ اکتائی۔ جی چاہتا تھا کہ باجی ہمیشہ میرے پاس رہے اور چلتی چلتی اسی طرح گردن موڑ کر پنچم آواز میں کہے ”ہیں جی۔۔۔۔۔ کیوں جی؟“ اور اس کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگے۔ باجی کی بات بات مجھے کتنی پیاری لگتی تھی۔

ساحرہ اور ثریا ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں۔ دن بھر ان کا مکان ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بس میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں کے گھر میں جا رہوں۔ ہمارے گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ایک بیٹھ رہنے والی آپا ایک ”یہ کرو وہ کرو“ والی اماں اور دن بھر حقے پر گڑ گڑانے والے ابا۔

اس روز جب میں نے ابا کو امی سے کہتے سنا ”سچ تو یہ ہے کہ مجھے بے حد غصہ آیا۔ ابا کہنے لگے ”سجادہ کی ماں! معلوم ہوتا ہے کہ ساحرہ کے گھر میں بہت سے برتن ہیں۔“

”کیوں؟“ اماں پوچھنے لگی۔

کہنے لگے ”بس تمام دن برتن بجتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ اور یا قہقہے لگتے ہیں جیسے میلہ لگا ہو۔“

اماں تنک کر بولیں ”مجھے کیا معلوم! آپ تو بہت لوگوں کے گھر کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔“

ابا کہنے لگے ”افوہ۔۔۔۔۔ میرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی برتن بجتے لگے۔ بازار کے موڑ تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ فلاں گھر میں لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ مگر دیکھو نا ہماری سجادہ میں یہ بات نہیں۔“

میں نے ابا کی بات سنی اور میرا دل کھولنے لگا۔ بڑی آئی ہے سجادہ۔ جی ہاں اپنی بیٹی جو ہوئی۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ جا کے باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا منہ چڑاؤں۔ اسی بات پر میں نے دن بھر کھانا نہ کھایا اور دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ ابا جان جانتے ہی کیا ہیں۔ بس حقہ لیا اور گڑ گڑ کر لیا یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور گٹ مٹ گٹ مٹ کرنے لگے۔ جیسے کوئی بھٹیاری مکئی کیک دانے بھون رہا ہو۔ سارے گھر میں لے دے کے صرف تصدق بھائی ہی تھے دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے اور جب ابا گھر پر نہ ہوتے تو وہ بھدی آواز میں گایا بھی کرتے تھے۔

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں نمی سی ہے

نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

آپا انہیں گاتے سن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی تو وہ بدو کو ہلکا سا پھر مار کر کہتی ”بدو رونا“ اور پھر آپ ہی مسکراتی رہتی۔

تصدق بھائی میرے پھوپھا کے بیٹے تھے۔ انہیں ہمارے گھر آئے کوئی یہی دو ماہ ہوئے تھے۔ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ بورڈنگ میں رہا کرتے تھے پھر ایک دن جب پھوپھی آئی ہوئی تھیں تو باتوں میں ان کا ذکر چھڑ گیا۔ پھوپھی کہنے لگی بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں۔ لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اماں اس بات پر خوب لڑیں۔ کہنے لگیں ”اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب۔“ پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اماں کی تو عادت ہے کہ اگلی پچھلی بہت سی باتیں لے بیٹھتی ہیں۔ غرضیکہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر ہمارے ہاں آ ٹھہرے۔

تصدق بھائی مجھ سے اور بدو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں۔ بدو سے تو وہ دن بھر نہ اکتاتے۔ البتہ آپا سے زیادہ باتیں نہ کرتے۔ کرتے بھی کیسے! جب کبھی وہ آپا کے سامنے جاتے تو آپا کے دوپٹے کا پلو آپ ہی آپ سرک کر نیم گھونگھٹ بن جاتا اور آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں شدت سے مصروف دکھائی دیتیں۔

اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپ ان کی باتیں بڑے غور سے سنا کرتی تھی، گو کہ ہتی کچھ نہ تھی۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپ کے متعلق پوچھتے رہتے لیکن صرف اسی وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوتے۔ پوچھتے ”بدو تمہاری آیا کیا کر رہی ہیں؟“

”آپا۔۔۔۔۔“ بدولا پرواہی سے دہراتا ”بیٹھی ہے۔۔۔۔۔ بلاؤں؟“

بھائی صاحب گھبرا کر کہتے ”نہیں نہیں! اچھا بدو۔۔۔۔۔ آج تمہیں یہ دیکھو اس طرف“ تمہیں دکھائیں۔“ اور جب بدو کا دھیان ادھر ادھر ہو جاتا تو مدھم سی آواز میں کہتے ”ارے یاد تم تو مفت کا ڈھنڈور ہو۔“ بدو چیخ اٹھتا ”کیا ہوں میں؟“ اس پر وہ میز بجانے لگتے۔ ڈمگ ڈمگ۔۔۔۔۔ ڈھنڈور! یعنی یہ ڈھنڈور ہے۔ دیکھا جسے ڈھول بھی کہتے ہیں۔ ڈمگ ڈمگ سمجھے!۔۔۔۔۔ اور آپ اکثر چلتے چلتے ان کے دروازے پر رک جاتی اور ان کی باتیں سنتی رہتی اور پھر چولہے کے پاس بیٹھ کر آپ ہی آپ مسکراتی۔ اس وقت اس کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا۔ بالوں کی لٹ پھسل کر گالوں پر آ گرتی اور وہ بھیگی بھیگی آنکھیں چولہے میں ناچتے ہوئے شعلوں کی طرح جھومتیں۔ آپا کے ہونٹ یوں ہلے، گویا گارہی ہو۔ مگر الفاظ سنائی نہ دیتے۔ ایسے میں اگر اماں یا ابا باورچی خانے میں آ جاتے تو آٹا ٹھنک کر یوں اپنا دوپٹہ بال اور آنکھیں سنبھالتی گویا کسی بے تکلف محفل میں کوئی بیگانہ آ گیا ہو۔

ایک دن میں آ پا اور اماں صحن میں تھیں۔ اس وقت بھائی اندر اپنے کمرے میں بدو سے باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بھائی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم باہر بیٹھے ہوئے ان کی باتیں سن رہے ہیں۔ بھائی صاحب بدو سے کہہ رہے تھے۔ ”میرے یار، ہم تو اس سے بیاہ کریں گے جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے، کتابیں پڑھ سکے۔ شطرنج، کیرم اور چڑیا کھیل سکے۔ چڑیا جانتے ہو؟ وہ گول گول پروں والا گیند بلے سے یوں ڈزٹن ڈز۔ اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزیدار کھانے پکا کر کھلا سکے۔۔۔۔۔“

بدو بولا ”ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔“

”اونہیہ۔۔۔۔۔۔“ بھائی نے کہا

بدو چیخنے لگا ”میں جانتا ہوں۔ تم آ پا سے بیاہ کرو گے۔۔۔۔۔۔ ہاں“

اس وقت اماں نے آپا کی طرف دیکھا مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اس قدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے۔ ”واہ تمہاری آپا فرنی پکاتی ہے تو پوری طرح شکر بھی نہیں ڈالتی۔ بالکل پھینکی۔۔۔۔۔ آخ
تھو۔“

بدونے کہا ”ابا جو کہتے ہیں کہ فرنی میں کم میٹھا ہونا چاہیے۔“

”تو وہ ابا کے لئے پکاتی ہے ہمارے لئے تو نہیں۔“

”میں کہوں آپاے؟“ بدو چیخا

بھائی چلائے ”اوہ پگلا ڈھنڈورا۔ تو تمہیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں۔ یہ دیکھو اس طرح ڈمگ ڈمگ۔ بدر پھر چلانے لگا“ میں جانتا ہوں تم میز بجا رہے ہونا؟“ ”ہاں ہاں اسی طرح ڈھنڈور پٹتا ہے نا؟“ بھائی کہہ رہے تھے ”کشتیوں میں۔۔۔۔۔ اچھا بدو تم نے کبھی کشتی لڑی ہے۔ آؤ ہم تم کشتی لڑیں۔ میں ہوا گا ما اور تم بدو پہلوان۔ ذرا ٹھہرو! جب میں تین کہوں تب“ اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مدھم آواز سے کہا ”ارے یار تمہاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے۔“

میرا خیال ہے آپا ہنسی نہ روک سکی۔ اس لئے وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا اور اماں نے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا۔

میں اور آپ دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بھائی صاحب آگئے اور کہنے لگے ”کیا پڑھ رہی ہو ج... ہے... نا؟“ ان کے منہ سے جھینسا سن کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد نفرت تھی۔ نور جہان کیسا پرانا نام ہے۔ بولتے ہی منہ میں باسی روتی کا مزہ آنے لگتا ہے۔ میں تو نور جہاں سن کر یوں محسوس کیا کرتی تھی جیسے کوئی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے کوئی بوڑھی اماں سونٹا ٹیکتی ہوئی آرہی ہوں۔ مگر بھائی صاحب کو نام بگاڑ کر اسے سنوارنے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے منہ سے جھینسا سن کر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی اور میں محسوس کرتی گویا ایران کی شہزادی ہوں۔ آپا کو وہ سجادہ سے سجدے کہا کرتے تھے۔ مگر وہ تو پرانی بات تھی۔ جب آپا چھوٹی تھی۔ اب تو بھائی اسے سجدے نہ کہتے بلکہ اس کا پورا نام تک لیتے گھبراتے تھے۔ خیر میں نے جواب دیا ”سکول کا کام کر رہی ہوں۔“ پوچھنے لگے کہ ”تم کوئی برنارڈ شا کی کتاب پڑھی ہے کیا؟“

میں نے کہا ”نہیں“

انہوں نے میرے اور آپا کے درمیان والی دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تمہاری آپا نے تو ہارٹ بریک ہاؤس پڑھی ہوگی۔“ وہ کنکھیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

آیا نے نظریں اٹھائے بغیر ہی سر ہلادیا اور مدھم مدھم سی آواز میں کہا ”نہیں“ اور سوئیٹر بننے میں لگی رہی۔

بھائی بولے ”کیا بتاؤں جہینا کہ وہ کیا چیز ہے‘ نشہ ہے نشہ۔ خالص شہد۔ تم اسے ضرور پڑھو۔ بالکل آسان ہے یعنی امتحان کے بعد

ضرور پڑھنا۔ میرے پاس پڑی ہے۔“

میں نے کہا ”ضرور پڑھوں گی۔“

پھر بوجھنے لگے ”میں کہتا ہوں تمہاری آیا نے میٹرک کے بعد پڑھنا کیوں چھوڑ دیا؟“

میں نے چڑ کر کہا ”مجھے کیا معلوم؟ آپ خود ہی پوچھ لیجئے۔“ حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ آپ نے کالج جانے سے کیوں انکار کر دیا تھا۔ ”میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا۔ وہاں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی نمائش گاہ ہو۔ درس گاہ تو معلوم ہی نہیں ہوتی۔ جیسے مطالعے کے بہانے میلہ لگا ہو۔“ مجھے آپ کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ گھر بیٹھ رہنے والی ہے۔ کالج جانا نہیں چاہتی۔ بڑی آئی تھی نکتہ چیں۔

اس کے علاوہ جب کبھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو میں خواہ مخواہ چڑ جاتی۔ آپا تو بات کا جواب تک نہیں دیتی۔ اور یہ آپا آپا کر رہے ہیں۔ اور پھر آپا کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب؟ میں کیا ٹیلیفون تھی؟ خود آپا سے پوچھ لیتے اور آپا بیٹھی ہوئی گم صم بھیگی ملی۔

شام کو ابا کھانے پر بیٹھے ہوئے چلا اٹھے ”آج فرنی میں اتنی شکر کیوں ہے؟ قد سے ہونٹ چپکے جا رہے ہیں۔ سجادہ۔۔۔۔۔“
سجادہ میٹی! کیا چینیں اتنی سستی ہو گئی ہے۔ ایک لقمہ نگلنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔“

آپا کی بھگی بھگی آنکھیں جھوم رہی تھیں۔ حالانکہ جب کبھی ابا جان خفا ہوتے تو آپا کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا مگر اس وقت اس کے گال متمل رہے تھے۔ کہنے لگی ”شاید زیادہ پڑ گئی ہو۔“ یہ کہہ کر وہ توباورچی خانے میں چلی گئی اور میں دانت پیس رہی تھی۔ شاید کیا خوب شاید۔

ادھر ابا بدستور بڑبڑا رہے تھے۔ ”چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں، فرنی میں قند بڑھتی جا رہی ہے۔“ صحن میں اماں دوڑی دوڑی آئیں اور آتے ہی ابا پر برس پڑیں جیسے ان کی عادت ہے۔ ”آپ تو ناحق بگڑتے ہیں۔ آپ ہلکا میٹھا پسند کرتے ہیں تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں۔ اللہ رکھے گھر میں جو ان لڑکا ہے۔ اس کا تو خیال کرنا چاہیے۔“ ابا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ کہنے لگے ”اوہ یہ بات ہے مجھے بتا دیا ہوتا۔ میں کہتا ہوں سجادہ کی ماں۔۔۔۔۔۔“ اور وہ دونوں کھسر پھسر کرنے لگے۔

آپا ساحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی تو میں بڑی حیران ہوئی۔ آپا ان سے ملنا تو کیا بات کو ناپسند کرتی تھی۔ بلکہ اس کے نام پر ہی ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ ضرور کوئی بھیید ہے اس بات میں۔ کبھی کبھار ساحرہ دیوار کے ساتھ چار پائی کھڑی

کر کے اس پر چڑھ کر ہماری طرف جھانکتی اور کسی نہ کسی بہانے سلسلہ گفتگو قائم کرنے کی کوشش کرتی تو آپا بڑی بے دلی سے دو ایک باتیں کر کے اسے ٹال دیتی۔ آپ ہی آپ بول اٹھتی۔ ”ابھی تو اتنا کام پڑا ہے اور میں یہاں کھڑی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھتی۔ خیر اس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی مگر جب آپالوٹ آئی تو کچھ عرصے کے بعد چپکے سے میں بھی ساحرہ کے گھر جا پہنچی۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے ذکر چھیڑ دیا ”آج آپا آئی تھی؟“

ساحرہ نے ناخن پالش لگائے ہوئے کہا ”ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے۔ نہ جانے کیا نام ہے اس کا۔۔۔۔۔ ہارٹ بریک ہاؤس“

آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا کہ رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی۔ اسے یوں مضطرب دیکھ کر میں وہ ایک چھوٹی انگڑائی لیتی اور پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں لیٹ جاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا۔ ”آپا یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے؟ دل توڑنے والا گھر۔۔۔۔۔ اس کے کیا معنی ہوئے؟“ پہلے تو آپا ٹھنک گئی پھر سنبھل کر بیٹھ گئی مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی خاموشی سے جل کر کہا۔ ”اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے۔“ کہنے لگی ”میں کیا جانوں؟“

میں نے اسے جلانے کو کہا ”ہاں ہماری آپا بھلا کیا جانے۔“ میرا خیال ہے یہ بات اسے ضرور بری لگی۔ کیونکہ اس نے کتاب رکھ دی اور بتی بجھا کر سو گئی۔

ایک دن یوں ہی پھرتے پھرتے میں بھائی جان کے کمرے میں جا نکلی۔ پہلے تو بھائی جان ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر پوچھنے لگے ”جھینا اچھا یہ بتاؤ کیا تمہاری آپا کو فروٹ سلاڈ بنانا آتا ہے؟“ میں نے کہا ”میں کیا جانوں“ جا کر آپا سے پوچھ لیجئے۔“ ہنس کر کہنے لگے ”آج کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو؟“ میں نے ان کی بات کا جواب نہ دیا۔ پھر بولے ”نہیں ابھی تو لڑکی ہے شاید کسی دن لڑکا بن جاؤ۔“ اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگے ”دیکھو جھینا مجھے لڑنا بے حد پسند ہے۔ میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کروں گا جو باقاعدہ صبح سے شام تک مجھ سے لڑ سکے اور نہ اکتائے۔“ میں شرمائی اور بات بدلنے کی خاطر پوچھا ”فروٹ سلاڈ کیا ہوتا ہے بھائی جان؟“

بولے ”وہ بھی کچھ ہوتا ہے سفید سفید لال لال کالا کالا نیلا نیلا سا۔“ میں ان کی بات سن کر بہت ہنسی پھر کہنے لگے ”وہ مجھے بے حد پسند ہے یہاں تو ہے نا ہم فرنی کھا کھا کر اکتا گئے۔“

میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور سن لی ہوگی کیونکہ اسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی ”نعت خانہ“ پڑھ رہی تھیں۔ اس دن کے بعد روز بلا ناغہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاڈ بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اس کے پاس جاتا تو جھٹ فروٹ سلاڈ کی کشتی چھپا دیتی۔

ایک روز آپا کو چھیڑنے کی خاطر میں نے بدو سے پوچھا ”بدو بھلا تو وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے اس میں کیا ہے؟“ بدو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا۔ حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدو کو دینی ہی پڑی۔ پھر میں نے بدو کو اور بھی چکا دیا۔ میں نے کہا ”بدو جاؤ تو بھائی جان سے پوچھو اس کھانے کا کیا نام ہے۔“

بدو بھائی جان کے کمرے کی طرف جانے لگا تو آپا نے اٹھ کر کشتی اس سے چھین لی اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس روز پہلی مرتبہ آپا نے مجھے غصے سے گھورا تھا۔

اس رات آپا شام ہی سے لیٹ گئی۔ مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رضائی میں پڑی رو رہی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی بات پہ بہت افسوس ہوا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں اور اسے خوب پیار کروں مگر میں ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی۔

انہیں دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ جسے ہم سب سا جو باجی کہا کرتے تھے میٹرک کا امتحان دینے کے لئے ہمارے گھر آ ٹھہریں۔ سا جو باجی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہو گئی۔ ہمارا گھر بھی قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ساحرہ اور ثریا چار پائیوں پر کھڑی ہو کر باجی سے باتیں کرتی رہتیں۔ بدو چھا جو باجی چھا جو باجی چیختا پھرتا اور کہتا ”ہم تو چھا جو باجی سے بیاہ کریں گے۔“

باجی کہتی ”شکل تو دیکھو اپنی پہلے منہ دھو آؤ“ پھر وہ بھائی صاحب کی طرف یوں گردن موڑتی کہ کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکراتے اور وہ پنچم تان میں پوچھتی ----- ”ہے نا بھائی جان!“

باجی کے منہ سے ”بھائی جان“ ایسا بھلا سنائی دیتا تھا کہ میں خوشی سے پھولی نہ ساتی۔ اس کے برعکس جب کبھی آپا بھائی صاحب کہتی تو کیسا بھدا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ واقعی انہیں بھائی کہہ رہی ہو اور پھر صاحب جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو مگر باجی صاحب کی جگہ جا آن کہہ کر وہ اس سادے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی۔ جا آن کی گونج میں بھائی دب جاتا اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ انہیں بھائی کہہ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ بھئی جا آن کہہ کر وہ ایسی کالی کالی آنکھوں میں مسکراتی کہ سننے والے کو قطعاً یہ گمان نہ ہوتا کہ اسے بھائی کہا گیا ہے۔ آپا کے بھائی صاحب اور باجی کے بھائی جان میں کتنا فرق تھا۔

باجی کے آنے پر آپا کا بیٹھ رہنا بالکل بیٹھ رہنا ہو گیا۔ بدو نے بھائی جان سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ باجی کے گرد طواف کرتا رہتا اور باجی بھائی جان سے کبھی شطرنج اور کبھی کیرم کھیلتی۔

باجی کہتی ”بھائی جان ایک بورڈ لگے گا؟“ یا بھائی جان باجی کی موجودگی میں بدو سے کہتے ”کیوں میاں بدو کوئی ہے جو ہم سے شطرنج میں پٹنا چاہتا ہو؟“ باجی اٹھتی ”آپا سے پوچھئے“ بھائی کہتے ”اور تم۔۔۔۔۔۔“ باجی جھوٹ موٹ کی سوچ میں پڑ جاتی۔ پھر کہتی ”اونہ مجھ سے تو آپ پٹ جائیں گے۔“ بھائی جان کھکھلا کر ہنس پڑتے اور کہتے ”کل جو پٹی تھیں بھول گئیں کیا؟“ وہ جواب دیتی ”میں نے کہا چلو بھائی جا آن کا لحاظ کر دو ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ مجھ سے ہار گئے۔“ اور پھر یوں ہنستی جیسے گھنگھروںج رہے ہوں۔

رات کو بھائی جان باورچی خانے ہی میں بیٹھ گئے۔ آپا چپ چاپ چولہے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدو چھا جو باجی چھا جو باجی کہتا ہوا باجی کا پلو پکڑے اس کے ارد گرد گھوم رہا تھا۔ باجی بھائی جان کو چیخ رہی تھی۔ کہتی تھی ”بھئی جا آن تو صرف ساڑھے چھ پھلکے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فیرنی کی پلیٹ مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کریں بھی کیا۔ نہ کھائیں تو ممانی ناراض ہو جائیں۔ انہیں جو خوش رکھنا ہوا۔ ہے نا بھئی جا آن۔“ ہم سب اس بات پر خوب ہنسے۔ پھر باجی ادھر ادھر ٹہلنے لگی اور آپا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ آپا کے پیچھے فروٹ سلاڈ کی کشتی پڑی تھی۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر دیکھا اور کشتی کو اٹھالیا۔ بیشتر اس کے آپا کچھ کہہ سکے باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی۔ ”لیجئے بھئی جا آن“ اس نے آنکھوں میں ہنستے ہوئے کہا ”آپ بھی کیا کہیں گے کہ سا جو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں۔“

بھائی جان نے دو تین چمچے منہ میں ٹھونس کر کہا ”خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے۔ کس نے بنایا ہے؟“ باجی نے آپا کی طرف نکلیوں سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا ”سا جو باجی نے اور کس نے بھئی جا آن کے لئے“ بدو نے آپا کی طرف منہ کی طرف غور سے دیکھا۔ آپا کو منہ لال ہو رہا تھا۔ بدو چلا اٹھا ”میں بتاؤں بھائی جان۔۔۔۔۔۔“ آپا نے بڑھ کر بدو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گود میں اٹھا کر باہر چلی گئی۔ باہر آپا لگنی کے قریب کھڑی تھی۔ بھائی جان نے مدھم آواز میں کچھ کہا۔ آپا نے کان سے دوپٹہ سرکا دیا۔ پھر باجی کی آواز آئی ”چھوڑیے چھوڑیے“ اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ہم صحن میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔ بدو بھی کہیں ادھر ادھر ہی کھیل رہا تھا۔ باجی حسب معمول بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی۔ ”آج ایک دھندنا تا بورڈ کر دکھاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟“ بھائی جان بولے ”واہ یہاں کک لگاؤں تو جانے کہاں جا پڑو۔“ غالباً انہوں نے باجی کی طرف زور سے پیر چلایا ہوگا۔ وہ بناوٹی غصے میں چلائی

”وہ آپ ہمیشہ پیر ہی سے چھیڑتے ہیں۔“ بھائی جان معاً بول اٹھے ”تو کیا ہاتھ سے۔۔۔۔۔۔“ ”چپ خاموش“ باجی چیخنی۔ اس کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ تک تو پکڑ دھکڑ سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں کہیں سے بدو بھاگتا ہوا آیا۔ کہنے لگا ”آپا اندر بھائی جان باجی سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ چلو دکھاؤں تمہیں، چلو بھی۔“ وہ آپا کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ آپا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ وہ بت بنی کھڑی تھی۔ بدو نے آپا کو چھوڑ دیا۔ وہ کہنے لگا ”اماں کہاں ہے؟“ اور اماں کو بلانے کے لئے دوڑا۔ آپا نے لپک کر اسے گود میں اٹھالیا اور اسے باورچی خانے میں لے گئی۔

اسی شام میں نے کتابوں کی الماری کھولی تو اس میں آپا کی ”ہارٹ بریک ہاؤس“ پڑی تھی۔ شاید آپا نے اسے وہاں رکھ دیا ہو۔ میں حیران ہوئی کہ بات کیا ہے۔ مگر آپا باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے پیچھے فروٹ سلاڈ والی کشتی خالی پڑی تھی۔ البتہ آپا کے ہونٹ بھیجنے ہوئے تھے۔

بھائی تصدق اور باجی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب باجی وہ باجی نہ تھیں اس کے قبضے بھی نہ تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور ماتھے پر شکن چڑھی تھی۔ بھائی جان بھی چپ چاپ رہتے تھے۔ ایک شام اماں کے سوا ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ بھائی کہنے لگے ”بدو سا جو باجی سے بپاہ کرو گے؟“

”اونہہ“ بدو نے کہا ”ہم بیاہ کریں گے ہی نہیں۔“

میں نے پوچھا ”بھائی جان یاد ہے جب بدو کہا کرتا تھا ہم تو چھا جو باجی سے بیاہ کریں گے۔“ اماں نے پوچھا ”آپا سے کیوں نہیں؟“ تو کہنے لگا ”بتاؤں آپا کیسی ہے۔۔۔۔۔۔ پھر چو لہے میں جلے ہوئے ایلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔۔۔۔۔۔“ ایسی“ اور چھا جو باجی روشن بلب کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے۔۔۔۔۔۔“ ایسی“ عین اسی وقت بجلی بجھ گئی اور کمرے میں انگاروں کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا۔ ”ہاں یاد ہے۔“ بھائی نے کہا۔ پھر جب باجی کسی کام کے لئے باہر چلی گئی تو باجی کہنے لگی ”نہ جانے اب بجلی کو کیا ہو گیا ہے جلتی بجھتی رہتی ہے۔“ آپا چپ چاپ بیٹھی چو لہے میں راکھ سے دبئی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم آواز میں کہا۔ ”اف کتنی سردی ہے۔“ پھر اٹھ کر آپا کے قریب چو لہے کے سامنے جا بیٹھے اور سلگتے ہوئے ایلوں سے ہاتھ سینے لگے۔ بولے ”ممائی سچ کہتی تھیں کہ ان جلے ہوئے ایلوں میں آگ دبئی ہوتی ہے۔ اوپر سے نہیں دکھتی۔ کیوں سجدے۔“ آپا پرے سرکنے لگی تو چھن ہی آواز آئی جیسے کسی دبئی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوند پڑی ہو۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے ”اب اس چنگاری کو تو نہ بجھاؤ۔ سجدے دیکھو تو کتنی ٹھنڈ ہے۔“



نَفَرَت

عجیب واقعات تو دنیا میں ہوتے ہی رہتے ہیں مگر ایک معمولی سا واقعہ نازلی کی طبیعت کو یک لخت قطعی طور پر بدل دئے یہ میرے لیے بے حد حیران کن بات ہے۔ اس کی یہ تبدیلی میرے لیے معمہ ہے۔ چونکہ اس واقعہ سے پہلے مجھے یقین تھا کہ اس کی طبیعت کو بدلنا قطعی ناممکن ہے۔ اس لئے اب میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ نازلی وہ نازلی ہی نہیں رہی جو بچپن سے اب تک میری سہیلی تھی۔ جیسے اس کی اس تبدیلی میں انسان کی روح کی حقیقت کا بھید چھپا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک بہت ہی معمولی واقعہ تھا یعنی کسی بھدے بد نما آدمی سے خدا واسطے کا بغض محسوس کرنا۔۔۔۔۔ کتنی عام سی بات ہے۔

سیہلی کے علاوہ وہ میری بھابی تھی۔ کیونکہ اس کی شادی بھائی مظفر سے ہو چکی تھی۔ اس بات کو تقریباً دو سال گزر چکے تھے۔ مظفر میرے ماموں زاد بھائی ہیں اور چاندھری میں وکالت کرتے ہیں۔

یہ واقعہ لاہور اسٹیشن پر ہوا۔ اس روز میں اور نازی دنوں لائل پور سے جالندھر کو آ رہی تھیں۔

ایک چھوٹے سے درمیانے درجے کے ڈبے میں ہم دونوں اکیلی بیٹھی تھیں۔ نازلی پردے کی سخت مخالف تھی۔ برقعے کا اٹھانا اسے دو بھر ہو جاتا تھا۔ اس لئے گاڑی میں داخل ہوتے ہی اس نے برقع اتار کر لپیٹا اور سیٹ پر رکھ دیا۔ اس روز اس نے زرد رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی جس پر طلائی حاشیہ تھا۔ زرد رنگ اسے بہت پیارا تھا اور اس کے گورے گورے جسم میں گلابی جھلک پیدا کر دیتا تھا۔

اس کی یہ بے پردگی اور بے باکی مجھے پسند نہ تھی۔ مگر اس بات پر اسے کچھ کہنا بے کار تھا۔ آتے جاتے لوگ اس کی طرف گھور گھور کر دیکھتے مگر وہ اپنے خیالات میں یوں مگن تھی جیسے جنگل میں تنہا بیٹھی ہو۔ دو تین گھنٹے تو یونہی گزر گئے مگر لاہور کے قریب جانے کو ن ساسٹیشن تھا جہاں سے دونو جوان لڑکے سوار ہوئے۔ مجھے تو کسی کالج کے طالب علم نظر آتے تھے۔ ان لڑکوں نے ہراسٹیشن پر گاڑی سے اتر کر ہمیں تاڑنا شروع کر دیا۔ ہمارے ڈبے کے سامنے آکھڑے ہوتے اور متبسم نظروں سے ہماری دیکھتے۔ پھر آپس میں باتیں کرتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے۔ نازلی ویسے ہی بے باکی سے کھڑکی میں بیٹھی رہی بلکہ میرا خیال ہے کہ اسے اتنا بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ نو جوان اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت وہ ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ میرے لئے اس کی یہ بے نیازی بے حد

پریشان کن تھی۔ میں کچھ شرم اور کچھ غصہ محسوس کر رہی تھی۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔

میں نے کہا ”نازلی برقع پہن لو دیکھو لڑکے کب سے تمہیں تاڑ رہے ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“ اس نے چونک کر کہا، پھر مسکرا دی ”دیکھنے دو ہمارا کیا لیتے ہیں آپ ہی اکتا جائیں گے۔۔۔۔۔۔ بے چارے“

”مگر برقع اوڑھ لینے میں کیا حرج ہے؟“

”اگر برقع اوڑھنے سے لوگ یوں گھورنا چھوڑ دیں تو شاید عورتیں برقع اوڑھنا ترک کر دیں۔ برقع پہن لوں تو یہی ہوگا کہ سامنے

کھڑے ہونے کی بجائے ادھر ادھر منڈلاتے پھریں گے۔“

”تم بھی حد ہو۔“

”میں کہتی ہوں نجی ایمان سے کہنا کیا تم اپنے آپ کو چھپانے کے لئے برقع پہنتی ہو؟“ وہ مجھے نجی کہا کرتی تھی۔ چونکہ اس کے

خیال کے مطابق نجم النساء گنگنا نام تھا۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔ ”اچھا مان لیا کہ تم واقعی اپنے آپ کو چھپانے کے لئے برقع پہنتی ہو، چلو

مان لیا برقع پہن کر تم لوگوں پر یہ ظاہر کرتی ہو کہ اس برقعے میں چھپانے کے قابل چیز ہے یعنی ایک خوبصورت لڑکی ہے۔ یقین نہ ہو تو

خود دیکھ لیجئے اور یہ برقع تو دیکھو۔“ اس نے میرے برقعے کو ہاتھ میں مسلتے ہوئے کہا ”یہ ریشمی بوکی فیتے، جھالریہ تو برقع بذات خود

خوبصورت ہے اور برقعے والی کیسی ہوگی۔ اندازہ کر لیجئے، واہ کیا خوب پردہ ہے۔“

”تم تو خواہ مخواہ بگڑتی ہو۔“ میں نے تنک کر کہا۔ ”بگڑنا تو خیر ہوگا۔ مجھے تمہاری طرح بننا نہیں آتا۔“

”پگلی کبھی عورت بھی پردے میں رہ سکتی ہے۔ دیکھتی نہیں ہو۔ عورتوں نے پردے کو بھی زیبائش بنا دیا ہے۔ آخر جو بات ہے

اسے ماننے میں کیا حرج ہے؟“ یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔

”تمہیں تو ہر وقت مذاق سو جھتا ہے۔“ میں نے بگڑ کر کہا۔

”لو اور سنو جو ہم کہیں وہ تو ہوا مذاق اور جو آپ کہیں وہ حقیقت ہے۔“

”اچھا بابا معاف کرو۔ بھول ہوئی۔ اب برقعہ تو اٹھا لو کہ ان درختوں سے بھی پردہ کرو گی؟“

”تمہارے خیالات بہت عجیب ہیں۔“ میں نے برقعہ اتارتے ہوئے کہا۔ اسٹیشن بہت دور رہ گیا تھا۔ اور گاڑی ایک وسیع

میدان سے گزر رہی تھی۔

”عجیب۔۔۔۔۔۔ ہاں عجیب ہیں۔ اس لئے کہ وہ میرے اپنے ہیں۔ اگر میں بھی تمہاری طرح سنی سنائی باتیں شروع کر دوں تو

تم مجھ سے کبھی ناراض نہ ہو۔“

”سنی سنائی۔۔۔۔۔؟“

”ہاں سنی سنائی۔۔۔۔۔ اس لئے کہ یہ باتیں ظہیر صاحب کو بہت پسند ہیں اور تم چاہتی ہو کہ وہ تمہیں چاہیں، تمہارے میاں جو ہوئے۔ یہ سنہری چوڑیاں ہی دیکھو۔ یاد ہے تم سنہری چوڑیوں کو کیسی نفرت کی نظر سے دیکھا کرتی تھیں؟ مگر یہ انہیں پسند ہیں نا، اس لئے یہ بوجھ اٹھائے پھرتی ہو۔ ان کی محبت کی محتاج جو ٹھہریں۔ ایمان سے کہنا۔ کیا یہ غلط ہے؟ مجھے تو ایسی محتاجی گوارا نہیں۔ تم ہی نے مردوں کا مزاج بگاڑ رکھا ہے۔ ورنہ وہ بے چارے“

”تمہیں بھی تو زرد رنگ پیارا ہے نا؟“

”ہاں ہے اور رہے گا، میری اپنی پسند ہے۔ میں اپنے میاں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی نہیں بننا چاہتی کہ جیسا جی چاہیں، نچالیں۔ میں نے ان سے بیاہ کیا ہے۔ ان کے پاس اپنی روح گروی نہیں رکھی اور تم۔۔۔۔۔ تمہاری تو مرضی ہے ہی نہیں۔ تم تو ہوا کے رخ میں اڑنا چاہتی ہو۔“

دفعاً گاڑی نے جھٹکا کھایا اور وہ لڑھک کر مجھ پر آگری۔

”یہ جھوٹ بولنے کی سزا ہے۔“ میں نے اسے چھیڑنے کو کہا اور ہم دونوں ہنس پڑیں۔ گاڑی اسٹیشن پر رک گئی۔ دونوں نوجوان گاڑی سے اتر کر ہمارے سامنے آ کھڑے ہوئے اور نازلی کو تازلی لگے۔ اس نے دو ایک مرتبہ ان کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر نفرت بھرا تمسخر کھیل رہا تھا۔ ”بے چارے“ اس نے دبی آواز میں کہا ”مجھے تو ان پر ترس آتا ہے۔“ اور وہ ویسے ہی بیٹھی رہی۔ نہ جانے اس کی بے باکی اور بے پروائی دیکھ کر یا کسی اور وجہ سے وہ اور بھی دلیر ہو گئے۔ پہلے تو آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک جو زیادہ دلیر معلوم ہوتا تھا، ہمارے ڈبے کی طرف بڑھا۔ مگر نازلی کے انداز کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ کچھ دیر کے لئے وہ رک گیا۔ ہاتھ سے اپنی کلکائی سنواری۔ بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ رومال نکالا اور پھر کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی کے قریب پہنچ کر ادھر ادھر دیکھا اور آخر ہمت کر کے نازلی کے قریب آ کھڑا ہوا اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو۔۔۔۔۔۔“

میں تو ڈر کے مارے پسینہ ہو گئی۔ مگر نازلی ویسے ہی بیٹھی رہی اور نہایت سنجیدگی سے کہنے لگی ”ہاں صرف اتنی مہربانی فرمائیے کہ یوں سامنے کھڑے ہو کر ہمیں گھورے نہیں، شکریہ“ یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔ اس وقت نازلی کی سنجیدگی کو دیکھ کر میں حیران ہو رہی تھی۔ اس میں کتنی ہمت تھی۔ خیر نوجوان کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ کھسیانا ہو کر واپس چلا گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں ہمیں کہیں نظر نہ

— ۷۱ —

ان دنوں نازلی کی طبیعت بے حد شوخ تھی مگر شوخی کے باوجود وہ کبھی کبھی ایسی سنجیدگی سے کوئی بات کہہ دیتی کہ سننے والا پریشان ہو جاتا۔ ایسے وقت مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اس نسوانی جسم کی تہہ میں کوئی مردانہ روح جی رہی ہو۔ مگر اس کے باوجود اس کو مردوں سے دلچسپی نہ تھی۔ یعنی وہ مردوں کی طرف آنکھیں چمکا چمکا کر دیکھنے والی عورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ اسے جذبہ محبت کے خلاف بغض تھا۔ مظفر بھائی دو سال کے عرصہ میں بھی اسے سمجھ نہ سکے تھے۔ شاید اسی لئے وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔ نازلی انہیں اس قدر پیاری تھی حالانکہ وہ ان کے روبرو ایسی باتیں کہہ دینے سے کبھی نہ جھجکتی جو کسی عام خاوند کو سننا گوارا نہیں ہوتیں مگر وہ نازلی کی باتیں سن کر ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔

لاہور پہنچنے تک میں نے منت سماجت کر کے اسے برقع پہننے کے لئے منالیا۔ رات کو آٹھ بجے کے قریب ہم لاہور پہنچ گئے۔ وہاں ہمیں ڈیڑھ گھنٹہ جالندھر جانے والی گاڑی کا انتظار کرنا تھا۔ ہم اس پلیٹ فارم پر جا بیٹھے جہاں سے ہماری گاڑی کو چلنا تھا۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ یہاں وہاں کہیں کہیں کوئی مسافر بیٹھا اونگھ رہا تھا یا کبھی کبھار کوئی وردی پوش بابو یا قلی تیزی سے ادھر سے ادھر گزر جاتا۔ مقابل کے پلیٹ فارم پر ایک مسافر گاڑی کھڑی تھی اور لوگ ادھر چل پھر رہے تھے۔ ہم دونوں چپ چاپ بیٹھی رہیں۔

”لا حول و لا قوۃ“ میں نے نازی کو کہتے ہوئے سنا۔ دیکھا تو اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

”کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے انگلی سے ساتھ والے بچ کی طرف اشارہ کیا۔ بچ پر بچگی کی جتنی کے نیچے دو جوان بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

”توبہ!۔۔۔۔۔ جانگی معلوم ہوتا ہے۔“ نازلی نے کہا۔

سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کی ہیبت واقعی عجیب تھی۔ جیسے گوشت کا بڑا سا لوتھڑا ہو۔ سو جا ہوا چہرہ سانولا رنگ، تنگ پیشانی پر دو بھدی اور گھنی بھنویں پھیلی ہوئی تھیں۔ جن کے نیچے دو اندر دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی سانپ کی سی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چھاتی اور کندھے بے تحاشا چوڑے تھے جن پر سیاہ لمبا کوٹ یوں پھنسا ہوا تھا جیسے پھٹا جا رہا ہو۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے تنگ جسم میں بہت سی جسمانی قوت ٹھونس رکھی ہو۔

چہرے پر بیزاری چھائی ہوئی تھی۔ اس کی حرکات بھدی اور مکروہ تھیں۔ ”دیکھو تو۔۔۔۔۔“ نازی بولی ”اس کے اعضاء کس قدر بھدے ہیں؟ انگلیاں تو دیکھو۔“ اس نے جھر جھری لی اور اپنا منہ پھیر لیا۔

رک گئی۔ اسی بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔“

”آخر کیا بات تھی؟ ہم بھی سنیں۔“ اس کے ساتھی نے کہا۔

”کچھ بھی نہیں، بس میری اپنی بے ہنگم طبیعت۔“ وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی بہت بھونڈی تھی۔

نازلی سرک کر میرے قریب ہو گئی۔

”میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔“ جانگلی نے کہا ”تمام جھگڑا میری طبیعت کی وجہ سے ہی تھا۔ میری منگیتر میرے دوست ظہیر الدین صاحب کی لڑکی تھی۔ ظہیر الدین ہماری فرم کے منیجر تھے اور ان کا تمام کام میں ہی کیا کرتا تھا۔ چونکہ ان کے مجھ پر بہت سے احسانات تھے، میں نے ان کی بات کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا حالانکہ میرے حالات کچھ اس قدر بگڑے ہوئے تھے کہ شادی کا بکھیرا میرے لئے چنداں مفید نہ تھا۔ خیر میں نے سنا تھا کہ لڑکی بہت خوبصورت ہے اور سچ پوچھو تو خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا میں قطعی ناپسند کرتا ہوں۔“

”عجیب انسان ہو۔“ اس کے ساتھی نے کہا۔

”عجیب ہی سہی مگر یہ ایک حقیقت ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی بد صورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ نہیں یہ بات نہیں مگر کسی حسین لڑکی کو بیاہ لانے مجھے پسند نہیں۔“

”اوہ بڑا گھمنڈ ہے انہیں۔“ نازلی نے میرے کان میں کہا۔

”خیر“ جانگلی نے بات جاری رکھی۔ ”ایک دن کی بات ہے کہ مجھے بے حد موقع ظہیر الدین کے مکان پر جانا پڑا۔ یاد نہیں کہ کیا بات تھی۔ مجھے اتنا ہی یاد ہے کہ کوئی ضروری کام تھا۔ چونکہ عام طور پر ان کے مکان پر جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ بہر حال ایک چھوٹی سی لڑکی باہر آئی اور کہنے لگی آپ اندر چل کر بیٹھئے، وہ ابھی آتے ہیں۔ خیر میں ملاقاتی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتاً دروازہ آپ ہی کھل گیا۔ اور کچھ دیر کے بعد ایک جوان لڑکی کھلے منہ دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ پہلے تو وہ یوں کھڑی رہی گویا اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی جیسے لڑکیاں مردوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا کرتی ہیں۔ پھر میز پر سے ایک کتاب اٹھا کر چلی گئی۔ میں اس کی بے باکی اور بناؤ سنگھار کو دیکھ کر غصے سے کھول رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس وقت وہ گھر میں اکیلی تھی۔ مجھے اب بھی وہ منظر یاد آتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ کسی کو۔۔۔۔۔۔“ اس نے گھونسا لہراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ہنس پڑا۔

نازلی نے اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر چیخ سی ماری۔ مگر ڈر یا فقاہت سے اس کی آوازاں دونوں تک نہ پہنچ سکی۔ ورنہ خدا جانے

وہ کیا سمجھتے۔

جانگلی نے بات پھر شروع کی۔ بولا ”وہ یوں بن سنور کرو ہاں کھڑی تھی گویا اپنی قیمت چکانے آئی ہو۔ ایک زرد رنگ کار سے کی طرح بل کھایا ہوا دو پہلہ اس کے شانوں پر لٹک رہا تھا۔ سرنگا تھا۔ اف۔۔۔۔۔ تمہیں کیا بتاؤں۔ اس کے بعد میں نے ظہیر الدین صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں آپ کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ یعنی میں نے رشتے سے انکار کر دیا۔ اس بات پر وہ بہت بگڑے اور مجھے کوئی اور نوکری تلاش کرنی پڑی۔ مہینوں بغیر نوکری کے رہا۔ کہاں کہاں بھٹکتا پھرا۔ راجپوتانہ میں نوکری آسانی سے نہیں مل سکتی۔“

”مگر اس میں انکار کرنے کیا بات تھی؟“ اس کے ساتھی نے کہا ”آخر مگیتر تھی۔“

”بس یہی کہ مجھے بے پردگی سے بے حد نفرت تھی اور آج کل کا بناؤ سنگھار مجھے پسند نہیں۔ ہاں ایک بات اور ہے کوئی لڑکی جو زرد دو پہلہ پہن سکتی ہے میں اسے اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔ مجھے زرد رنگ سے چڑ ہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ گھر کے کام کاج کو عار سمجھتی تھی۔ یہ آج کا فیشن ہے۔ تم جانتے ہو آج کل لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ بن سنور کو مردوں کو لبھانے کے سوا ان کا اور کوئی کام ہی نہیں اور برتن مانجھنے سے ہاتھ میلے ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہاتھ دکھلاوے کی چیز ہوں۔ یہیں دیکھ لو کتنی بے پردگی ہے۔ عورتیں یوں برقعے اٹھائے پھرتی ہیں جیسے جنگل میں شکاری بندوقیں اٹھائے پھرتے ہیں۔“

اس کا ساتھی ہنس پڑا اور پھر ہنستے ہنستے کہنے لگا ”یا تم تو راجپوتانے میں رہ کر بالکل بدل گئے ہو۔“

”اونہہ ہوں۔۔۔۔۔ یہ بات نہیں“ جانگلی نے کہا ”پردے کا تو میں بچپن ہی سے بہت قائل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ گھر میں دو عورتیں مہمان آئیں۔ ایک تو خیر ابھی بچی تھی۔ دوسری یہی کوئی پچیس سال کی ہوگی۔ ان دونوں میں خود آٹھ نو سال کا تھا۔ خیر وہ مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔“ وہ رک گیا پھر آپ ہی بولا ”مجھے اس بات پر بے حد غصہ آتا تھا۔ اس لئے میں اکثر باہر مردانے میں ہی بیٹھا رہتا، یعنی میں نے ان کے روبرو جانا بند کر دیا۔ ایک دن ابا نے مجھے بلایا اور کہا کہ یہ پیغام اندر لے جاؤ۔ خدا جانے کیا پیغام تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ انہوں نے مجھے کوئی زیور دیا تھا کہ انہیں دکھا دوں۔ شاید ان مہمانوں نے وہ زیور دیکھنے کے لئے منگوا یا ہو۔ میں نے ڈیوڑھی سے جھانک کر دیکھا تو وہ عورت صحن میں اماں کے پاس بیٹھی تھیں۔ اماں کہنے لگی۔ ”حمید اندر چلے آؤ۔ اے ہے تم اندر کیوں نہیں آتے؟ تم سے کوئی پردہ ہے؟“ میں یہ سن کر ابا کے پاس واپس چلا آیا۔ میں نے کہا۔ ”ابا جی میں نہیں جاؤں گا وہ مجھ سے پردہ نہیں کرتی۔ یہ بات میں نے اس قدر جوش اور غصے میں کہی کہ ابا بے اختیار ہنس پڑے۔ اس کے بعد دیر تک گھر والے میری

اس بات پر مجھے چھیڑتے رہے۔ البتہ زرد رنگ سے مجھے ان دنوں نفرت نہ تھی۔ طبیعت بھی عجیب چیز ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہاری طبیعت تو ایسی ہے جیسے مداری کا تھیلا“ اس کے ساتھی نے ہنستے ہوئے کہا اور وہ دونوں دیر تک ہنستے رہے۔ پھر وہ اٹھ بیٹھے۔

اس وقت پہلی مرتبہ جانگی کی نگاہ نازلی پر پڑی جو اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر شکن پڑ گئی اور آنکھیں نفرت یا خدا جانے کس جذبے سے سرخ ہو گئیں۔ نازلی کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کی نگاہیں جانگی پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ انہیں وہاں سے ہٹانا چاہتی ہو مگر ہٹانہ سکتی ہو۔ اور تمام بدن کانپ رہا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے نازلی میں ملنے جلنے کی سکت نہ رہی ہو۔

ایک لخت جانگی مڑا اور وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ اس وقت نازلی عجیب بے بسی کے ساتھ مجھ سے لگی بیٹھی تھی۔ گویا اس میں بالکل جان نہ ہو۔

کچھ دیر کے بعد جب اسے ہوش آیا۔ عین اس کے قریب سے ایک قلی گزرا، وہ ٹھٹھک گئی اور اس نے اپنا برقعہ منہ پر ڈال لیا۔

”اگر مجھے خون معاف کر دیا جائے تو میں اسے یہیں گولی مار دوں۔“ نازلی نے کہا۔

”کسے؟“ میں نے پوچھا۔

”کتنا بتا ہے۔“

”اور تمہارا مطلب اس شخص سے ہے مگر تم خواہ مخواہ اس سے چڑ رہی ہو۔ اپنی طبیعت ہے۔ اپنے اپنے خیالات ہیں۔ تمہیں اپنے خیالات پیارے ہیں اسے اپنے۔“

”بڑی طرفداری کر رہی ہو“ وہ بولی

”اس میں طرفداری کی کیا بات ہے۔“ میں نے کہا ”تمہیں تو آپ سنی سنائی باتوں سے نفرت ہے۔ اس کے خیالات بھی مانگے کے نہیں۔ باقی رہی شکل وہ تو اللہ میاں کی دین ہے۔۔۔۔۔ ایمان کی بات پوچھو تو مجھے تو تم دونوں میں فرق دکھائی نہیں دیتا۔“

”جی ہاں تمہارا بس چلے تو ابھی میری بانہہ پکڑ کر اس کے ہاتھ میں دے دو۔“

”لاحول ولا۔۔۔۔۔“ میں نے کہا

”لاحول ولا کی اس میں کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟ میں کہتی ہوں اس کی بیوی اس کے ساتھ کیسے رہ سکے گی؟“

گاڑی پلیٹ فارم پر آکھڑی ہوئی۔ ہم دونوں اندر بیٹھے۔ ہم نے انٹر کا ایک چھوٹا سا زانہ ڈبہ تلاش کیا اور اس میں جا بیٹھے۔ نازلی نے برقعہ اتار کر لپیٹ کر بیچ پر رکھ دیا اور خود کونے میں بیٹھ گئی۔ حالانکہ ڈبے میں بہت گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر بھی اس نے کھڑکی کا تختہ چڑھا دیا۔ میں دوسرے پلیٹ فارم پر ہجوم دیکھنے میں محو ہو گئی۔ میرا خیال ہے ہم بہت دیر تک یوں ہی خاموش بیٹھے رہے۔

”توبہ ہے۔“

نازلی کی آواز سن کر میں چونک پڑی۔ دیکھا تو میری پاس ہی وہ جانگلی ہاتھ میں سوٹ کیس لئے کھڑا ہے۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اسی لمحے میں نازلی نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ سامنے اسے دیکھ کر نہ جانے کیا ہوا۔ بس مجھے اتنا ہی معلوم ہے کہ اس نے لپک کر دوپٹہ میرے سر سے کھینچ لیا اور ایک آن میں خود کو اس میں لپیٹ کر گھٹڑی سی بن کر پڑ گئی۔

”لا حول ولا قوۃ“ جانگلی کی بھدی آواز سنائی دی اور وہ اٹنے پاؤں لوٹ گیا۔

میرا خیال ہے کہ وہ غلطی سے ہمارے ڈبے میں چلا آیا تھا۔ جب اس نے ہمیں دیکھا تو اپنی غلطی کو جان کر واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک نازلی اسی طرح منہ سر لپیٹے پڑی رہی۔ میرے دل میں عجیب عجیب ہول اٹھنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہوگا۔ خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔ ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ خیر جوں توں ہم خیریت سے جالندھر پہنچ گئے۔

اگلے دن دوپہر کے قریب مظفر بھائی میرے کمرے میں آئے۔ ان کے چہرے پر تشویش اور پریشانی کے آثار تھے۔ کہنے لگے۔ ”نجمہ! نازلی کو کیا ہو گیا ہے؟ کہیں مجھ سے ناراض تو نہیں؟“

”مجھے تو معلوم نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”کیا ہوا؟“

”خدا جانے کیا بات ہے؟ اس میں وہ پہلی سی بات ہی نہیں۔ آج صبح سے ہر بات کے جواب میں جی ہاں جی ہاں نازلی اور جی ہاں؟ میں نے سمجھا شاید مجھ سے ناراض ہے۔“

”نہیں ویسے ہی اس کی طبیعت ناساز ہے۔“

”طبیعت ناساز ہے؟“ انہوں نے حیرانی سے کہا ”اگر طبیعت ناساز ہوتی تو کیا وہ بیٹھی باورچی خانے کا کام کرتی۔ وہ تو صبح سے حشمت کے پاس باورچی خانے میں بیٹھی ہے۔ کہتی ہے میں کھانا پکانا سیکھوں گی۔ منہ ہاتھ تک نہیں دھویا“ عجیب معاملہ ہے۔“

”وہم نہ کیجئے“ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔“ میں نے بات ٹالنے کے لئے کہا۔

”وہم کی اس میں کیا بات ہے۔ تم جانتی ہو اس کی طبیعت خراب ہو تو اس گھر میں رہنا مشکل ہو جاتا ہے اور باورچی خانے کے کام

سے تو اسے چڑ ہے۔ آج تک وہ کبھی باورچی خانے میں داخل نہیں ہوئی۔ خدا جانے کیا بھید ہے۔“
وہ دو قدم چل کر لوٹ آئے۔

”اور مزے کی بات بتانا تو میں بھول ہی گیا۔ جانتی ہونا کہ اسے زرد رنگ کتنا پیارا ہے۔ میں نے اس مرتبہ ایک نہایت خوبصورت زرد دوپٹہ اس کے لئے خریدا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ زرد دوپٹے کو دیکھ کر خوشی سے ناچے گی۔ مگر اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہیں کھونٹی سے لٹک رہا ہے۔ جب میں نے اصرار کیا تو کہنے لگی ”اچھا ہے“ آپ کی مہربانی ہے۔“
”نازلی کے منہ سے یہ بات نکلے سوچو تو۔۔۔۔۔۔ عجیب معاملہ ہے کہ نہیں۔“ وہ بولے

نازلی کی مکمل اور فوری تبدیلی پر ہم سب حیران تھے مگر وہ خود بالکل خاموش تھی۔ اسی طرح ایک دن گزر گیا۔ اسی شام بھائی مظفر تارہاتھ میں لئے باورچی خانے میں آئے۔ ہم دونوں وہیں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے ”جانتی ہو یہ کس کا تارہ ہے۔ خالہ فریدہ کا بڑا لڑکا حمید تھا۔۔۔۔۔۔ جو پندرہ سال کی عمر میں راجپوتانے بھاگ گیا تھا؟ وہ واپس آ گیا ہے۔ اب وہ بہن کو ملنے دہلی جا رہا ہے۔ یہ تارہ اس کا ہے۔ کل صبح نوبے جے یہاں پہنچے گا۔ چند ایک گھنٹوں کے لئے یہاں ٹھہرے گا۔“
”کون حمید؟“

”تم کو یاد ہوگا میں اور حمید اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔“

نازلی کے ہونٹ ہلے اور اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ ہاتھ سے پیالی گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔
اگلے دن نوبے جے کے قریب میں اور نازلی باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ وہ چائے کے لئے پانی گرم کر رہی تھی مگر یوں بیٹھی تھی جیسے اسے کسی بات کا دھیان ہی نہ ہو۔ پاس ہی کھونٹی پر اس کا زرد دوپٹہ لٹک رہا تھا۔ بھائی مظفر نے زبردستی اسے وہ دوپٹہ لینے پر مجبور کر دیا تو اس نے لے لیا لیکن پہننے کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور کپڑے میلے تھے۔ اس وقت وہ میری طرف پیٹھ کئے بیٹھی تھی۔

باہر برآمدے میں بھائی صاحب کسی سے کہہ رہے تھے۔ ”تم یہیں بیٹھو میں اسے بلاتا ہوں۔ نہایت ادب سے بھابی کو سلام کرنا۔“

”اچھا تمہاری مرضی۔“ کسی نے بھدی آواز میں کہا جیسے کوئی گھڑے میں منہ ڈال کر بول رہا ہو۔

”وہی“ میرے دل میں کسی نے کہا اور جانگلی کی شکل میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ میں اسے دیکھنے کے لئے دبے پاؤں اٹھی۔

باورچی خانے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو اسی وقت بھائی صاحب حمید سے کہہ رہے تھے۔ ”آؤ تم بھی میرے ساتھ آؤ۔“

میں نے دروازہ زور سے بند کر دیا۔

نازلی نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ دیوانہ وار اٹھی۔ کھونٹی سے لپک کر دوپٹہ اتار لیا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اسے چولہے کی طرف پھینک دیا جیسے کوئی بچھو ہو۔ اور دوڑ کر حشمت کی چادر کو پکڑ لیا جو دوسرے دروازے کے پٹ پر لٹک رہی تھی۔ اور اپنے آپ کو اس میں لپیٹ لیا۔ زرد دوپٹہ چولہے میں جلنے لگا۔ اسی وقت بھائی صاحب اندر داخل ہوئے مگر وہ اکیلے ہی تھے۔ انہوں نے حیرانی سے ہمیں دیکھا۔ کچھ دیر ہم تینوں خاموش ہی کھڑے رہے۔ آخر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ نازلی کہاں ہے؟ میں نے نازلی کی طرف اشارہ کا جو منہ لپیٹ کر کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

”نازلی۔۔۔۔۔!“ انہوں نے حیران سے دہرایا۔

وہ نازلی کے قریب گئے۔ ”یہ کیا حماقت ہے؟ چلو۔۔۔۔۔ باہر حمید انتظار کر رہا ہے۔“

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر نحیف آواز میں کہنے لگی ”نہیں! میں نہیں جاؤں گی۔“

”کیوں؟“ وہ بولے

اتفاقاً بھائی جان کی نظر جلتے ہوئے دوپٹے پر پڑی۔

”نازلی۔۔۔۔۔!“ انہوں نے دوپٹے کی طرف دیکھ کر حیرانی سے کہا

نازلی نے سر ہلا دیا اور چپے سے دوپٹے کو پوری طرح چولہے میں ڈال دیا۔ بھائی نازلی کی اس تبدیلی پر بہت خوش دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نازلی کی طبیعت بہت سنور گئی ہے۔ بات ہے بھی درست۔ چونکہ اس کی طبیعت میں وہ ضد اور بے باک شوخی نہیں رہی مگر کبھی کسی وقت انہیں اکٹھے دیکھ کر میں محسوس کرتی ہوں۔۔۔۔۔ گویا وہ نازلی کو ہمیشہ کے لئے کھو چکے ہیں۔



نیلی

ہائے ری کیسا پیارا بچہ تھا آپا کا۔ بھورا بھورا جیسے زرد روئی کا گالا۔ چھوٹے چھوٹے گدے سے ہاتھ اور اتنا بڑا سر۔ جی چاہتا تھا چھاتی سے لگائے پھروں۔ پر توبہ!۔۔۔۔۔ بھائی جان کی اماں نے کتنا پاکھنڈ مچایا تھا۔ بڑی آئی تھی ننھے کی مالکہ۔ ہونہ۔۔۔۔۔ گویا اپنی گرہ سے خریدا تھا اسے۔ توبہ اس بڑھیا کی باتیں۔ مجھے تو ہنسی آ جاتی سن کر۔ دانت ہوں تو کوئی بات بھی کرے۔ یوں بولتی تھی جیسے بگڑی ہوئی چکی، مچھ مچھ۔ بولی ”پھیضہ کونہ دو گرانہ دے۔“ بڑی آئی ننھے کی رکھوالی نہ جانے کیا سمجھتی ہے وہ مجھے جیسے میں دودھ پیتی بچی ہوں۔ ہونہ۔ بھائی جان نے بہتیرا کہا لینے دو، فیضو کو ذرا کیا حرج ہے۔ لیکن وہ بڑھیا۔۔۔۔۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ ننھے کو اٹھا کر کوٹھے پر چڑھ جاؤں اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ ہائے میں کیوں پھینکوں اسے۔ کیلجے سے نہ لگائے رکھتی۔ ایسا پیارا بچہ ہے نیلی نیلی کا بچہ سی آنکھیں۔ زعفرانی رنگ اور پھر لاکھے سنہری بال۔ جی چاہتا تھا بس اسے دیکھتی ہی رہوں۔ گڈا تھا گڈا۔ ذرا نہ روتا تھا۔ بس رونی صورت بنائی ہونت نکالے اور آنکھیں۔ اس وقت اس کی آنکھیں۔۔۔۔۔ جیسے نیل میں گہرا رنگ گھول دیا ہو۔ اور پھول سی آنکھیں جیسے کوئی سبز پھول کھل گیا ہو۔ رونا تو جانتا ہی نہ تھا۔

ننھے کی آنکھیں تو اک تماشا بنی ہوئی تھیں۔ جو کوئی آتا اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ دیکھ کر کہتا۔ نہ جانے کس پر گیا ہے یہ ننھا۔ ہمارے خاندان میں تو کسی کی آنکھ نیلی نہیں اور پھر ایسی نیلی۔۔۔۔۔ یہ بات بھی سچی تھی۔

آپا کا بیہ اپنے ہی خاندان میں ہوا تھا۔ بھائی جان آپا اور میرے پھوپھی زاد تھے۔ اور ہمارے گھروں میں تو سب ”کل عینے“ تھے۔ بھائی جان کی آنکھ کبھی کبھی شرتی جھلک مارتی تھی۔ وہ بھی صرف مسکراتے وقت۔ مگر وہ مسکراتے ہی کہاں تھے۔ آپا کی تو گھور کالی تھیں سیاہ اور توبہ۔۔۔۔۔! کیسی موٹی موٹی۔ آنکھ بھر کر دیکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ آپا نظر بھر کر دیکھتی تو دوسرا کھڑا کا کھڑا رہ جاتا۔ میں تو سن ہو جاتی تھی۔ پھر نہ جانے مجھے کیوں غصہ آ جاتا اور میں چیختی۔ ہم پر تو نہ نکالا کرے کوئی آنکھیں۔ اس بات پر بھائی جان مجھے چھیڑتے ”نہ بھی صفی فیضو کونہ دکھایا کرو آنکھیں۔“

”واہ آپ تو مذاق کرتے ہیں۔“ میں کہتی اور وہ بن کر کہتے ”توبہ فیضو تمہاری آپا نظر بھر کر دیکھتی ہیں تو اندھیر گھپ ہو جاتا ہے اور تم۔۔۔۔۔ تم دیکھتی ہو تو پھوار پڑنے لگتی ہے۔“

”او“ میں چڑ کر کہتی ”کہاں پڑتی ہے پھوار میں جانتی ہوں بناتے ہیں آپ“

پر بھائی جان کا اور معاملہ تھا۔ ان کی بات مجھے بری نہ لگتی تھی۔ اور وہ صرف مجھ سے ہی مذاق کیا کرتے تھے۔ گھر میں تو انہیں چپ لگی رہتی تھی۔ آپا سے کبھی یوں بات بھی نہ کی تھی جیسے دولہا دلہن سے کیا کرتا ہے۔ پھر وہ منہ موڑ لیتی جیسے۔۔۔۔۔ پر نہ جانے وہاں سے چلے آنا کیوں میرے لئے اس قدر مشکل ہو جاتا تھا۔ میں جانو۔۔۔۔۔ مجھے نہیں پتہ کیوں۔۔۔۔۔

توبہ۔۔۔۔۔! بھائی جان کی اماں نے ننھے کی آنکھوں پر کیا پاکھنڈ مچایا تھا۔ بولی ”یہ انگریز کہاں سے آ گیا۔“

”اوئی اماں دیکھو تو۔۔۔۔۔“ نجمہ چلائی ”اب تو ہری ہوئی جا رہی ہیں توبہ۔۔۔۔۔“

اور آپا بولتی۔ ”آنکھیں نہ ہوئی گر گٹ ہوا۔“

ادھر ہماری ملازمہ بانو شور مچاتی۔ ”دیکھو تو بی بی کیا جافرانی رنگ ہے اور بال تو سونے کی تاریں ہیں۔“

”اونہوں“ بڑھیا بڑبڑاتی۔ ”یہ تو لاکھ سنہری ہیں۔“

آپا ان کی باتیں سن کر نہ جانے کیوں شرما اور چڑ جاتی تھی۔ شرمانے کی بات ہی کیا تھی اس میں۔ آخر سبھی کے ہاں بچے ہوتے ہیں۔ پر آپا کا پہلا ننھا تھا نا۔ اس وقت آپا کی آنکھیں اور بھی گھور ہو جاتیں جیسے گھٹا چھا جائے۔ پھر وہ منہ موڑ لیتی یا چہرے پر دوپٹہ ڈال کر چھپ جاتی۔ آپا بھی عجیب ہے۔ پر میں جانوں گھبرانے کے ساتھ ساتھ وہ مسکراتی بھی تھی۔ لیکن چھپ چھپ کر۔ پھر کوئی نہ کوئی چلا اٹھتی ”نہ جانے کس پر گیا ہے ننھا۔ پورا انگریز ہے انگریز۔“ یا کوئی ناواقف آتی تو وہ ننھے کو دیکھ کر غور سے آپا کی طرف دیکھتی اور پھر ننھے کی طرف جیسے حیران ہو رہی ہو۔ جیسی تو آپا کو لوگوں کا آنا جانا پسند نہ تھا اور وہ بات بات پر کہہ اٹھتی ”توبہ میرا سر کھا جاتی ہیں۔“

ننھے کی آنکھوں۔۔۔۔۔ رنگ اور بالوں کے بارے میں اگر کوئی خاموش تھا وہ بھائی جان تھے۔ کسی نے ننھے کی آنکھوں یا صورت کا ذکر چھیڑا اور وہ بہانے بہانے اٹھ کر وہ گئے جیسے کچھ دلچسپی ہی نہ ہو اس بات میں۔ بات سن کر ان سنی کر دیتے تھے۔ اور گھر میں تو بوسی یہی ایک بات چلتی تھی ان دنوں۔ ننھے کی آنکھیں رنگ اور بال۔۔۔۔۔ سبھی اسی بات کے دیوانے ہو رہے تھے۔ بھائی جان نے تو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا ننھے کی طرف۔ اسے پیار بھی کرتے تو دھیان کسی اور طرف ہوتا۔ میری طرف یا جیسے دیوار سے پار کسی چیز کو دیکھ رہے ہوں۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ ان آنکھوں کا بھید جانتے ہوں۔ یا جیسے اسے اپنے آپ سے چھپا رہے

ہوں۔ یہ بات نہ تھی تو پھر وہ ہماری باتیں سن کر دکھی کیوں ہو جاتے تھے جیسے پھوڑے کو چھیڑ دیا جائے اور اس وقت مسکراتے بھی تو کیا وہ مسکراہٹ ہوتی۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی۔

اس روز وہ کس قدر گھبرائے جب اماں کہنے لگیں ”پھریضہ کس پر گیا ہے ننھا؟“ اور نککیوں سے بھائی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ یہ سن کر بھائی جان گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ پھر آ پا بولی۔ ”مجھے کیا معلوم انہی سے پوچھئے“ اس نے بھائی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور لگی مسکرانے۔ بھائی جان کا رنگ اڑ گیا۔ بڑی اماں کب چھوڑنے والی تھی۔ بولی ”کیوں جلیل کس پر گیا ہے ننھا؟ دیکھ تو ذرا۔“ بھائی بولے ”اماں میں پوچھتا ہوں وہ میرا پن کہاں گیا جانے کس نے اٹھا لیا ہے کیا مصیبت ہے؟“

”اے ہل جائے گا۔“

”کہاں مل جائے گا؟“

”تو ذرا اپنے بیٹے کو تولے دیکھ تو تیری طرف ہی دیکھ رہا ہے۔“

”لیکن گیا کہاں میرا پن؟“ بھائی بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

”تو بہ یہ آج کل کے لڑکے۔۔۔۔۔۔ بڑی اماں بڑبڑاتی۔“

”بڑے بیٹے کے نام سے تو چڑ ہے انہیں اور اس کی اماں کو چاہے کندھوں پر اٹھائے پھریں۔“

آپا تڑپ کر مڑی۔ اس نے نگاہ بھر کر بڑی اماں کی طرف دیکھا۔ تو بہ وہ ایک نگاہ۔۔۔۔۔۔ جیسے چیخیں بھری ہوئی ہوں۔ پھر آ پا نے منہ موڑ لیا۔ بھلا بڑی اماں کی طرف یوں دیکھنے سے فائدہ۔ آ پا بھی تو پلگی ہے۔ وہ بڑھیا تو مٹی کی بنی ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔ مٹی کی۔ وہ تو کبھی ہوئی بات کو بھی نہ سمجھے جب تک اس بات کو بار بار ڈھولک کی طرح نہ پیٹو۔ نہ جانے کبھی بوڑھی ہو کر مٹی کی کیوں ہو جاتی ہیں۔ بائے۔۔۔۔۔۔ مجھے تو موت آ جائے بڑھا پا نہ آئے۔ میں تو جیتے جی مر جاؤں یوں مر کر جینے کا مزہ؟

آ پا کے دکھ کو کون نہیں جانتا۔ اب کوئی جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لے تو۔۔۔۔۔۔؟ پر کبھی جانتے ہیں گو آ پا نے کبھی ہونٹ تک نہیں ہلائے۔ بس یہی ہے نا کسی نے ایسی ویسی بات کہہ دی تو آ پا نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس گھور گھٹنا کو چھپا لیا۔ اور کسی نہ کسی طرف اکیلے میں جا بیٹھی۔ یا بھائی جان نے آ پا کے شوق بھرے سوال کے جواب میں یوں منہ پھیر کر کسی معمولی سی بات کو چھیڑ دیا اور آ پا کا سوال ان سنا کر دیا۔ اور پھر بے اعتنائی سے باہر نکل گئے۔ تو ایک آن کے لئے آ پا کی آنکھیں چمکیں اور پھر تیرنے لگیں۔ اور اس نے منہ موڑ کر اس چھوٹی جوڑے کو چھپا لیا۔ اور تو اور مجھ سے بھی چھپاتی تھیں۔ وہ سمجھتی ہوں گی میں بچہ ہوں۔ اتنی بڑی ہو گئی ہوں

اور ابھی بچہ۔۔۔۔۔ وہ تو خود بچہ ہے۔ ایک ذرا سے میاں کو اپنا نہ سکی۔ کبھی اندھے ہیں۔ کیا آپ اور کیا کوئی اور۔ امی بھی تو چھپایا کرتی ہے مجھ سے بات۔ لیکن میں بھی بات جانے بنا نہیں رہتی۔ کیوں رہوں؟ پھر وہ چھپاتے کیوں ہیں مجھ سے؟ وہ نہ چھپائیں تو میں بھی نہ کریدوں۔ آپ تو جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔ جیسی تو لڑا کرتی ہے مجھ سے۔ فیضو تو بھی کریدے بنا تو نہ رہ سکی۔ توبہ یوں کسی کو بھرے گھر میں سے خارج کر دینا۔ نہ جانے کیسے ہیں یہ لوگ؟ کیا امی اور کیا ابا۔ کہتے ہیں۔۔۔۔۔ کھاؤ پیو، ہنسؤ کھیلو۔ لیکن گھر میں کوئی بات ہو تو بہرے بن جاؤ۔ اندھے ہو جاؤ۔ اور سن بھی لو تو سن کر یوں بھیگی ملی بنی بیٹھی رہو جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔ نا بھیجی۔ ہم سے تو نہیں بنا جاتا بھیگی ملی۔ اس سے تو ویرانے میں جا رہنا ہی اچھا ہے۔ نہ بھیجی ہم سے تو جیتے جی مرانہ جائے گا۔ کہہ دیکھ بھی لو اور پھر جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ سن لینا پر نہ جاننا۔۔۔۔۔ تو بھی۔ یہ ہو سکتا ہے کیا؟ یوں سننے کو تو ہماری چتری مرغی بھی سنتی ہے۔ مزا تو جب ہے کہ بات سن کر اسے جان لیا جائے جیسے وہ آپ بیتی ہو۔ پھر پتہ چلتا ہے بات کا۔ اور وہ بات ہی کیا جو اندر جا کر نا چنے نہ لگے۔ یا کچھ توڑ پھوڑ نہ دے۔ یا کہیں آگ نہ لگا دے۔ وہ نجمہ ہی ہے۔۔۔۔۔ بھیگی ملی۔ جو سنتی بھی رہتی یوں ہے جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔ مکار کہیں کی۔۔۔۔۔ ہونہہ!!

کیا میں نہیں جانتی کہ بھائی جان آپ سے بیاہ کرنے پر راضی نہ تھے۔ ان کے ابا اور اس بڑھیا نے زبردستی انہیں آپ سے جوڑ دیا۔ جیسے نانگے میں ٹٹو جوڑ دیتے ہیں۔ ہمارے ابا کو تو پتہ ہی نہ تھا کہ بات یوں ہے۔ وہ تو یہ سمجھتے تھے جیسے دوسری شادیاں ہوتی ہیں ویسی ہی ہے یہ شادی۔ بھائی جان بھی تو ابا کے سامنے جا کر یوں بیٹھ رہتے، منہ میں گھٹکنیاں ڈال کر جیسے بڑے اکیلے ہوں۔ توبہ۔۔۔۔۔ کیسے مکار ہوتے ہیں مرد۔ کتنے بہرہ و دھار سکتے ہیں۔ پراڑتی اڑتی یہ بات ہم تک پہنچ ہی گئی تھی۔ آخر چھپتی کہاں ہے چھپانے سے ایسی بات۔ جو بھی آتی، امی کے کان میں منہ دے کر بیٹھ جاتی۔ اور جب بھی کوئی امی سے منہ جوڑ کر بیٹھتی تو چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتی اور مجھ سے کہتی ”اے ہے لڑکی تم اب کھیلونا جا کر۔“ اور امی فوراً یہ کہتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتی ”فیضہ بیٹی اب دو لفظ پڑھ لو نا بیٹھ کر۔“ تو میں جھٹ تاڑ جاتی کہ کوئی بات ہوگی۔ بس پھر تو میرے تن بدن میں چیونٹیاں چلنے لگتیں۔ جیسے رگوں میں بات رینگ رہی ہو۔ سر سر کر رہی ہو۔ بات، بات، بات اور دل یوں بجتا۔ سن۔۔۔۔۔ سن۔۔۔۔۔ سن۔ پھر نہ سننا کس قدر مشکل ہو جاتا تھا میرے لئے۔ دیوار کے پیچھے کھڑکی کی اوٹ میں۔ باورچی خانے کی ڈولی کے پیچھے۔ بھائی جان کے کمرے میں میز کی اوٹ میں۔ اور آپا کے کمرے میں ہو تو کھڑکی کی درز میں سے۔ وہاں سے تو کہنے والی کا منہ بھی دکھتا تھا۔ ہائے بات سن لینا پر کہنے والی کو نہ دیکھنا۔ نہ جی ہم تو کبھی نہ سنیں روکھی بات جو صرف کان میں بھنھنائے اور بس۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی بغیر کھائے حلوہ نگل لے۔ جب وہ ہاتھ

لو ہالال ہو۔ جب موقع آیا تو بیگم بن ٹھن کر بیٹھ گئی۔ ہائے کیسی پیاری لگتی ہے امی جب وہ بن ٹھن تیار ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ میرا توجہ جی چاہتا ہے کہ ہاتھ چوم لوں اس کے۔

پہلی مرتبہ جب آپا سسرال آئی تو امی نے مجھے بھی بھیج دیا ساتھ۔ آئی تو بڑی چاؤ سے تھی پر توبہ ہے پرائے گھر میں یوں آ بیٹھنا۔ میرا جی چاہتا تھا، چیخیں مار کر رو پڑوں۔ میں تو پھر نجمہ سے کھیل کر وقت کاٹ لیتی۔ اور دن میں چار چار بار اپنے گھر سے ہو آتی پر آپا۔۔۔۔۔ یوں گٹھڑی بن کر پڑی رہی گویا جان نکل چکی ہو۔ کسی نے پلہ اٹھا دیا تو منہ دیکھ لیا۔ کسی نے ہاتھ یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دیا تو وہیں پڑا رہا جیسے مسالے کی بنی ہوئی جاپانی گڑیا ہو۔

توبہ۔۔۔۔۔ اس روز گھر میں ایک قیامت دہی ہوئی تھی۔ بڑی اماں بھائی جان کے ابا کے کان میں منہ دیئے بیٹھی تھی۔ نجمہ بانو سے پوچھ رہی تھی اور بانو مسکرا کر کہتی۔ ”چپ کوئی سن لے گا۔“ اور بھائی جان چار پائی پر پڑے تھے۔ اور ان کے بڑے بھائی جو ڈاکٹر ہیں، دہی زبان میں چیخ رہے تھے۔ ”اگر تمہیں گھر کی لاج کا خیال نہیں تو پھر یہاں رہنے کا مطلب۔“ پھر بڑی اماں ڈاکٹر بھائی کی منتیں کر رہی تھی۔ ”آپ ہی سمجھ جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ اے ہے جو ان لڑکا ہے اگر۔۔۔۔۔“ پھر ماں بیٹے کے پاس گئی۔ منتیں کرتی رہی۔ پھر ان کے ابا اندر چلے گئے اور لگے گھورنے۔ بہت چھپا چھپا کر رہے تھے بات۔۔۔۔۔ ہونہ۔ ساری دنیا جانتی تھی کہ بھائی بگڑے ہوئے ہیں اور کوئی رسم ادا کرنے کو نہیں مانتے۔ میں سب سمجھتی تھی۔ آپا کو زبردستی اس ڈھول پر منڈھ دیا گیا اور آپا۔۔۔۔۔ دم پخت دیگ کی طرح ڈھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ جیسے لجائی ہوئی ہو۔ ہونہ لجائی۔۔۔۔۔ میں کیا جانتی نہیں۔ سبھی یونہی بھیگی بلی بن کر بیٹھ جاتی ہیں سسرال میں۔۔۔۔۔ جیسے بہت لجا رہی ہوں۔ بڑی لجانے والی۔ چاہے دل میں چوہے ناچ رہے ہوں اور بدن میں چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ اس لئے تو نہیں بیٹھ رہتیں کہ بیٹھنے میں مزا آتا ہے انہیں۔ میں جانوں ڈرتی ہیں کہ کہیں اٹھ کر ناچنے نہ لگیں خوشی سے۔۔۔۔۔ پر آپا۔۔۔۔۔ آپا کس بات پر لجاتی۔ میں نے ایک بار پلہ اٹھا کر دیکھا تو آنسو۔۔۔۔۔ اتنا بڑا آنسو۔۔۔۔۔! ہائے میرا دل بیٹھ گیا اور میں لپٹ گئی آپا سے۔ اپنے انداز ہیں۔ کوئی شرم کی اوٹ میں مسکراہٹ چھپاتی ہے اور کوئی آنسو کی اوٹ میں۔ آپا سبھی کچھ جانتی تھی۔ نہ جانے آپا کو بات کیسے معلوم ہو جاتی تھی اور پھر بیٹھے بٹھائے۔ میں سارا سارا دن ماری ماری پھرتی۔ کبھی ڈولی کے پیچھے، کبھی میز کی اوٹ میں۔ تب کہیں جا کر پتہ چلتا کہ بات کیا ہے۔ مگر آپا ایک جگہ بیٹھے بیٹھے جان جاتی جیسے کان میں ریڈیو لگا ہو۔ خوشی کی بات ہو تو مسکراتی پھرتی اور اور ایسی ویسی ہو تو جھلکی ہوئی آنکھیں چھپاتی پھرتی بیٹھے بٹھائے بات پالینے میں اسے کمال حاصل تھا۔ ایک دن مجھ سے بولی ”فیضی یہ کیا عادت ہے تیری۔ یوں لوگوں کی

باتوں پر کان لگائے رکھنا۔ کسی کی بات میں دخل دینا اچھا نہیں ہوتا۔“ مجھے غصہ آ گیا میں نے کہا ”پھر تم کیوں دیتی ہو میری بات میں دخل؟ میں جانوں اور میرا کام۔ بڑی مکے سے آئی ہوئی تو دیکھو۔“ اور میں نے آپا کا منہ چڑا دیا۔

پہلے پہل تو بھائی جان آپا سے پرایوں کی طرح پیش آئے۔ ایک جگہ بھی تو نہ بیٹھتے تھے وہ دونوں۔ آپا اندر ہے تو وہ باہر جا بیٹھے۔ اور وہ باہر آ گئی تو یہ کمرے میں چلے گئے۔ بہانے بہانے۔ ہائے بے چاری آپا کیسے منہ دیکھتی رہی جاتی تھی۔ اس لئے آپا کو چپ لگ گئی نہ جانے کیا ہو گیا اسے۔ جب بھائی کسی کام کو کمرے میں آئے تو وہ آپ ہی آپ بڑبڑائی ”اوہ۔۔۔۔۔۔ میں تو بھول ہی گئی۔“ اور باہر نکل گئی۔ اور وہ باہر آئے تو ادھر ادھر ہو گئی۔ لیکن کیا مجال ہے جو چہرے سے ظاہر ہو۔ پہلے میرا خیال تھا کہ آپا جل گئی ہے بھائی جان سے، لیکن تو بہ آپا۔۔۔۔۔۔ آپا جل جانے والی کہاں؟ وہ تو سلگنا جانتی ہے اور بس۔ بھئی ایسا بھی نہ ہو کوئی۔ انھنی ہے اور چل پڑتی ہے لیکن نیچی نظر سے دیکھتی جاتی نہیں۔ جیسے چاہتا ہو اب بھی بلا لیں تو بیٹھ جاؤں۔ نہ جانے کے لئے بہانہ ڈھونڈتی تھی۔ ہائے یہ بھی کیا مصیبت ہے۔ عورتیں کیوں مرثی ہیں؟ سمجھ جاتی ہیں اور ویسے دیکھنے میں چھوٹی موٹی۔ ہٹو ہمیں شرم آتی ہے۔ نخر۔۔۔۔۔۔ بھی میں تو کبھی نہ یوں مرثیوں کسی پر۔

آخر بھائی جان کی اکڑفوں ٹوٹ ہی گئی۔ اگرچہ وہ بات تو پیدا نہ ہو سکی جیسے بڑی آپا کے گھر میں۔۔۔۔۔۔ ہائے بڑی آپا کے گھر میں تو میلا لگا رہتا ہے جیسے چینی کا ڈپوکھلا ہو۔ یہ آئی۔۔۔۔۔۔ وہ گئی۔ اور وہ دونوں یوں کندھے سے کندھا جوڑ کر بیٹھے رہتے ہیں جیسے میاں بیوی تو ہیں ہی نہیں، اک تماشا لگا رکھتے ہیں۔ اس نے چھیڑا اور اٹھ بھاگی۔ اب وہ پکڑ رہے ہیں اب چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹ رہے ہیں۔ اور اس نے چیخ ماری، جیسے کوئی مر رہا ہو۔ ادھر پڑوس میں دیوار پر سے اماں نصیبن جھانکی۔ ادھر چوہا رے کی کھڑکی میں ملک صاحب کی ماں آ کھڑی ہوئی۔ کیا ہوا۔۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔ اور یہ ہیں کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئے جارہے ہیں۔

یا کہیں گے نذرانہ ہمیں تکتے کیوں پسند ہیں؟ اور پھر بڑی آپا کے کندھے پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیں گے۔ اور وہ چلائے گی، کیوں میں کیا تکیہ ہوں؟ نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔ گاؤ تکیہ نہیں، میں تو چھوٹے سے تکتے کی بات کر رہا ہوں۔ اور پھر وہ اٹھ بھاگے اور آپا باہمی ہوئی پیچھے پیچھے۔ پھر اس روز جب بڑی آپا کا کندھا چھل گیا تھا۔ اور میں ان کے کہنے پر پنچر کی پھریری لائی تھی تو بولے ”فیضی یہ کیا مذاق ہے۔ اس پھریری سے کیا بنے گا۔ بیٹی بوتل ہی اٹھالاتی۔“

”بوتل۔۔۔۔۔۔ کیوں؟“ میں نے ویسے ہی پوچھا۔

بولے ”اوہ نہیں سمجھتی یہاں تو پہاڑ لینا ہے پہاڑ۔“

اور بڑی آ پا غرائی۔۔۔۔۔

تو بے اس گھر میں قہقہوں کے پٹائے چھوٹے ہیں ہر وقت اور یہ گھر۔۔۔۔۔ بس برف پڑ رہی ہے ہر وقت اور وہ ٹوٹی ہوئی پٹکی، پھپ پھپ۔۔۔۔۔ پھپ پھپ۔۔۔۔۔ پھپ اور بس۔ آ پانے منہ موڑ کر دیوار سے پوچھا ”مٹر گوشت بنالوں؟“ اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑائے ”بنالو“ یا انہوں نے صندوق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”یہ رومال تو بہت میلا ہو گیا ہے۔“ اور آ پابولی ”ابھی دھوئے دیتی ہوں۔“ پر ہزار شور ہو چاہے نجمہ بانو اور بڑھیا اکٹھی باتیں کر رہی ہوں، لیکن بھائی نے ہونٹ ہلائے اور آ پاکے کان کھڑے ہوئے۔ وہ آپس میں بات کر بھی لیتے اور ہمیں پتہ بھی نہ چلتا۔ آ پاتو شاید اسی بات پر خوش تھی کہ چلو زبان تو ملی بات کرنے کو۔ نہ کی تو نہ سہی۔ ان کے ہونٹوں کی طرف تکتے رہنا۔ ہائے کیا غلامی ہے۔ آ پاتو بس آئی گئی ہو کر رہ گئی تھی۔ آ پاکے اس بات پر یا نہ جانے کیوں کئی بار بھائی جان ٹھٹک جاتے اور پھر ایک بھر پور نگاہ ڈالتے اس پر۔ یوں چونک کر دیکھتے اسے گویا پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں اور آ پاسکرائی۔ چھپی چھپی مسکراہٹ۔ ایسی ایسی باتیں سن کر ہنس دیتی وہ یا جی ہاں کہہ دیتی جو کوئی اور بیوی سن لے تو قیامت ہی کھڑی کر دے۔ بس ہاں جی۔۔۔۔۔ جی ہاں اور جی کے سوائے کچھ کہنا ہی نہ جانتی تھی۔ بہت غصہ آتا تھا مجھے آ پاپر۔ اور یوں مسکرائے جاتی جیسے کوئی چشمہ پہاڑی کے اندر ہی اندر راستہ بنا رہا ہو۔ ہائے ری مکار۔۔۔۔۔

اس روز بھائی جان کسی قدر پریشان تھے۔ میں نے انہیں کبھی یوں بے قرار نہ دیکھا تھا۔ کبھی لیٹ جاتے پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھتے۔ پھر آ پاکے کمرے میں جھانکتے اور پھر جھینپ کر چلے جاتے یا اندر آتے بھی تو دو ایک ساعت کے لئے ادھر ادھر دیکھ کر لوٹ جاتے یا چونک کر کہتے ”تم ہو فیضو۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ اچھا“ اور پھر چلے جاتے۔ آ پابھی حیران تھی۔۔۔۔۔ آ خر شام کے قریب وہ بولے ”صفی کل مہمان آئیں گے۔ نہیں نہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ویسے ہی کہہ رہا ہوں۔ اچھا میں پھر بات کروں گا تم سے۔“ اور وہ چلے گئے۔ آ پانے آنکھیں کھولیں۔ میرا مطلب ہے اس نے نگاہ بھر کر دیکھا اور مسکرا دی۔ عجیب مسکراہٹ تھی وہ۔ تعجب، خوشی اور غم میں بیگی ہوئی مسکراہٹ۔۔۔۔۔ وہ چلے گئے تو آ پابڑبڑائی ”ہوں۔۔۔۔۔ میں جانتی تھی کہ ایک نہ ایک دن آئیں گے۔ آ ہی جائیں تو اچھا ہے۔“ پھر وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹکی۔ ”تو یہیں بیٹھی ہے فیضو؟“

”کون آئیں گے؟“ میں نے آ پاسے پوچھا۔

”ہوں گے نا کوئی، تم بھی دیکھ لینا۔“ وہ مسکرائی۔

میں نے بن جانے بوجھے کہہ دیا ”ہوں! تمہاری سہیلی ہوگی کوئی۔“

آپا بہت ہنسی۔ ہنستی ہی گئی۔ تو بہایا بھی کیا ہے۔ خواہ مخواہ دوسرے کو شرمندہ کر دینا۔ میں نے کوئی بری بات تو نہ کہی تھی۔ پھر بولی ”ہاں میری ہی تو ہے۔“ میں چڑ گئی تھی۔ میں نے کہا ”چاہے کوئی ہو تمہاری سہیلی یا ان کی دوست“ ہمیں اس سے مطلب؟“ اور آپا پھر ہنسنے لگی۔ کہنے لگی ”میری سہیلی جو ہوئی، سوان کی بھی تو ہونی ہوئی کچھ۔“

رات کو بھائی جان نے دو ایک مرتبہ ہمارے کمرے میں جھانکا۔ اس کمرے میں آپا اور میں سوتے تھے۔ پہلے بانو سویا کرتی تھیں۔ یہیں آپا کی چار پائی اور ننھے کے کھٹولے سے پرے اس کونے میں۔ ان دنوں وہ آپا کو دبایا کرتی تھی۔ پھر آپا نے کہا۔ ”بانو اب میں اچھی ہوں جب ضرورت پڑے گی بلالیا کروں گی۔“ بس پھر ہم دونوں اکیلے رہ گئے یہاں۔ ساتھ ہی بھائی صاحب کا کمرہ تھا۔ دروازہ میرے سرہانے کھلتا تھا۔ بھائی جان نے جو جھانکا تو میں بولی ”بھائی جان کب آئیں گے وہ مہمان؟“ بھائی جان حیران اور آپا کبھی غصے میں اور کبھی مسکراتی ہوئی۔ پھر بھائی جان بولے ”فیضو کو الہام بھی ہونے لگا ہے اب بڑی مشکل ہو گئی۔“ میں نے کہا ”میں کیا جانتی نہیں آپا کی سہیلی آئی۔“

”تو پھر پوچھ اپنی آپا سے۔“ وہ بولے۔ پھر وہ آپا سے بولے ”صفی تمہیں نیند تو نہیں آئے گی۔“ آپا نے نگاہ بھر کر دیکھا اور مسکرائی اور وہ بولے ”نہیں! اگر تمہیں نیند آئی ہے تو بے شک سو جاؤ۔ میرا مطلب ہے میں ذرا سا کام کر لوں۔“ اور انہوں نے گھبرا کر میری طرف دیکھا پھر آپا کی طرف۔ میں سمجھ گئی کہ بس اس بات کے انتظار میں ہیں وہ کہ میں سو جاؤں۔ پھر کیا تھا ابھی دو منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ لگی انگڑائیاں اور جمائیاں لینے اور پھر پتھری پڑ گئی جیسے کل کی مری ہوئی تھی۔ تو یہ۔۔۔۔۔ ایسے سے کیا مجال کہ ذرا سی بھی مل جاؤں۔ چاہے لاکھ چوئیاں ریٹگیں کھلی ہو انہوں۔۔۔۔۔۔۔

بھائی جان نے آکر پہلے میری طرف دیکھا۔ میں نے پہلے سے رضائی میں درزر رکھی تھی جس میں سے دیکھ بھی سکوں۔ وہ بولے ”فیضو سو گئی؟“

”فیضو!“ آپا نے مجھے آواز دی اور پھر مسکرا دی۔ میں چپ۔۔۔۔۔۔۔ بھائی نے اطمینان کا سانس لیا۔ بولے ”یہاں بیٹھ جاؤں میں؟“ آپا ذرا پرے سرک گئی۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ میں جانوں وہ گھبرار ہے تھے۔ شاید اس لئے کہ کیسے شروع کریں بات۔ بات کرنے سے ڈرتے ہوں گے۔ آپا بھی تاڑ گئی۔ اور آپ ہی چھیڑ دی اس نے۔

بولی ”کب آئیں گے مہمان؟ فیضی کی بات پر نہ جائیں آپ۔“

”نہیں نہیں ٹھیک ہے۔“ وہ بولے ”تم نے سچ کہا تھا وہ کل آ رہی ہے کل رات کو میں تمہیں دھوکے میں نہ رکھوں گا صفی

----- نہ جانے وہ کیوں آرہی ہے۔“ وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگے ”کسی گاؤں میں جانا ہے۔ ضروری کام ہوگا کل رات یہاں پہنچے گی پھر صبح سویرے موٹر سے چلی جائے گی اور شام تک لوٹ آئے گی۔ پھر رات یہاں رک کر صبح کی گاڑی سے واپس چلی جائے گی۔ لیکن وہ ویٹنگ روم میں ٹھہر سکتی تھی نہ جانے کیوں یہاں گھر آ کر ٹھہرنے پر ضد کر رہی ہے۔ اف ان کی ضد۔۔۔۔۔۔“ بھائی نے کہا ”اس کی ضد کون توڑے گا۔ اس کی ضد نے تو کیا کیا توڑ کر رکھ دیا۔ اسے بھی توڑ دیا لیکن۔۔۔۔۔۔“ وہ غصے میں بڑبڑائے ”اب آنے کا مطلب؟ یہ میں پسند نہیں کرتا۔ نہ جانے کیوں آرہی ہے وہ؟“

”بلکہ اچھا ہوا۔“ آپابولی ”مجھے تو کب سے ملنے کی آرزو تھی۔“

یہ سن کر بھائی جان حیران رہ گئے۔ ”تم نہیں جانتیں صفی۔۔۔۔۔۔“

”میں جانتی ہوں“ وہ بولی ”مجھے معلوم تھا وہ آئے گی ضرور آئے گی۔ مجھے کتنی خوشی ہوگی۔“

”تم۔۔۔۔۔۔“ بھائی جان نے آپا کی طرف دیکھا۔ جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں آپا کو۔ وہ گھبرائے ”صفی! تم جانتی نہیں۔“

”ہاں ہاں میں جانتی ہوں۔“

”میں تم سے کچھ نہ چھپاؤں گا۔ میں تمہیں دھوکہ نہ دوں گا“ صفی!“

”میں جانتی ہوں۔“ آپابولی۔ اس نے نگاہ بھر کر ان کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

”صفی“ بھائی نے حیرانی سے دیکھا۔ ان کی نگاہ تشکر سے لبریز تھی۔ ”کچھ دن کے لئے یہاں۔۔۔۔۔۔“ وہ زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔

آپابولی ”انہیں روک لیجئے گا۔ کچھ دیر اکٹھے رہیں گے۔ مجھے مدت سے آرزو تھی۔“

”نہ جانے تم کیا سمجھ رہی ہو صفی!۔۔۔۔۔۔ وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں۔“

”بس وہ تمہاری طرح ہے تمہاری طرح۔“ بھائی بولے

”میری طرح۔۔۔۔۔۔؟ میری طرح۔۔۔۔۔۔؟“ آپا کی اس مسکراہٹ میں کیا نہ تھا۔ طنز کی دھارتھی اور چیخ پکار بھی۔ ہائے

آپا کی وہ ہنسی۔ میں تو کانپ کانپ گئی۔

”جی“ بھائی بڑبڑائے۔ ”تمہاری طرح بے داغ، اجلی۔ ہم کالج میں اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ وہ سب سے الگ تھی۔ باقی

لڑکیاں تو چاؤ چو نچلے کرنے میں لگی رہتیں لیکن نیلی اس کا نام ہے۔ عیسائی ہے نا وہ۔ میں اسے نیلی کہا کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔ نیلی“ بھائی

”چاہے کسی کی ہو۔“ بڑی اماں بولی۔ ”پر ہے تو کافر میں تو کسی کافر کو منہ نہ لگنے دوں گی بچہ زچہ کے۔ نہ بھئی یہ شگن اچھا نہیں ہوتا۔“

اس روز میں نے دو پہر کو جی بھر کر سولیا۔ جانتی تھی نا کہ رات کو وہ آنے والی ہے۔ ہائے کس قدر چاؤ تھا مجھے اسے دیکھنے کا۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ دیکھوں تو کیسی ہے۔ بڑی پھین ہوگی۔ کالج کی جو ہوئی۔ ہائے میری تو جان جاتی ان کالج والیوں پر۔ کس طرح بات کرتی ہیں جیسے شربت کے گھونٹ پی رہی ہوں۔ اور پھر ان کا چلنا پھرنا۔ ہر بات میں لے ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ لے اور رنگ۔ رنگوں کے چناؤ میں تو حد کر دیتی ہیں۔ مجھے تو ان کالج والیوں سے عشق ہے۔۔۔۔۔۔ عشق

اپنا کمرہ خالی کر دیا۔ وہاں اس بیگم کی چار پائی ڈلوادی اور اپنی چار پائی ہمارے کمرے میں لے آئے۔ تو بہ کتنا انتظار کرنا پڑا مجھے۔ بھائی تو اسٹیشن گئے ہوئے تھے۔ اور آ پا کروٹیں لے رہی تھی۔ جیسے کسی پہلو قرار نہ ہو۔۔۔۔۔۔ نہ جانے کیا وقت تھا جب وہ آئے۔ اور میرا دل لگا دھک دھک کرنے۔ میں نے اپنی رضائی میں سے دیکھا پر۔۔۔۔۔۔ ایسی جگہ پر تھی میری چار پائی کہ وہ نظر نہ آئی۔ میں تو تڑپ کر رہ گئی لیکن ہلتی کیسے۔ میں تو کب کی یوں پڑی تھی جیسے نیند میں بے ہوش ہو کوئی۔ ہلتی تو آ پا کو پتہ چل جاتا۔۔۔۔۔۔ ادھر ان دونوں کا جھگڑا شروع تھا۔ ہائے کیسی پیاری آواز تھی۔ کیسا لوچ تھا۔ یوں گول گول لفظ نکلتے تھے منہ سے جیسے رس گلے ہوں۔ پر تھی وہ اس طرف دیوار کی اوٹ میں اور سامنے بھائی جان کرسی پر بیٹھے تھے۔

وہ بچے کو دیکھنے کی ضد کر رہی تھی اور بھائی جان کہہ رہے تھے۔ ”اگر کچھ ہو گیا تو سب سمجھیں گے کہ تم ہی کچھ کر گئی ہو۔“ وہ بھائی جان کی باتوں کو مانتی تو تھی۔ پر میں جانوں اسے آ پا اور ننھے کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ تو بہ۔۔۔۔۔۔ اس قدر دبی دبی باتیں کر رہے تھے وہ کہ سنی نہ جاتیں۔ کبھی کوئی لفظ کان میں پڑ جاتا۔ آ پا بھی تو بار بار کان سے بال ہٹاتی تھی۔ گود دیکھنے میں چپ پڑی تھی۔ وہ یوں کھوئی ہوئی تھی کہ ننھے کو تھکنا بھی بھول گئی تھی۔

”ہاں“ اس کی آواز آئی۔ ”اب میں نے جان لیا ہے۔“ اس نے اک آہ بھری ”اس بات میں مذہب کو لانا میری بھول تھی۔ لیکن۔۔۔۔۔۔“

”نہیں نہیں“ بھائی جان تڑپ کر بولے ”اب اب اس بات کو۔۔۔۔۔۔“

”ہاں اب۔۔۔۔۔۔“ وہ ہنسی۔ دھارسی تیز ہنسی۔ گویا وہ دھارا اپنے آپ کو کاٹ رہی ہو۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“ بھائی اٹھ بیٹھے۔ ”اگر اب جان بھی لیا تھا تو کہنے سے فائدہ۔۔۔۔۔۔؟ اوہ۔۔۔۔۔۔ یہ تم نے کیا کہا دیا

”بس میرا جی کہتا ہے۔“ آپابولی ”ایسی اچھی ہے وہ اس کی زندگی کیوں برباد کر رہے ہیں آپ؟“
 ”لیکن تمہاری زندگی؟“ بھائی بولے

”میری زندگی!“ آپانے دہرایا جیسے کوئی ٹوٹا ہوا پیالہ بچتا ہے۔ ”میری زندگی کو جانے دیجئے، گئی آئی چیز کا کیا ہے۔“

”نہیں نہیں“ بھائی غصے میں اٹھ بیٹھے ”یہ نہیں ہو سکتا“ اب تم اور مجھ میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔“ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ آپا کا چہرہ ہی کچھ اور ہو گیا۔ جیسے کوئی بیماری کے بعد سکھ کی نیند سو جاتا ہے۔ آپ ہی آپ مسکراتی تھی۔ ایسی جیسے نیا نیا سہاگ ملا ہو۔

شام کو نیلی لوٹ آئی۔ ہم سب انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب بڑی اماں عشاء کی نماز شروع کرے اور نیلی ہم سے ملے۔ چونکہ بھائی جان نے کہہ دیا تھا کہ اماں نماز شروع کرے گی تو ملا دیں گے تم سے۔ اماں کی نماز بھی تو ایسی ویسی نہ تھی۔ نہ جانے کیا کیا پڑھتی رہتی وہ۔ نماز ختم ہوتی تو کھڑی ہو کر کچھ پڑھتی۔ پھر بیٹھ کر ہونٹ ہلاتی رہتی اور پھر ایک لمبا سجدہ۔ یوں معلوم ہوتا جیسے سجدے میں ہی دم نکل گیا ہو۔ تو بے اس روز وقت تھا کہ رک گیا تھا۔۔۔۔۔ نہ جانے کس وقت اماں نے نماز شروع کی۔ اس نے کچھ زیادہ ہی دیر لگا دی۔ چونکہ نئی پڑوس سیدانی کو آنا تھا نا۔۔۔۔۔ بچی کو دیکھنے کے لئے، لیکن سیدانی نہ آئی۔ آخر اماں نے انتظار کے بعد شروع کی نماز۔ ہائے ری! وہ نیلی۔۔۔۔۔ کیا سمجھن تھی۔ کس شان سے وہ اندر آئی۔ گویا میم ہو میم۔ سنہرے بال۔ زرد مٹلی رنگ اور نیلی آنکھیں۔ آپانے نگاہ بھر کر دیکھا اور یوں چوکی جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ پھر بے اختیار پلا اٹھا کر ننھے کی طرف دیکھا اور پھر پاگلوں کی طرح نیلی کی طرف دیکھ کر ہنس پڑی۔ ”آئیے بیٹھے۔“

آپانے ننھے کو اٹھا کر نیلی کی گود میں ڈال دیا اور مسکرا کر بولی ”آپ ہی کا تو ہے چاہے ابھی لے لیں یا جب جی چاہے۔ میں تو دایہ ہوں اس کی۔“ اف آپا کی وہ بات۔

نیلی پہلے تو حیران بت بنی بیٹھی رہی پھر چونک کر بولی ”آپ کے مزاج تو اچھے ہیں؟“
 ”کیا ٹھکانے ہیں؟“ آپا ہنسی۔ بھائی جان گھبرا گئے۔

نیلی نے کہا ”کیسا پیارا ننھا ہے۔“ اور اس نے ننھے کی طرف دیکھا۔ اف۔۔۔۔۔ اس کا تو رنگ اڑ گیا۔ شرم سے یا نہ جانے کیوں پانی پانی ہو گئی۔ پھر بھائی بولے ”نیلی! صفی جانتی ہے۔“
 ”مجھے تو بہت خوشی ہے۔“ آپا کہنے لگی ”کہ گھر والی گھر آ گئی۔“

”نہیں نہیں“ نیلی چلائی۔ ”آپ نہیں جانتیں۔۔۔۔۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ آپا مسکرائی۔ ”ہم دونوں بہنیں اکٹھی رہا کریں گی۔ میں خدمت کروں گی۔“ آپا کی آواز بھرا گئی۔
 ”نہیں نہیں“ بھائی جان چیخنے لگے ”اب نہیں“

”نہیں نہیں“ بھائی جان چیخنے لگے ”اب نہیں“

عین اس وقت دروازہ کھلا اور ایک بڑھیا اندر آگئی ”میں پڑوس سے آئی ہوں بیٹی“ وہ بولی ”برانہ ماننا“ میرا جی چاہتا تھا ننھے کو دیکھ آؤں۔“ بھائی سرک کر کونے میں ہو گئے۔ نیلی نے کرسی بھیج کر کر بڑھیا کو بٹھالیا۔ میں جانوں، وہی سیدانی تھی۔ بڑی اماں انتظار کرتی رہی تھا جس کا۔ سلام کے جواب میں وہ دعائیں دینے لگی۔

رہی تھا جس کا۔ سلام کے جواب میں وہ دعائیں دینے لگی۔

پھر بولی۔ ”کہاں ہے ننھا؟“ ننھے کو دیکھا اور پھر غور سے نیلی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس وقت اس کی گود میں تھا نا وہ۔ ”اللہ عمر دراز کرے“ وہ بولی ”کیسا پیارا ہے“ نیلی کی طرف غور سے دیکھ کر کہنے لگی ”بالکل اپنی ماں پر گیا ہے۔“ بھائی جان کا منہ فق ہو گیا۔ نیلی تو تصویر بنی بیٹھی تھی۔ یہ وہ اپنی دھن میں بولتی رہی۔

تو تصویر بنی بیٹھی تھی۔ پروہ اپنی دھن میں بولتی رہی۔

”اے ہے لڑکی۔۔۔۔۔“ اس نے نیلی سے کہا ”یوں کرسی میں بیٹھنا۔ تو بہ آج کل کی لڑکیاں تو زچہ بننا جانتی ہی نہیں۔۔۔۔۔“
 ”تجھے تو پنگ پر لیٹنا چاہیے۔“

-----تجھے تو پلنگ پر لیٹنا چاہیے۔“

میں نے کہا ”نانی۔۔۔۔۔ ننھے کی اماں تو یہ رہی۔“ میں نے آپا کی طرف اشارہ کیا۔ بڑھیا نے غور سے آپا کی طرف دیکھا۔ پھر وہ ہنسی۔ ”اے ہے لڑکی! مذاخ کرتی ہو، یہ بال دھوپ میں تو نہیں سفید کئے۔“ پھر وہ ننھے سے مخاطب ہوئی ”چاہے ننھے سے پوچھ لو کہ کون ہے اس کی اماں“ نیلی بت بنی بیٹھی تھی۔ ادھر آ پا گئنا نہ لگی۔ ”نہیں اب ہمارے درمیان کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔“ وہ پاگلوں کی طرح ہنسی۔

کی طرح بنی۔

بڑھیا جو اپنی دھن میں بولتی گئی ”کہتے ہیں، سچ کہتے ہیں، یہاں سے باپ کی نظر میں جو دلہن کی صورت بچ جائے تو بچے کو تو ماں پر جانا ہی ہوا۔“

”ہی ہوا۔“

بڑھیا بولی ”کیا ہنستی ہے بیٹی! بچہ حائل کہاں ہوتا ہے وہ تو لمبے دونوں میں بندھن بن جاتا ہے۔“ بڑھیا نے بھائی اور نیلی پر معنی خیز نگاہ ڈال کر کہا۔۔۔۔۔ ”اور پھر جب ماں پر شکل ہو اس کی۔“

خیز نگاہ ڈال کر کہا۔۔۔۔۔ ”اور پھر جب ماں پر شعل ہو اس کی۔“



چپ

”چپ“

جیناں نے چچی کی نظر بچا ماتھے پر پیاری تیوری چڑھا کر قاسم کو گھورا۔ اور پھر نشے کی شلوار کے اٹھائے ہوئے پائے کو مسکرا کر نیچے کھینچ لیا اور از سرنو چچی سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ قاسم چونک کر شرمندہ سا ہو گیا اور پھر معصومانہ انداز سے چار پائی پر پڑے ہوئے رومال پر کاڑھی ہوئی نیل کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کا دل خواہ خواہ دھک دھک کر رہا تھا۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا گویا اس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہو۔ قاسم کئی بار یوں چوری چوری جیناں کے جسم کی طرف دیکھتا ہوا پکڑا جا چکا تھا۔ جیناں کے مسکرا دینے کے باوجود وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا اور اس کی نگاہیں چھپنے کے لئے کونے تلاش کرتیں۔ نہ جانے کیوں یوں ان جانے میں اس کی نظر جیناں کے جسم کے بیچ و خم یا ابھار پر جا پڑتی اور وہیں گڑ جاتی۔ اس وقت وہ قطعی بھول جاتا کہ کدھر دیکھ رہا ہے یا کچھ دیکھ رہا ہے۔ مصیبت یہ تھی کہ بات تبھی وقوع میں آتی جب جیناں کے پاس کوئی نہ کوئی ہمسائی بیٹھی ہوتی۔ پھر جب جیناں اکیلی رہ جاتی تو وہ مسکرا کر پوچھتی ”کیا دیکھتے رہتے ہو تم قاسی؟“۔۔۔۔۔

”میں۔۔۔۔۔ میں نہیں تو“ وہ گھبرا جاتا اور جیناں ہنستی مسکاتی اور پھر پیار سے کہتی ”کسی کے سامنے یوں پاگلوں کی طرح نہیں دیکھا کرتے بلو“ اگرچہ اکیلے میں بھی جیناں کا پانسچہ اکثر اوپر اٹھ جاتا اور دوپٹہ بار بار چھاتی سے یوں نیچے ڈھلک جاتا کہ سائل میں لمبوس ابھار نمایاں ہو جاتے۔ لیکن اس وقت قاسم کو ادھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی حالانکہ جیناں بظاہر شدت سے کام میں منہمک ہوتی۔ لیکن قاسم بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھتا۔ اب میں جاتا ہوں۔ وہ نظر اٹھاتی اور پھر لاڈ بھری تیوری چڑھا کر کہتی ”بیٹھو بھی جاؤ گے کہاں؟“

”کام ہے ایک“ قاسم کی نگاہیں کونوں میں چھپنے کی کوشش کرتیں۔

”کوئی نہیں کام و ام۔ پھر کر لینا۔“ لیکن وہ چلا جاتا جیسے کوئی جانے پر مجبور ہو اور آپ ہی آپ بیٹھی مسکاتی رہتی۔

اس روز جب وہ جانے لگا تو وہ مشین چلاتے ہوئے بولی ”قاسی ذرا یہاں تو آنا۔۔۔۔۔ ایک بات پوچھوں بتاؤ گے؟“

”کیا ہے؟“ وہ رک گیا۔

”یہاں آؤ بیٹھ جاؤ۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بنا بولی۔

وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ زیر لب مسکرائی۔ پھر دفعتاً اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال کر اس کے سر کو اپنی رانوں پر رکھ کر تھکنے لگی۔ ”سچ بتانا قاسی“ دو ایک مرتبہ قاسم نے سر اٹھانے کی کوشش کی لیکن نشے کی ریشمیں نرمی، خس کی ہلکی ہلکی خوشبو اور جسم کی مدھم مٹھلی گرمی۔۔۔۔۔ اس کی قوت حرکت مثل ہو گئی۔ ”تم میری طرف اس طرح کیوں گھورتے رہتے ہو۔۔۔۔۔ ہوں؟“ اس نے ایک پیار بھرا تھپڑ مار کر کہا۔ ”بتاؤ بھی۔۔۔۔۔ ہوں؟“ قاسم نے پورا زور لگا کر سر اٹھا لیا۔ وہ انجانے جذبات کی شدت سے بھوت بنا ہوا تھا۔ آنکھیں انکارہ ہو رہی تھیں۔ منہ نبات کی طرح سرخ اور سانس پھولا ہوا تھا۔ ”ہیں۔۔۔۔۔ یہ تمہیں کیا ہوا؟“ وہ منہ پکا کر کے پوچھنے لگی۔ ”کچھ بھی نہیں۔“ قاسم نے منہ موڑ کر کہا۔ ”خفا ہو گئے کیا؟“ اس نے از سر نو مشین چلاتے ہوئے پوچھا اور دوپٹہ منہ میں ڈال کر ہنسی روکنے لگی۔ ”نہیں نہیں کچھ بھی نہیں“ وہ بولا۔ ”اچھا اب میں جاتا ہوں۔“ اور باہر نکل گیا۔

اس کے بعد جب وہ اکیلے ہوتے قاسم اٹھ بیٹھتا۔ ”اچھا اب میں جاتا ہوں۔“ لیکن اس کے باوجود منہ موڑ کر کھڑا رہتا اور وہ مسکراہٹ بھینچ کر کہتی ”اچھا۔۔۔۔۔ ایک بات تو سنو۔“ اور وہ معصوم انداز سے پوچھتا ”کیا بات ہے؟“

”یہاں آؤ بیٹھ جاؤ۔“ وہ منہ پکا کر کے کہتی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ کر اور بھی معصومانہ انداز سے پوچھتا۔ ”کیا ہے؟“ معائناتی ہاتھ حرکت میں آ جاتے اور قاسم کا سر مٹھلی، معطر تکیہ پر جا نکلتا اور وہ حنائی ہاتھ اسے تھکنے لگتے۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے دوڑ جاتے۔ سانس پھول جاتا۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکتا۔ ایک رنگین اضطراب اسے بے قرار کر دیتا اور وہ اٹھ بیٹھتا۔ ”اب میں جاتا ہوں۔“ اور وہ نیچی نگاہ کئے مسکاتی، مسکائے جاتی۔

پھر نجانے اسے کیا ہوا۔ ایک رنگین بے قراری سی چھا گئی۔ وہ چار پائی پر بیٹھا دعائیں مانگتا کہ وہ اکیلے ہوں۔ اس وقت آنکھیں یوں چڑھی ہوئیں جیسے پی کر آیا ہے۔ جسم میں ہوائیں چھوئیں۔ جیناں نیچی نظر سے اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتی اور پھر آنکھ بچا کر کوئی نہ کوئی شرارت کر دیتی۔ مثلاً جب چچی یا بڑی بی بی کی نظر ادھر ہو تو جیناں جیسے بے خبری میں کوئی کپڑا اپنی گود میں ڈال لیتی اور نیچی نگاہ سے قاسم کی طرف دیکھ کر اسے تھکنے لگتی اور قاسم۔۔۔۔۔ اف وہ بے چارہ تڑپ اٹھتا اور جیناں منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر ہنسی روکنے کی کوشش کرتی۔ یا وہ دونوں ہاتھ قاسم کی طرف بڑھا کر پھر اپنی گود کی طرف اشارہ کرتی گویا بلارہی ہو۔ اور جب چچی یا بڑی بی بی کا دھیان ادھر ہوتا تو جیناں بڑی سرگرمی سے کپڑا سینے میں مصروف ہو جاتی اور مزید چھیڑنے کے خیال سے اپنے دھیان بیٹھی پوچھتی ”قاسم آج اس قدر چپ بیٹھے ہو۔ لڑ کر تو نہیں آئے اماں سے؟“

پھر جب وہ اکیلے رہ جاتے تو قاسم چپکے سے اٹھ کر آپ ہی آپ جیناں کے پاس آ بیٹھتا۔ دو ایک مرتبہ ہلتی نگاہوں سے اس حنائی

ہاتھ کی طرف دیکھتا جوشدت سے کام میں مصروف ہوتا اور پھر آپ ہی آپ اس کا سر جھک کر اس معطر سر ہانے پر ٹک جاتا۔ یا جب وہ اس کے پاس آ کر بیٹھتا تو وہ منہ پکا کر کے کہتی ”کیوں۔۔۔۔۔ کیا ہے؟“ اور جب اس کا سرو ہاں ٹک جاتا تو ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی ”بہت شریر ہوتے جا رہے ہو۔ کوئی دیکھ لے تو؟ کچھ شرم کیا کرو۔“

ایک دن جب وہ سر ٹکائے پڑا تھا۔ وہ بولی ”قاسی کیا ہے تمہیں؟ یوں پڑے رہتے ہو، گم صم۔ مزہ آتا ہے کیا؟“ اس روز سرائٹھا لینے کی بجائے نہ جانے کہاں سے اسے زبان مل گئی۔ بولا ”مجھے تم سے محبت۔۔۔۔۔“ معاینات نے اس کا سردبا کر اس کا منہ بند کر دیا۔ ”چپ“ وہ بولی ”کوئی سن لے تو“ بیاہتا سے پیار نہیں کرتے۔ انہیں پتہ چل جائے تو میری ناک چوٹی کاٹ، گھر سے نکال دیں۔ سنا بلو“ وہ اٹھ بیٹھا لیکن اس روز دوڑتے ڈوروں کی بجائے اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ ”اب میرا کیا ہوگا؟“ آنسوؤں نے اس کا گلہ دبا دیا۔ اور جیناں کے بلانے کے باوجود وہ چلا گیا۔ اور حسب معمول چوری چوری غسل خانے میں منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے لگا۔

نہ جانے ان محنتی، معطر رانوں نے کیا کیا۔ چند ماہ میں ہی وہ قاسی سے قاسم بن گیا۔ گردن کا منکا ابھرا آیا۔ آواز میں گونج پیدا ہو گئی۔ چھاتی پر بال اگ آئے اور دونوں جانب گلٹیاں سی ابھرا آئیں۔ جن پر ہاتھ لگانے سے میٹھا سا درد ہوتا۔ منہ پر موٹے موٹے دانے نکل آئے۔

پھر ایک دن جب وہ ادھر جانے کی خاطر بولا تو ماں بولی ”کدھر جا رہا ہے تو؟“۔۔۔۔۔ ”کہیں بھی نہیں“ وہ رک کر بولا ”ادھر جیناں کی طرف اور کہاں۔“

”منہ پر داڑھی آچکی ہے پر ابھی ہوش نہیں تجھے۔ اب وہاں جا کر بیٹھنے سے مطلب۔ نہ جانے لوگ کیا سمجھنے لگیں۔ مانا کہ وہ اپنی ہے بیٹا اس کی عزت ہماری عزت ہے اور لوگوں کا کیا اعتبار“ قاسم دھک سے رہ گیا اور وہ چپ چاپ چارپائی پر جالیٹا۔ جی چاہتا تھا کہ چھین مار مار کر رو پڑے۔

شاید اس لئے کہ قاسی نہ آیا تھا یا واقعی اسے کالے دھاگے کی ضرورت تھی، جیناں مسکراتی ہوئی آئی ”بھابی“ اس نے قاسم کی ماں کو مخاطب کر کے کہا ”کالا دھاگا ہوگا تھوڑا سا؟“ اور پھر باتوں ہی باتوں میں ادھر ادھر دیکھ کر بولی ”قاسم کہاں ہے؟ نظر نہیں آیا آج۔ کہیں گیا ہوگا۔“

”اندر بیٹھا ہوگا۔“ قاسم کی ماں نے جواب دیا۔ ”ادھر نہیں آیا آج۔“ جیناں نے جھجک کر پوچھا ”خیر تو ہے؟“

”میں نے ہی منع کر دیا تھا۔“ بھابی بولی۔ ”دیکھ بیٹی اللہ رکھے۔۔۔۔۔ اب وہ جوان ہے۔ نہ جانے کوئی کیا سمجھ لے۔ بیٹی کسی کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھا جاتا اور محلے والیوں کو تو تم جانتی ہو۔ وہ بات نکالتی ہیں جو کسی کی سدھ بدھ میں نہیں ہوتی۔ اور پھر تمہاری عزت ہوئی۔ کیوں بیٹی۔۔۔۔۔ کیا برا کیا میں نے جو اسے جانے سے روک دیا۔“ ایک ساعت کے لئے وہ چپ سی ہو گئی۔ لیکن جلد ہی مسکرا کر بولی۔ ”ٹھیک تو ہے بھابی۔ تم نہ کرو میرا خیال تو کون کرے تم سے زیادہ میرا کون ہے۔ تم بڑی سیانی ہو بھابی“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”کہاں چھپا بیٹھا ہے؟“ اور اندر چلی گئی۔ قاسی کا منہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ اسے یوں چپ دیکھ کر وہ مسکرائی اور اس کے پہلو میں گدگدی کرتے ہوئے بولی ”چپ“ پھر با آواز بلند کہنے لگی ”مجھے ڈی ایم سی کا ایک ڈبہ لا دو قاسی۔ سبھی رنگ ہوں اس میں۔“ اور پھر اس کی انگلی پکڑ کر کاٹ لیا۔ قاسی ہنسنے لگا تو منہ پر انگلی رکھ کر بولی ”چپ۔“

”اب تو زندگی حرام ہو گئی۔“ قاسی نے اس کے کان میں کہا۔ ”اب میں کیا کروں گا؟ میرا کیا بنے گا؟“

”ہونہہ زندگی حرام ہوگئی۔ بس اتنی سی بات پر گھبرا گئے۔“ پھر باآواز بلند کہنے لگی ”ڈبے میں لال گولا ضرور ہو مجھے لال دھاگے کی ضرورت ہے۔“ جیناں نے یہ کہہ کر اس کے کان سے منہ لگا دیا۔ ”رات کو ایک بجے بیٹھک کی تیسری کھڑکی کھلی ہوگی، ضرور آنا۔“ ایک آن کے لئے وہ حیران رہ گیا۔ ضرور آنا، وہ اس کا سراپے بدن سے مس کرتے ہوئے بولی اور پھر باآواز بلند اسے ڈبے کے لئے تاکید کرتی ہوئی باہر نکل آئی ”آج نہ سہی کل ضرور آنا۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

اس رات محلے بھر کی آوازیں گلی میں آ کر گونجتیں اور پھر قاسم کے دل میں دھک دھک بجتیں۔ عجیب سی ڈراؤنی آوازیں۔ اس رات وہ آوازیں ایک نہ ختم ہونے والے تسلسل میں پہاڑی نالے کی طرح بہہ رہی تھیں۔ بہے جا رہی تھیں۔ محلہ ان آوازوں کی مدد سے اس سے انتقام لے رہا تھا۔ بچے کھیل رہے تھے۔ ان کا کھیل اسے برا لگ رہا تھا۔ نہ جانے مائیں اتنی دیر بچوں کو باہر رہنے کی اجازت کیوں دیتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی آوازیں مدھم ہوتی گئیں۔ پھر دور محلہ کی مسجد میں ملا کی اذان گونجی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی چٹینیں مار کر رو رہا ہو۔ کس قدر اداس آواز تھی جسے وہ بھیانک تر بنا رہا تھا۔ ایک ساعت کے لئے خاموشی چھا گئی۔ کراہتی ہوئی خاموشی۔ دروازے کھل رہے تھے یا بند ہو رہے تھے۔ اف کس قدر شور مچا رہے تھے وہ دروازے۔ گویا رینگ رینگ کر شکایت کر رہے ہوں۔

[illegible]

ہور ہے تھے۔ نجانے کیا ہور ہا تھا اس روز۔ گویا تمام محلہ تپ دق کا بیمار تھا۔ ”اکھڑ کھڑ دم‘ اہم اہم..... اہم۔“ یا شاید وہ سب تفریحاً کھانس رہے تھے۔ تمسخر بھری کھانسی جیسے وہ سب اس بھید سے واقف تھے۔

”ٹن ٹن۔۔۔۔۔ بارہ۔۔۔۔۔“ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے سنا۔ لیکن آوازیں تھیں کہ تھمتی ہی نہ تھیں۔ کبھی کوئی بچہ بلبلاتا تھا۔ اور ماں لوری دینا شروع کر دیتی۔ کبھی کوئی بڑھا کھانس کھانس کر محلے بھر کو از سر نو جگا دیتا۔ نہ جانے وہ سب یونہی بیدار رہنے کے عادی تھے یا اسی رات حالات بگڑے ہوئے تھے۔ دوسرے کمرے میں اماں کی کروٹوں سے چار پائی چیخ رہی تھی۔ اماں کیوں یوں کروٹیں لے رہی تھی۔ کہیں وہ اس کا بھید جانتی نہ ہو کہیں۔ چلنے لگے تو اٹھ کر ہاتھ نہ پکڑ لے اماں۔ اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔ شاید جیناں نہ آئے اور وہ مضطرب ہو جاتا۔ اف وہ کتے کیسی بھیا نک آواز میں رورہے تھے۔

شاید اس لئے کہ وہ جیناں کی گود میں سر رکھ کر روتا رہا۔ مجھے تجھ سے محبت ہے۔ میں تمہارے بغیر جی نہ سکوں گا۔ اور وہ حنائی ہاتھ پیار سے تھپکتا رہا۔ اور وہ آوازیں گونجتی رہیں یا شاید اس لئے کہ وہ سارا دن آہیں بھرتا۔ کروٹیں بدلتا اور چپ چاپ پڑا رہتا۔ رات کو علیحدہ کمرے میں سونے کی ضد کرتا اور پھر جیناں ڈی ایم سی کا گولا منگوانے آتی تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ آنکھیں جھومتیں اور وہ بھول جاتا کہ اماں کے پاس محلے والیاں بیٹھی ہیں۔ یا ویسے ہی جیناں کا ذکر چھڑ جاتا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ جیناں کے میاں روز بروز بیوی سے جھگڑا کرنے لگے تھے۔ حالانکہ جیناں بظاہر ان کا اتنا رکھ رکھاؤ کرتی تھی پھر ان دنوں تو وہ اور بھی دلچسپی ظاہر کرنے لگی تھی۔ مگر میاں کو نہ جانے کیوں ایسے محسوس ہوتا۔ گویا وہ توجہ صرف دکھلا دیتی اور وہ روز بروز ان سے بے پروا ہوتی جا رہی تھی۔ ممکن ہے اس کی وجہ محلے کی دیواریں ہوں جو اس قدر پرانی اور وفادار تھیں کہ جیناں کا یہ رویہ برداشت نہ کر سکتی ہوں۔ اس لئے انہوں نے وہ راز اچھال دیا۔ بہر حال وجہ چاہے کوئی ہو بات نکل گئی۔ جیسا کہ اسے نکل جانے کی بری عادت ہے۔

پہلے دبی دبی سرگوشیاں ہوئیں ”یہ اپنا قاسم۔۔۔۔۔ نواب بی بی کا لڑکا۔۔۔۔۔ اے ہے ایسا تو نہیں دکھے تھا۔“

۔۔۔۔۔ ”پر چاچی جیناں تو راہ چلتے کولپیٹ لیتی ہے۔“

”نہ بڑی بی! میرے من تو نہیں لگتی یہ بات۔ ابھی کل کا بچہ ہی تو ہے اور وہ اللہ رکھے بھری میاں اونہوں۔“۔۔۔۔۔ ”میں کہتی ہوں بی بی جب بھی جاؤ اتنی آؤ بھگت سے ملتی ہے کہ کیا کہوں۔ لوگوں کا کیا ہے جسے چاہا اچھال دیا۔“۔۔۔۔۔ ”پھر بھابی ذرا سے دیکھو تو اللہ مارے نشے کی شلوار ہے سائل کی قمیض ہے اور کیا مجال ہاتھوں پر مہندی خشک ہو جائے۔“۔۔۔۔۔ ”ہاں بہن رہتی تو

بن ٹھن کر ہے۔ یہ تو مانتی ہوں میں۔ اللہ جانے سچی بات منہ پر کبہ دینا میری عادت ہی ایسی ہے۔“-----”تو اس کے میاں کی بات چھوڑ، میں کہتی ہوں وہ تو بدھو ہے..... بدھو۔ وہ کیا جانے کہ بیوی کو کیسے رکھا جاتا ہے۔“-----”ائے ری کیا ہو گیا زمانے کو؟“

قاسم نے محسوس کیا کہ لوگ اس کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں۔ پہلے تو شرمندہ سا ہو گیا پھر اسے خیال آیا۔ کہیں بیٹھک کی تیسری کھڑکی ہمیشہ کے لئے بند نہ ہو جائے۔ اس کا دل ڈوب گیا۔ لیکن جوں جوں محلہ میں بات بڑھتی گئی، جیناں کی مسکراہٹ اور بھی ریلی ہوتی گئی اور اس کی ”چپ“ اور بھی دلنوار۔

”بس ڈر گئے؟“ وہ ہنستی ”ہم کیا ان باتوں سے ڈر جائیں گے؟“ اس کا حنائی ہاتھ اور بھی گرم ہوتا گیا۔ اور اس کا سنگھار اور بھی معطر۔ لیکن ان باتوں کے باوجود قاسم کے دل میں ایک پھانس سی کھلنے لگی۔

جب کبھی کسی وجہ سے بیٹھک کی تیسری کھڑکی نہ کھلتی تو معا سے خیال آتا کہ وہ اپنے میاں کے پہلو میں پڑی ہے اور وہ معطر گود کسی اور کو گھیرے ہوئے ہے۔ وہ حنا آلود ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ اس خیال سے اس کے دل پر سانپ لوٹ جاتا اور وہ تڑپ تڑپ کر رات کاٹ دیتا۔ پھر جب کبھی وہ ملتے تو شکوہ کرتا۔ رور و کرگلہ کرتا لیکن وہ ہاتھ تھپک تھپک کر اسے خاموش کر دیتا۔

ادھر قاسم اور جیناں کی باتوں سے محلہ گو نخبے لگا۔ مدھم آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ سرگوشیاں دھمکی کی صورت میں ابھر آئیں۔ اشارے کھلے طعنے بن گئے۔

”میں کہتی ہوں چاچی رات کو دونوں ملتے ہیں۔ مسجد کے ملانے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔“

”تم اس کے میاں کی بات چھوڑ دو بی بی! آنکھ کا اندھانا مچراغ دین۔ اسے کیا پتہ چلے گا کہ بیوی غائب ہے۔“

”سنا ہے چاچی ایک روز میاں کو شک پڑ گیا پر جیناں۔۔۔۔۔ تو بہ اس کے سر پر تو حرام سوار ہے۔ نہ جانے کیسے معاملہ رفع دفع اور ایسی بات بنائی کہ وہ بدھو ڈانٹنے ڈپٹنے کی بجائے الٹا پریشان ہو گیا۔ پیٹ میں درد ہے کیا، تم چلو۔ میں ڈھونڈ لاتا ہوں دوا۔ اب طبیعت کیسی ہے۔۔۔۔۔ ہونہر۔ وہاں تو اور ہی درد تھا بھابی۔ جمبی تو پھاہار کھوانے آئی تھی۔ مسجد کا ملا کہتا ہے بڑی بی۔۔۔۔۔ اے ہے اس کا کیا ہے؟ اپنی حمیدیاں کہتی ہے بی بی میں تو ان کی آوازیں سنتی رہتی ہوں۔ کان پک گئے ہیں۔ پڑوسن جو ہوئی ان کی اور پھر دیوار بھی ایک اینٹی ہے۔ تو بہ۔۔۔۔۔ اللہ بچائے حرام کاری کی آوازوں سے۔ نہ جانے کیا کرتے رہتے ہیں دونوں؟ کبھی ہنتے ہیں، کبھی روتے ہیں۔ اور کبھی یوں دنگا کرنے کی آواز آتی ہے جیسے کوئی کبڈی کھیل رہا ہو۔“

”پر مامی! اپنا گھر والا موجود ہو تو یوں جھک مارنے کا مطلب۔“

”تو چھوڑ اس بات کو! میں کہوں چوری کا مزہ چوری کا! سر پر حرام چڑھا ہے۔“

”پر مامی تو چھوڑ اس بات کو۔“

”دہن تجھے کیا معلوم کیا مزہ ہے اس چپ میں۔ اللہ بچائے۔ اللہ اپنا فضل و کرم رکھے۔ پر میں کہوں! یہ ”چپ“ کھا جاتی ہے۔

بس اب تو سمجھ لے آپ ہی۔“

پھر یہ باتیں مدھم پڑتی گئیں۔ مدھم تر ہو گئیں۔ حتیٰ کہ بات عام ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ غالباً ان لوگوں نے اسے کھلا راز تسلیم کر لیا۔ اور ان کے لئے مزید تحقیق میں دلچسپی نہ رہی۔ نہ جانے جیناں کس مٹی سے بنی تھی۔ اس کی ہر بات نرالی تھی۔ جوں جوں لوگ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے گئے! اس کی مسکراہٹیں اور بھی رواں ہوتی گئیں۔ حتیٰ کہ وہ محلے والیوں سے اور بھی ہنس ہنس کر ملنے لگی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہی اس کی پیٹھ پیچھے باتیں کرتی ہیں اور قاسم۔۔۔۔۔۔؟ قاسم سے ملنے کی خواہش اس پر حاوی ہوتی گئی۔ ہنس ہنس کر اسے ملتی۔ اس کے خدشات پر اسے چڑاتی! مذاق اڑاتی۔ اس کی ریشمیں گود اور بھی گرم اور معطر ہوتی گئی۔

مگر جب بات عام ہو گئی اور لوگوں نے دلچسپی لینا بند کر دی تو نہ جانے اسے کیا ہوا۔۔۔۔۔۔ اس نے دفعتاً قاسم میں دلچسپی لینا بند کر دی جیسے لوگوں کی چپ نے اس کی ”چپ“ کو بے معنی کر دیا ہو۔ اب بیٹھک کی تیسری کھڑکی اکثر بند رہنے لگی۔ آدھی رات کو قاسم اسے انگلی سے ٹھوکتا۔ اور بند پاتا تو پاگللوں کی طرح واپس آ جاتا اور پھر بار بار جا کر اسے آزما تا۔ اس کے علاوہ اب جیناں کو ڈی ایم سی کے دھاگے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ اس لئے وہ قاسم کے گھر نہ آتی۔ جب سے کھڑکی بند ہونا شروع ہوئی تو قاسم پاگل سا ہو گیا۔ وہ رات بھر تڑپ تڑپ کر گزار دیتا اور جیناں کا میاں تو ایک طرف! اسے ہر چلتا پھرتا راہ گیر جیناں کے نشے کی شلوار کی تہوں میں گیند بنا ہوا دکھائی دیتا۔ تعجب یہ تھا کہ اب جب اسے جیناں کی لاپرواہی کا شکوہ کرنے کا موقع ملتا تو وہ بے پروائی سے کہتی ”کوئی دیکھ لے گا“ تبھی چپن آئے گا تمہیں۔ مجھے گھر سے نکلوانے کی ٹھان رکھی ہے کیا؟ کیا کروں میں! وہ ساری رات جاگ کر کاٹے ہیں۔“

دو ایک مرتبہ ڈھیٹ بن کر کسی نہ کسی بہانے وہ جیناں کی طرف گیا بھی۔ اول تو وہاں کوئی نہ کوئی بیٹھی ہوتی اور جب نہ ہوتا تو بھی جیناں سینے کے کام میں اس قدر مصروف ہوتی کہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ ایک دن جب وہ ادھر گیا تو دیکھا کہ جیناں کے پاس اس کا ماموں زاد بھائی مومن بیٹھا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کبھی وہ خود بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ مومن کا سر بھی کسی ریشمیں معطر تکیے سے اٹھا ہے۔ اس پر دیوانگی کا عالم طاری ہو گیا اور جیناں کے بلانے کے باوجود چلا آیا۔ اس وقت اس جی چاہتا تھا کہ کسی

کھبے سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لے۔

ناگاہ وہ واقعہ پیش آیا۔ نہ جانے کیا ہوا؟ آدھی رات کو جیناں کی چیخیں سن کر محلے والیاں اکٹھی ہو گئیں۔ دیکھا تو جیناں کا خاوند پہلی کے درو سے تڑپ رہا ہے اور وہ پاس بیٹھی آنسو بہا رہی ہے۔ ڈاکٹر بلوائے گئے۔ حکیم آئے، مگر بے سود۔ صبح دس بجے کے قریب میاں نے جان دے دی اور جیناں کی پرورد چیخوں سے محلہ کانپ اٹھا۔ لیکن اس کے باوجود دبی ہوئی سرگوشیاں از سر نو جاگ پڑیں۔ کوئی بولی ”اب قدر جانی جب وہ مر گیا۔“ کسی نے کہا ”ابھی کیا ہے ابھی تو جانے گی“ بے چارہ ایسا نیک تھا۔ اف تک نہ کی اور یہ بی بی ہولی کھیلنے میں مصروف لگی رہی۔“ چاچی نے سر پیٹ لیا ”کہنے لگی ”آئے ہائے ری تم کیا جانو۔۔۔۔۔۔ اس کے لچھن۔ میں کہتی ہوں نہ جانے کچھ دے کر مار دیا ہو۔“

”ہیں چاچی بس! تو چپ رہ ہائے ری جوان میاں کو تڑپا تڑپا کر مار ڈالا۔ وہ کیا منع کرتا تھا اسے۔ اس کے سامنے تو کھیلتی رہی اپنے کھیل۔ پھر جان لے لینا۔۔۔۔۔۔؟ یا اللہ تو ہی عزت رکھنے والا ہے۔ ہم تو کسی کو منہ نہیں دکھا سکتے۔ محلے کی ناک کاٹ دی۔ میں کہتی ہوں اگر سرکار کو پتہ چل گیا تو۔ وہ تو قبر بھی کھود لیں گے۔“

”بس بھابی بس تو چھوڑ اب اس بات کو دفع کر۔ سمجھ۔۔۔۔۔۔ کچھ ہوا ہی نہیں۔“

جب قاسم کی ماں نے سنا کہ بیٹا جیناں سے بیاہ کرنے پر تلا ہوا ہے تو اس نے سر پیٹ لیا۔ اپنا سر پیٹنے کے سوا وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ قاسم اب جوان تھا۔ اپنی نوکری پر تھا۔ ہر ماہ سو پچاس اس کی جھولی میں ڈالتا تھا۔ البتہ اس نے دو ایک مرتبہ اسے سمجھانے کی کوشش ضرور کی مگر بیٹا تو گھر بار چھوڑنے کے لئے تیار تھا۔ اس لئے وہ چپ ہو گئی۔ اگرچہ اندر ہی اندر گھٹنے لگی اور جیناں کے متعلق ایسی دعائیں مانگنے لگی کہ اگر وہ پوری ہو جائیں تو قاسم سر پیٹ کر گھر سے باہر نکل جاتا۔

جب محلے والیوں نے سنا کہ قاسم کا پیغام جیناں کی طرف گیا ہے تو چاروں طرف پھر سے چرچا ہونے لگا۔ ”کچھ سنا تم نے چاچی۔۔۔۔۔۔؟“

”بس تو چپ کر آج کل تو آنکھوں سے اندھے اور کانوں سے بہرے ہو کر بیٹھ رہو تب گزارا ہوتا ہے۔“

”پر چاچی کبھی سننے میں نہ آیا تھا کہ بیوہ کو کنوارہ لڑکا پیغام بھیجے۔۔۔۔۔۔ میں کہتی ہوں بیوہ مرجاتی تھی مگر دوسری شادی کا نام نہ لیتی تھی اور اگر کوئی پیغام لاتا بھی تو اس کا منہ توڑ دیتی۔ لیکن آج نہ جانے کیا زمانہ آیا ہے۔ پر چاچی وہ تولڑ کے ساتھ آٹھ سال بڑی ہوگی۔ اے اپنی فاطمہ سے دو ایک سال ہی چھوٹی ہے۔“

”آئے ہائے کیا کہتی ہوں۔ دکھنے کا کیا بہن! ہار سنگھار کر کے بیٹھ جاؤ۔ منہ پر وہ اللہ مارا کیا کہتے ہیں! اسے آٹا لگا لو تو تم بھی چھوٹی دکھو گی۔ دکھنے کا کیا ہے۔ اس سے تو عمر چھوٹی نہیں ہو جاتی۔“

قاسم کا خیال تھا کہ جب جیناں بیاہ کا پیغام سنے گی تو اٹھ کر ناپنے لگے گی لیکن جب اس نے دیکھا کہ سوچ میں پڑ گئی ہے تو جل کر راکھ ہو گیا۔ پھر۔۔۔۔۔ اسے مومن کا خیال آیا اور غصے سے منہ لال ہو گیا۔ ”صاف انکار کیوں نہیں کر دیتی تم؟“ اس نے گھور کر جیناں کی طرف دیکھا۔ جیناں مشین چلانے میں لگی رہی۔ پھر آنکھ اٹھائے بغیر کہا ”تم تو قاسی ہی رہے۔“

”قاسی رہتا تو تم اس قدر لا پرواہ کیوں ہو جاتیں؟“ وہ بولا

”میں تو لا پرواہ نہیں۔“ اس نے سوئی میں دھاگہ پروتے ہوئے کہا۔

”مجھے جواب دو۔“ وہ بولا۔ اس کی آواز میں منت کی جھلک تھی۔ ”جواب دو۔ میں یوں انتظار میں گھل گھل کر مرنا نہیں چاہتا۔“

”اچھا۔“ جیناں نے آہ بھر کر کہا۔ ”تمہاری خوشی اسی میں ہے تو یہی سہی۔“

”جیناں۔۔۔۔۔“ اس کا سر اس ریشمیں نکلنے پر جاٹکا۔

”اے ہے کوئی دیکھ لے گا۔“ وہ بولی۔

”دیکھ لے۔“ اس نے جیسے نیند میں کہا۔

”کہیں مومن نہ آ جائے۔“ جیناں نے سرسری طور پر کہا۔

”مومن۔۔۔۔۔“ اس کے دل پر تیر سا لگا۔ اور وہ اٹھ بیٹھا۔ ”مومن آ جائے تو اسے جان سے مار دوں۔“ وہ غرایا۔

اس کے نکاح پر محلے والیوں نے کیا کیا نہ کہا۔ کوئی بولی ”لو۔۔۔۔۔“ یہ یوسف زلیخاں کا قصہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

کسی نے کہا ”ابھی نہ جانے کیا کیا دیکھنا باقی ہے۔ ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔“

کسی نے کہا ”اے ہے جیناں! کیا اسے گود میں کھلائے گی۔ میاں نہ ہوا! لے پا لک ہوا۔“ چاچی ہنسی۔ بولی ”تو چھوڑ اس بات کو

بی بی! آج کل کے لڑکوں کو گود میں پڑے رہنے کا چسکا پڑا ہوا ہے۔ جو رو کو ماں بنا لیتے ہیں۔ ہاں۔۔۔۔۔“ کوئی کہنے لگی ”خیر چاچی

حرام سے تو اچھا ہے کہ نکاح کر لیں۔ کیوں بڑی بی بی ہے نایہ بات؟ میں تو سچی کہوں گی۔ ہاں بہن نہ جانے کب سے کٹے ہوئے تھے

ایک دوسرے سے۔“

نہ جانے بیاہ کے بعد کیا ہوا انہیں۔۔۔۔۔ جیناں تو گویا گھر گریہ ہستی عورت بن گئی۔ اس کے نشے کے پاجامے عام پاجامے نظر

آنے لگے جو محض جسم ڈھانپنے کے لئے پہنے جاتے ہیں۔ اور خس کی خوشبو تو گویا اڑ ہی گئی۔ حالانکہ اب بھی وہ خس کا عطر لگاتی تھی۔ اس کے اٹھے اور گرے ہوئے پانچوں میں چنداں فرق نہ رہا۔ البتہ جب کبھی قاسم اس کا پانچہ اٹھا ہوا دیکھتا تو پھر وہ بے قرار ہو کر اندر چلا جاتا۔ اور چپ چاپ پڑا رہتا۔ شروع میں وہ اکثر جیناں کے پاس آ بیٹھتا۔ لیکن اب جیناں کا حنائی ہاتھ شدت سے کام میں لگا رہتا اور اس کی گود بند رہتی۔ اگر کبھی قاسم کا سروہاں ٹک بھی جاتا تو وہ اپنے کام میں مگن یوں بیٹھی رہتی گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ کبھی چڑ کر کہتی۔ ”کیا بچوں کی سی باتیں ہیں تمہاری؟“ اس پر وہ محسوس کرتا۔ گویا وہ گود کسی اور کے لئے مخصوص ہو چکی ہو اور تھکنے والا ہاتھ کسی اور کا منتظر ہو۔

کئی مرتبہ دفتر میں کام کرتے ہوئے یہ شک سانپ کی طرح ڈسنے لگتا کہ دونوں بیٹھے ہیں۔ وہ اور مومن اور اس کا سر ریشمیں بٹکنے پر ٹکا ہوا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ کانپ اٹھتا اور واپسی پر جیناں کو ڈھونڈتا تو دیکھتا کہ جیناں کو یوں مگن بیٹھی ہے، گویا پرانے خواب دیکھ رہی ہو۔ کسی رنگین ماضی کے دھیان میں مگن ہو یا شاید کسی متوقع مستقبل کے۔ وہ چپ ہو جاتا۔ اسے یوں دیکھ کر جیناں مسکرا کر کہتی۔ ”کیا ہے آج سرکار کو؟“ اور وہ ہنسنے لگتی ”پائی ہوئی چیز کو کھونے کا بہت شوق ہے سرکار کو؟ پائی ہوئی۔۔۔۔۔۔“ وہ ہنستا۔ جسے رنگین خواب میسر ہوں۔ وہ بھلا تلخ حقیقت کو کیوں دیکھے۔ اسے جاگنے کی کیا ضرورت۔ جاگ کر دکھتا بھی کیا ہے۔ بس چپ چاپ سنائی دیتا ہے۔ ان دنوں تو ”چپ“ میں بہت مزہ تھا۔ اب ہماری چپ بھی پسند نہیں۔ اور وہ چڑ کر جواب دیتی۔ ”کہاں وہ چپ اور کہاں یہ۔۔۔۔۔۔“ وہ غصہ میں آ جاتا۔ ”نہ جانے کس کس سے چپ کا کھیل کھیلا ہوگا؟“ ”بس کھالیا شک نے۔“ وہ جل کر کہتی ”جی۔۔۔۔۔۔“ قاسم طنزاً جواب دیتا۔ ”تم تو ٹھہرے شکلی۔ اب مومن کیسے نہیں؟“

یا کسی روز دفتر سے واپسی پر وہ کہتا۔ ”کس کے انتظار میں بیٹھی تھی؟“ اور وہ جل کر بولتی ”کوئی بھی جو آ جائے۔“ ”اوہو“ وہ سنجیدگی سے چھیڑتا۔ ”ہم تو غلطی سے آ گئے۔“ ”تو واپس چلے جاؤ۔“ وہ جل کر کہتی۔

اس طرح مذاق ہی مذاق میں وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ جیناں کام میں منہمک رہنے لگی لیکن شاید کام تو محض ایک دکھاوا تھا۔ ایک پس منظر۔ ایک اوٹ جس میں ماضی کے خواب دیکھتی تھی۔ اس کے خواب قاسم کو اور بھی پریشان کرتے۔ اسے اس بات پر غصہ آتا کہ وہ خوابوں کو حقیقت پر ترجیح دے رہی ہے۔ پھر اسے خیال آتا کہ شاید کوئی اور خواب ہوں۔ جن کا اس سے تعلق نہ ہو۔ اس خیال پر اسے جیناں کے خوابوں میں مومن کی تصویر نظر آنے لگتی۔

البتہ ان دنوں جب قاسم کے ماں باپ چند دن کے لئے ان کے پاس آئے تو قاسم نے محسوس کیا کہ جیناں وہی پرانی جیناں تھی۔

اس روز جب اماں سے باتیں کر رہا تھا تو جیناں نے آ کر اندھیرے میں اس کی کمر پر چٹکی بھری۔ اور جب وہ گھبرا کر کچھ بولنے لگا تو بولی ”چپ“۔۔۔۔۔ اور ایک حنائی ہاتھ نے بڑھ کر اس کا منہ بند کر دیا۔ پھر اس دن جب وہ ابا کے پاس دیوان خانے میں سویا ہوا تھا کسی نے اس کے کان میں تنکا چھو کر اسے جگا دیا۔ ابھی وہ اٹھنے ہی لگا تھا کہ دو ہونٹ اس کے ہونٹوں سے مل گئے اور پھر ایک ہلکا سا پیارا سا تھپڑ گال پر پڑا۔ ایک حنائی انگلی اس کے ہونٹوں پر آ رہی۔ ”چپ“ اس معطر اندھیرے میں سے پیاری سی آواز آئی۔ بیشتر اس کے کہ قاسم اسے پکڑ سکتا وہ جا چکی تھی۔ پھر ایک روز غسل خانے میں جب وہ نہانے لگا تو معاً کوئی دروازے کی اوٹ سے نکل کر اس سے چٹ گیا۔ وہ گھبرا کر چلانے لگا۔ مگر دو حنائی ہاتھوں نے اس کا منہ بند کر دیا۔ ”چپ“ وہ دیوانہ وار ان حنائی ہاتھوں کو چومنے لگا۔ پھر جب اس نے جیناں کو پکڑنے کی کوشش کی تو وہ منہ پکا کر کے بولی ”شور مچا دوں گی تو ابھی اماں آ کر سمجھ لے گی تم سے۔“ جب اس کے والدین نے جانے کی تیاری کی تو قاسم نے اس خیال سے انہیں نہ روکا کہ ان کے چلے جانے پر اس کی کھوئی ہوئی جیناں مکمل طور پر اسے مل جائے گی۔ حالانکہ جیناں نے ہر ممکن طریقے سے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ اس کی منٹیں سن کر یوں گمان ہوتا تھا جیسے کوئی ڈوبتا تنکے کا سہارا ڈھونڈ رہا ہو۔ مگر وہ چلے گئے اور جیناں ہا کر بیٹھ گئی۔

ان کے چلے جانے کے بعد قاسم نے ہزار کوششیں کیں لیکن اپنی جیناں کو پانے کی جگہ اور بھی کھوئے چلا گیا۔ اس بات پر قاسم کے شکوک از سر نو چمکے۔ ان شکوک نے جیناں کو اور بھی چڑا دیا۔ جیناں کے چڑنے نے اس کے شبہات کو ہوا دی اور وہ چپ چاپ رہنے لگا۔ حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے سے اور بھی بیگانہ ہو گئے۔ پھر ایک دن جب وہ دفتر سے لوٹا تو اس نے دیکھا کہ جیناں بن ٹھن کر مشین پر کام میں لگی ہوئی ہے اور پاس مومن بیٹھا ہے۔ جیسے اس نے ابھی اس معطر گود سے سراٹھایا ہو۔ اس کی نظروں سے دنیا اندھیر ہو گئی۔ مومن کے جانے کے بعد وہ غرایا ”مومن اس مکان میں نہیں آئے گا۔ سنا تم نے؟ اس مکان میں کوئی جوان لڑکا نہ آئے۔“

”تمہارا ہی لگتا ہے کچھ میں کیا جانوں کون ہے؟“ وہ بولی۔

”اپنی گود سے پوچھ لو کہ کون ہے۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”بس جی“ وہ غصے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”پھر نہ کہنا یہ بات۔“

”کہنے کی کیا ضرورت۔“ وہ بولا ”اب کے آیا تو ہڈیوں توڑ دوں گا۔“

وہ شیرنی کی طرح پھر گئی۔ ”ذرا ہاتھ لگا کر تو دیکھو تم مجھ پر ہاتھ اٹھانے والے کون ہو؟“

قاسم کی نگاہوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس کا ہاتھ اٹھا۔۔۔۔۔ محلے والوں نے جیناں کی چیخیں سنیں۔ کوئی گرج رہا تھا۔ ”مومن

-----مومن“ وہ چیخ رہی تھی۔ ”بس میں اس گھر میں ایک منٹ نہ رہوں گی۔“

”سناتم نے“ اب مومن کا جھگڑا ہے۔ تو بہ۔۔۔۔۔۔ یہ عورت کسی لڑکے کو لپٹے بنا چھوڑے گی بھی“ میں کہتی ہوں اس کے سر پر حرام سوار ہے۔۔۔۔۔۔ ہاں۔“

”میں کہتی ہوں اچھا کیا جو میاں نے ہڈیاں سینک دیں ذرا۔“

”پر چاچی کہاں مومن کہاں جیناں۔ مومن تو اس کے بیٹے سامن ہے۔“

”اللہ تیرا بھلا کرے جی چھاتی پر لٹا رکھتی ہوگی نا؟“

”اب خاوند سے لڑ کر اپنے بھائی کے پاس چلی گئی ہے۔“

”نہ جانے وہاں کیا گل کھلائے گی۔ میں جانوں اچھا ہوا۔ خس کم جہاں پاک۔ مرد ہوتا تو جانے نہ دیتا۔ کمرے میں بند کر دیتا۔ اچھا نہیں کیا جو اسے جانے دیا۔“

”بلکہ وہ تو اور بھی آزاد ہو گئی۔“

”سنا ہے چاچی خط آیا ہے۔ ہاں۔۔۔۔۔۔ طلاق مانگتی ہے۔“

”بڑی آئی طلاق مانگنے والی۔“

”میری مانتے تو۔۔۔۔۔۔ ساری عمر بٹھار کھے۔“

”خیر بی بی یار انے کے بیاہ کا مزہ تو پایا۔“

”میں پوچھتی ہوں اب اور کسے پھنسائے گی؟“

”تمہیں کیا معلوم۔ اسی روز سے اپنا مومن غائب ہے۔“

”جی تو قاسی سر جھکائے پھرتا ہے۔ دنیا کو منہ کیسے دکھائے گا؟“

”میں کہتی ہوں بس ایک طلاق نہ دے اور جو جی چاہے کرے۔“

”ہونہہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ اپنی فاطمہ بتا رہی تھی کہ کاغذ خرید لیا ہے۔“

اس واقعہ پر قاسم کی زندگی نے ایک بار پھر پلٹا کھایا۔ اسے عورت سے نفرت ہو گئے۔ محبت پر اعتبار نہ رہا۔ ”عورت۔۔۔۔۔۔“ وہ دانت پیس کر کہتا ”عورت کیا جانے محبت کسے کہتے ہیں۔ ناگن صرف ڈسنا جانتی ہے صرف ڈسنا۔ اگر اس نے طلاق

لکھ بھیجی تھی تو صرف اس لئے کہ محلہ کے لوگ اسے مستفسر نہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اور عورتیں صبح و شام اس کی باتیں کرتی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس قصہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے اور اپنی زندگی از سر نو شروع کرے۔ لیکن جب اس نے سنا کہ جیناں نے مومن سے نکاح کر لیا ہے تو وہ اس بظاہر بے تعلقی کے باوجود جو وہ جیناں کے متعلق محسوس کرنا چاہتا تھا، تڑپ کر رہ گیا۔ حالانکہ وہ ہر وقت جیناں سے نفرت پیدا کرنے میں لگا رہتا تھا۔ اسے بھرا بھلا کہتا۔ بے وفا فاحشہ سمجھتا۔ لیکن کبھی کبھی اس کی آنکھوں تلے ریشمیں معطر گودا کر کھل جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہیں سر نکا دے۔ وہ حنائی ہاتھ اسے تھپکے اور وہ تمام دکھ بھول جائے۔ پھر کسی وقت اس کے سامنے ایک مسکراتا ہوا چہرہ آکھڑا ہوتا۔ دو ہونٹ کہتے ”چپ“ اگرچہ اس وقت وہ لاجور پڑھ کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا لیکن یہ تصاویر اسے اور بھی پریشان کر دیتیں۔ اور وہ اور بھی کھو جاتا۔ ایک سال کے بعد جب جیناں اور مومن محلے میں آئے تو پھر چرچا ہونے لگا۔ محلے والیاں بڑے اشتیاق سے دلہن کو دیکھنے لگیں۔ اگرچہ ان کی مبارکباد طعنہ آمیز تھی لیکن مومن کی ماں کو مبارک تو دینا ہی تھا۔

اتفاق کی بات تھی کہ جب مومن اور جیناں محلے میں داخل ہوئے، عین اس وقت قاسم گلی میں کھڑا چاچی سے بات کر رہا تھا۔ اس روز وہ ایک سرکاری کام پر ایک دن کے لئے باہر جا رہا تھا اور چاچی سے کہہ رہا تھا۔ ”ہاں چاچی سرکاری کام ہے۔ کل رات کی گاڑی سے لوٹ آؤں گا۔“ پیچھے آہٹ سن کر وہ مڑا تو کیا دیکھتا ہے جیناں کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ بھاگا حتیٰ کہ اسٹیشن پر جا کر دم لیا۔

اس روز دن بھر وہ جیناں کے بارے میں نہ سوچنے کی کوشش کرتا رہا۔ دل میں ایک اضطراب سا کھول رہا تھا مگر وہ تیزی سے کام میں مصروف رہا۔ جیسے ڈوبتا تنکے کا سہارا لینے کے لئے بے تاب ہو۔ کام ختم کر کے وہ رات کو گاڑی پر سوار ہو ہی گیا۔ گاڑی میں بہت بھیڑ تھی۔ اس گہما گہمی میں وہ قطعی بھول گیا کہ وہ کون ہے۔ کہاں جا رہا ہے اور وہاں کون آئے ہوئے ہیں۔ جب وہ محلے کے پاس پہنچا تو ایک بجنے کی آواز آئی۔ ”ٹن“۔۔۔۔۔ معاوہ دے پاؤں چلنے لگا۔ گویا ہر آہٹ اس کی دشمن ہو۔ گلی میں پہنچ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ وہی پرانا قاسم ہے۔ دفعتاً ایک ریشمیں معطر گودا اس کی نگاہ تلے جھلملائی۔ دیکھوں تو بھلا۔ اس کے دل میں کسی نے کہا۔ دل دھڑکنے لگا۔ نگاہ بیٹھک کی تیسری کھڑکی پر ٹکی۔ انگلی سے دبایا تو پٹ کھل گیا۔ اور وہ اندر چلا گیا۔ معا سامنے اس پر نارنج کی روشنی پڑی۔ وہ گھبرا کر مڑنے ہی لگا تھا کہ وہ روشنی ایک حسین چہرے پر جا پڑی۔ ”ہاں وہی“ سیڑھیوں میں جیناں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”تم؟“ وہ غصے سے چلایا۔ ایک ساعت میں اسے سب باتیں یاد آچکی تھیں۔ اس کا جسم نفرت سے کھولنے لگا تھا ”چپ“ جیناں نے منہ پر انگلی رکھ لی۔ قاسم کا جی چاہتا تھا کہ اس حسین چہرے کو نوچ لے۔ اور کپڑے پھاڑ کر باہر نکل آئے۔ لیکن اچانک حنائی ہاتھ آگے

بڑھا۔ ”میں جانتی تھی تم آؤ گے۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔“ قاسم کا سر ایک رنگین معطر گود پر جا لگا۔ جس کی نیم مدھم گرمی حنائی ہاتھ کے ساتھ ساتھ اسے تھکنے لگی۔ قاسم نے دو ایک مرتبہ جوش میں آ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ خوشبودار ریشمیں بدن مدھم گرمی اور حنائی ہاتھ۔۔۔۔۔ اس کا غصہ آنسو بن کر بہہ گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رو رہا تھا اور وہ حنائی ہاتھ اسے تھپک رہے تھے۔

”چپ“۔۔۔۔۔ جیناں منہ پر انگلی رکھے مسکرا رہی تھی۔



پل

آپ پل کو نہیں جانتے؟ بھلا جانیں بھی کیسے جبکہ نہ تو وہاں کوئی شہر آباد ہے اور نہ ہی کوئی گاؤں۔ بس دریا پر ایک عام سا پل بندھا ہے۔ جس پر ریل کی لائن بھی ہے جو سرحدی پہاڑیوں کی طرف نکل گئی ہے۔ وہ ایک عام سا پل ہے۔ ایک ایسے غیر معروف سے دریا پر جو دیکھنے میں نالہ نظر آتا ہے۔ البتہ غور سے دیکھیں تو پانی کا بہاؤ اتھاہ گہرائی کا غماز ہے لیکن غور سے دیکھنے کی فرصت بھی ہو۔ جب تک آپ گاڑی کی کھڑکی سے سر نکالتے ہیں گاڑی پل کے پار جا چکی ہوتی ہے۔

اول تو کوئی پل کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔ دیکھ بھی پائے تو یہ راز کھلتا ہے کہ پل ایک ریلوے اسٹیشن ہے۔ اسٹیشن کے آثار ہی غائب ہیں۔ نہ آہنی جنگلا نہ پلیٹ فارم۔ نہ وہاں سے کوئی مسافر سوار ہوتا ہے اور نہ کوئی اترتا ہے۔ ان باتوں کے باوجود ایک ہم اسٹیشن ہے۔ یہ اہمیت سیاسی نوعیت کی ہے۔ وہ دو حدوں کا سنگم ہے۔ گاڑی رکتی ضرور ہے۔ چاہے رکتے ہی چل دے۔ گاڑی وہاں یوں کھڑی ہوتی ہے کہ آپ محسوس تک نہیں کرتے۔ بغرض محال آپ محسوس بھی کر لیں تو آپ سمجھیں گے گاڑی محض رک گئی ہے، کھڑی نہیں ہوئی۔ نہ جانے کیوں۔۔۔۔ کوئی بات ہو گئی ہے۔ اور پھر آپ زیادہ ضروری امور کے متعلق سوچنے لگتے ہیں۔ میرا مطلب ہے وہ امور جنہیں آپ زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔

مصیبت یہ ہے کہ اسٹیشن ایک بڑے جنکشن کے قریب ہے۔ اس قدر قریب کہ آپ کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ ایک اسٹیشن دوسرے اسٹیشن سے اس قدر قریب ہو سکتا ہے۔ جنکشن کی افراتفری کے بعد جب گاڑی چلتی ہے تو آپ اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور جگہ بنانے یا نہ جانے کب تک کھڑے رہنے کا تہیہ کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ پل آتا ہے، گزر جاتا ہے اور آپ کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ ایک اہم اسٹیشن گزر رہا ہے یا گزر چکا ہے اور آپ غیر علاقہ میں داخل ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں۔

پل سے دو فرلانگ ورے دو مختصر سے کوارٹر گال سے گال جوڑے بیٹھے ہیں جیسے تیز جھکڑ میں مرغیاں بیٹھ جایا کرتی ہیں۔ لیکن جنکشن کی گزشتہ افراتفری کے اثرات کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ آپ کو ان کوارٹروں کو دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ دیکھ بھی لیں تو انہیں کوارٹر نہیں سمجھتے آپ۔ اور سمجھ بھی لیں تو آپ کو شبہ تک نہیں ہوتا کہ وہ آباد ہیں اور پل سے متعلق ہیں۔

ان کوارٹروں میں اسٹیشن کے ماسٹر اور نائب رہتے ہیں۔ موجودہ اسٹیشن ماسٹر اقبال کوہاں رہتے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں۔

لیکن نائب کو صرف مہینہ گزرا ہوگا۔ اسی طرح چار سال پہلے اقبال نائب ہو کر آیا تھا۔ ان دنوں بس ایک وہ خود اور ایک اس کی نئی بیاتھا بیوی برجیس تھی۔ برجیس اس ویرانے میں آ کر کس قدر رگنی تھی۔ کہاں سکول کی رونق اور پھر بیاہ پر سکھیوں کا سنگ اور کہاں یہ ویرانہ۔ لیکن آہستہ آہستہ جی لگ ہی گیا۔ چونکہ پڑوس کا کوارٹر بچوں سے یوں بھرا پڑا تھا جیسے مٹر کی پھلیاں دانوں سے۔ پھر ان کی ماں بڑی ملنسار تھی۔ اس کے علاوہ دونوں کوارٹروں کے درمیان ایک کھڑکی تھی جس کی وجہ سے دونوں کنبے ایک گھر نظر آتے تھے۔ چونکہ کھڑکی زمین سے اونچی تھی اس لئے بچوں کی خاطر دونوں طرف سینٹ کی سیڑھیاں بنی تھیں اور کھڑکی کا نچلا حصہ سینٹ کی محراب سی بن گیا تھا۔ سب ازراہ مذاق اس کھڑکی کو پل کہا کرتے۔ اور یہ بات تھی بھی ٹھیک کیونکہ یہ کھڑکی دونوں گھروں کے درمیان پل کا کام دیتی تھی۔

پڑوسیوں کی تبدیلی پر برجیس نے پریشان تو ہونا ہی تھا لیکن اس کی پریشانی ایسی شدید نہ تھی۔ ایک تواب اس مقام سے مانوس ہو چکی تھی اور دوسرے اب ان کے دونھے منے بچے تھے۔۔۔۔۔ سعیدہ اور انور

چق کی اوٹ میں نئے نائب کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ ریل کا بابو تو وہ دکھتا ہی نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کالج کا کوئی لڑکا ہو۔ بھرا ہوا جسم، سانولا رنگ، کنڈل والے بال اور شرابی آنکھیں۔ جو دور۔۔۔۔۔ نہ جانے کہاں دیکھ رہی تھی۔ خواب آلودہ آنکھیں۔۔۔۔۔ جیسے کسی اور دنیا میں رہتی ہوں۔ نہ جانے برجیس کو کیا ہوا بڑھ کر چق کا کونا سر کا لیا اور شکاف بنا کر دیکھنے لگی۔

اس روز سلائی کا کام کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلی رہی۔ لت کھسک کر ماتھے پر آ پڑی۔ دوپٹہ سر سے سرک گیا۔ کان کا آویزہ یوں لرزاں رہا گویا پل کے نیچے گھرے دریا میں کشتی ڈول رہی ہو۔ مشین کی آواز میں ایک نغمہ رقصاں تھا۔ شاید اسی لئے کہ نائب اور اس کی نئی نوپلی بیوی کو دیکھ کر اسے وہ دن یاد آ گئے جب وہ آپ نئی نئی پل پر آئی تھی۔ وہ بھی کیا دن تھے۔

اقبال گاڑی پاس کر کے جلدی جلدی گھر آتا۔ اسے یوں کھوئی کھوئی دیکھ کر اس کے پاس آ بیٹھتا۔ ”کہاں ہو؟“ وہ پوچھتا۔ ”کہیں بھی نہیں“ وہ مسکراتی۔ ”اونہوں۔۔۔۔۔“ وہ قریب تر سرک آتا۔ ”کہیں دور۔۔۔۔۔ دور۔۔۔۔۔ برج“ وہ اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال کر اسے قریب تر کھینچ لیتا۔ ”تم تو یوں کھوئی رہتی ہو جیسے کوئی اکیلا جزیرہ کھلے سمندر میں۔۔۔۔۔“ ”تو پھر کیا کروں؟“ وہ شرما سی جاتی۔ ”اچھا“ وہ ہنس کر کہتا۔ ”تو مجھے مارنا ہی پڑے گا۔“ ”کیا؟“ وہ بھولی بن کر پوچھتی۔ ”اس اکیلے جزیرے کو کھے کر کنارے لگانا پڑے گا اور کیا“ چھوڑ بھی ناب یہ کام۔“ وہ اس کے ہاتھ سے کپڑا یا سویر چھین کر پرے پھینک دیتا۔ کھویا کے بے تکلف ہاتھ پتوار بن جاتے اور ناؤ ڈولنے لگی۔ ڈولتی ڈولتی نہ جانے کس کنارے کی طرف بہہ نکلتی۔۔۔۔۔ ”زن

-----! "گاڑی پل سے گزر جاتی اور مسافروں کو شبہ تک نہ ہوتا کہ دوسرے میں مل رہی ہیں۔

"تو یہ ہے نیا نائب؟" برج نے اقبال سے کہا۔

"تم نے دیکھا ہے اسے؟" اقبال نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" وہ مشین چلاتے ہوئے بولی۔ "اسٹیشن کی طرف سے آ رہا تھا۔ ریل کا بابو تو دکھتا ہی نہیں۔ کنڈیا لے بال ساناوا رنگ کھوئی کھوئی لگا ہیں۔"-----"ہاں" اقبال مسکرایا۔ "وہی شاعر سا نیا نیا ہے نا؟ آپ ہی بن جائے گا بابو۔ بابو بننے دیر لگتی ہے کیا؟"

"عجیب سی جوڑی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"کیوں۔۔۔۔۔؟"

"اس کی بیوی کی بات کر رہی ہوں۔"

"کیا ہے اسے۔۔۔۔۔ بنتی تو نہیں؟"

"اونہوں! ابھی تو بچی ہے۔ بنے گی کیا؟ بالکل لڑکی ہے وہ تو۔"

"تو اس میں عجیب بات کیا ہوئی؟"

"عجیب تو کچھ نہیں، ویسے بات کر رہی ہوں۔ لڑکی کو دیکھو تو گلابی پنڈے کی چوکی بھری ہے اور میاں۔۔۔۔۔ جیسے دور نہ جانے کون سی نگری میں بھٹک رہا ہو۔۔۔۔۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔۔۔۔۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔"

وہ ہنسنے لگا "تمہاری تو عادت ہے برج، تمہیں کوئی جوڑی۔۔۔۔۔ جوڑی معلوم ہی نہیں دیتی۔ یاد ہے مجھے کہا کرتی تھی تم۔۔۔۔۔ آپ کو تو ہر وقت کنارے لگانے کی ہی فکر رہتی ہے۔ کبھی جزیرے کو اپنی جگہ ڈولنے بھی دیا کیجیے۔ پگلی اسی کو شادی کہتے ہیں۔ شادی پل ہے پل۔ وہ مختلف علاقے جوڑنے والا پل۔ جسے تم۔۔۔۔۔" "میں۔۔۔۔۔؟" وہ شرما گئی۔

"ہاں! تم بھی تو برج۔۔۔۔۔ میرے دل کے زخموں کو جوڑ دیتی ہونا۔"

"لگے بھر مانے۔۔۔۔۔" وہ ہنسی۔

"شادی اور ہے کی کیا۔ ایک دوسرے کا ساتھ دینا۔ ایک دوسرے کو بھر مانا۔ اسی بندھن کا نام۔۔۔۔۔"

"اچھا بندھن ہے۔" وہ ہونٹ نکال کر بولی۔ "کہیں میاں حاضر اور بیوی کو اس کا پتہ نہیں، کہیں بیوی حاضر پر میاں نہ جانے کہاں۔"

”پگلی“ وہ قریب تر ہو بیٹھا۔ ”اگر دونوں غیر حاضر ہوں تو بات کیسے چلے۔“ اس نے بات چلاتے ہوئے کہا۔

”کوئی ایک بھی حاضر نہ ہو تو۔۔۔۔۔ چھوڑ دیجیے۔“ وہ اپنا چہرہ اکر بولی۔

”اونہوں۔ حاضر ہونا ہی پڑے گا۔“ وہ ازسرنو پاس ہو بیٹھا۔

”ہائے میرے اللہ ایسی حاضری سے تو غیر حاضری ہی بھلی۔“

”برج“ وہ اس کے کان سے منہ لگا کر بولا ”تم میری زندگی کے دکھی پانیوں پر ایک پل ہو۔ نہ جانے کہاں رہتی ہو تم۔ پاس ہوتے ہوئے بھی اتنی دور۔۔۔۔۔۔ دور۔“

”دور رہنے والوں کو آپ کیا جانیں۔“ اس نے اپنا آپ حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں قریب لانے کے لئے مجھے اتنی دور سے آنا پڑتا ہے۔“ وہ ہونٹ قریب تر لاتے ہوئے کہنے لگا۔

”کون آتا ہے۔“ وہ دہی زبان میں گویا اپنے آپ سے بولی۔

”میں جو آتا ہوں۔“ اس کے ہونٹ بھیچ گئے۔

”خود آنے کے لئے نہیں، دو بجے کو صرف اپنے پاس بلانے کے لئے۔“ وہ پیچھے سرک کر گنگنائی۔

لیکن اس کی آواز گاڑی کے شور میں دب گئی۔ جونہ جانے کسے لانے کے لئے آ رہی تھی، جا رہی تھی۔ پل ریل گاڑی کے پہیوں تلے جھول رہا تھا۔ نیچے دکھی پانی کا گہرا بہاؤ جھوم رہا تھا۔

اس واقعہ کے بعد ان کے گھر میں نئے پڑوسیوں کی بات چل نکلی۔ جب کبھی وہ اٹھتے بیٹھتے اور کوئی بات شروع ہوتی تو پتہ نہیں کیسے بات ہی بات میں نائب یا اس کی بیوی کا تذکرہ چھڑ جاتا۔ مثلاً اسی روز شام کو برہیس بولی۔ ”آپ نے سنا؟“ اور مسکرا دی۔

“کیا۔۔۔۔۔”

”اس کا نام نظر ہے نظر۔ ویسے کہتے ہیں نظراں“

”کس کا؟“ وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔

”اپنے نائب کی بیوی کا اور کس کا۔ وہی بات ہے آنکھوں کی اندھی نام۔۔۔۔۔“

”کیوں بے چاری کو۔۔۔۔۔“ وہ بات کاٹ کر بولا

”ایمان سے بالکل بے چاری ہے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”سبھی باتیں ہیں، اس میں بس ایک نظر نہیں۔“

”اور جانتی ہو میاں کا کیا نام ہے؟ شاعر ہے نا۔۔۔۔۔۔“

”کیا نام ہے؟“

”عجیب سا نام ہے۔ نہاں رومانی۔“

”نہاں“ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ”بی بی نظر میاں نہاں۔ سبحان اللہ کیا جوڑی ہے۔“

”خدا کی قسم مذاق نہیں۔ آئیے نا ذرا دکھاؤں آپ کو۔“ برج نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا۔

”میں دیکھوں؟ لاحول ولا قوۃ“

”لاحول کی کیا بات ہے۔ ویسی نظروں سے نہ دیکھنا بس۔“

”وہ دیکھئے چو لہے کے سامنے چوکی پر۔“ برج نے کھڑکی کی درز سے لگ کر کہا۔ ”ہے نا مجسم انتظار۔ منتظر بیٹھی ہے۔ تو بہ۔۔۔۔۔۔“

خالص گوشت پوست ہے جیسے قدرت نے عورت کو تنگ کر دیا ہو۔“

”ہاں“ وہ مسکرایا۔ ”اب چھوڑو بھی۔“ اور وہ واپس کمرے میں آ گئے۔ ”ہاں واقعی عجیب جوڑا ہے۔“ اقبال ہنسا۔

”یہ بے چاری جیسے راہ ٹکنے کے سوا کچھ جانتی ہی نہ ہو اور وہ جیسے راہ کھو کر سرگرداں ہو۔“

”ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میاں کسی اور سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔“ اقبال مسکرایا۔

”خواہ مخواہ کسی پر الزام دھرنا۔۔۔۔۔۔ آپ تو۔۔۔۔۔۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”شاید یہی بات ہو۔“

”ہاں شاید۔۔۔۔۔۔ لیکن بی بی تو علانیہ بیٹھی ہے۔“

”ہاں میاں کی منتظر۔۔۔۔۔۔“ وہ مسکرایا۔

”ہوں میاں کی؟“ اس نے بات کاٹ کر کہا۔ ”کسی کی بھی کیوں نہیں؟“

”بھئی پھر کیا کرے؟ میاں کسی اور جگہ لو لگا لیں تو بیوی کو بھی حق حاصل ہے کہ کسی کے انتظار میں بیٹھ جائے۔“

”واہ“ وہ تڑپ کر بولی ”شادی نہ ہوئی مذاق ہوا۔“

”میرا یہ مطلب نہیں کہ ضرور لو لگالے کسی سے، لیکن لگا لینے کا جواز تو مل جاتا ہے اخلاقی طور پر۔“

”سچ۔۔۔۔۔۔؟“ ”ہاں ہاں انصاف تو یہ ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا

”بڑے منصف تو دیکھو۔ اپنے آپ پر مٹے تو۔۔۔۔۔“

”اللہ نہ کرے“ میں کسی سے لولاگوں۔“ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”بڑے بگلا بھگت۔۔۔۔۔ نہ جانے کس کس سے لگائی ہوگی۔“ اس نے ہونٹ نکال کر کہا۔

”نہیں برج‘ صرف تم ہو صرف تم۔“ وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔

”اچھا! مان لیا لیکن کل کی بات کون جانتا ہے۔“

”ہاں کل کی تو کہہ نہیں سکتا لیکن آج تک ایک تم ہو تم۔“ وہ پیار سے بولا۔

”اچھا“ وہ مسکرائی ”آپ کو یقین ہے کیا۔۔۔۔۔؟“

”کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”کہ میاں لگا لے تو بیوی۔۔۔۔۔۔“

”ہاں ہاں“ وہ بولا ”انصاف کی بات تو یہی ہے۔“

”مردوں کے انصاف کو۔“ وہ ہنسی ”کون نہیں جانتا۔ مردوں کے انصاف کو“

”ٹھیک ہے، ٹھیس تو لگتی ہے لیکن۔۔۔۔۔“ وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

”چلو چھوڑیے اس قصے کو۔ کیا واہیات بات ہے۔ ہمیں کیا غرض۔ وہی جانیں لی لی نظراں اور بابونہاں۔“ وہ ہنسنے لگی۔

پہلے چند روز تو اقبال حیران رہا۔ بات ہی ایسی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے برجیس کا برتاؤ قطعی طور پر مختلف تھا۔ اگر اقبال کسی پڑوسن

میں دلچسپی ظاہر کرتا تو وہ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتی۔ ”خیر تو ہے، بہت چمک رہے ہیں آپ؟“ اگر کسی غیر عورت کی بات چٹھڑ جاتی

تو اسے اجازت نہ تھی کہ اس کے متعلق دلچسپی کا اظہار کرے۔ گھر میں کوئی آجاتی تو اسے باہر جا کر ٹھہلنا پڑتا۔ صحن میں جانے کی تو بالکل

اجازت نہ تھی اسے۔ کیونکہ صحن میں کھڑکی کھلتی تھی۔ اور پڑوسیوں کی بے پردگی کا احتمال رہتا تھا لیکن اب وہی برجیس اکثر آپ دعوت

دیتی کہ وہ درز میں سے نظر کو دیکھے۔ دوڑی دوڑی پاس آتی۔ ”آئیے آپ کو کچھ دکھاؤں۔“ اور اس کا بازو پکڑ کر لے جاتی۔ ”آج تو

حد ہو گئی۔ آپ کی قسم“ اگر وہ عذر پیش کرتا تو طنز اچلاتی ”بس اتنی ہمت ہے۔ اپنے آپ پر بھروسہ نہیں کیا۔ ایک آنکھ دیکھ کر چھلک

جاتے ہیں یہ مرد۔ ہم بھی تو پردے میں سے مردوں کو دیکھتی ہیں پر مجال ہے جو پاؤں ڈنگا لیں۔“

”اوہ میں سمجھی۔۔۔۔۔ فکر نہ کریں آپ۔۔۔۔۔“

”فکر کیسا؟“ وہ پوچھتا۔

”بس“ وہ جواب دیتی۔

”آخر کوئی ہوگا ہی نا۔“ حتیٰ کہ وہ ساتھ چلنے پر مجبور ہو جاتا۔ پھر وہ درز سے لگے کھڑے رہتے۔ اس دوران برج زبان کی بجائے کہنی سے باتیں کرتی۔ پھر ایک دن جب وہ برج کے کہنے پر کھڑکی سے جھانکنے کے لئے گیا اور درز میں سے دیکھا تو بوکھلا سا گیا۔ ”حد ہو گئی۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ چونکہ سامنے نظر محن میں نہا رہی تھی۔ شرتی پنڈا۔ جو چٹا سفید ہونے کے علاوہ جوانی سے بھرا ہوا تھا۔ بوٹا سا قد وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا لیکن دیکھا تو برج وہاں تھی ہی نہیں۔ ایک ساعت کے لئے وہ ٹھٹھکا۔ پھر ارد گرد دیکھ کر از سر نوشت باندھ کر کھڑا ہو گیا اور دیر تک دیکھتا رہا۔

پھر وہ آپ ہی آپ موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ جب کبھی موقع ملتا چپکے سے درز سے لگ کر نظر کو دیکھتا رہتا۔ ایسی دلچسپی ہو گئی اسے۔ بلکہ کئی مرتبہ وہ بھاگا بھاگا برج کے پاس جاتا۔ ”آؤ برج تمہیں کچھ دکھاؤں۔“ ایک ساعت کے لئے برج کی آنکھ میں چمک لہراتی۔ ”آؤ بھی“ وہ چلاتا ”دیکھو تو چولہے کے سامنے بیٹھی ہونٹوں پر سرخی لگا رہی ہے۔ ایک وہ ہے کہ بے چاری کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں اور ایک تم ہو۔۔۔۔۔ آؤ بھی نا۔“

”آپ ہی دیکھئے۔“ وہ لا پرواہی سے کہتی۔ وہ چلاتا ”اونہوں۔۔۔۔۔ سرخی لگانے سے کیا بنتا ہے۔“ وہ مٹین چلاتے ہوئے اپنی دھن میں بولے جاتی ”جسم کا جال روح کو کیا پھنسائے گا؟“

”بہت جانتی ہو تم اس کی روح کو۔“ وہ طنزاً کہتا۔

”جانتی تو نہیں پر سمجھتی ضرور ہوں۔“

”بہت روحانی طاقت ہے تم میں۔“

”آپ کیا جانیں؟“ وہ ہنستی۔

”اب اٹھو بھی نا۔“ وہ کھسیا ہو کہتا۔

”میں تو روز دیکھتی ہوں۔ آپ ہی دیکھئے جا کر۔“

”نہیں برج۔“

”اوسان کھونے کی کیا ضرورت ہے؟“ ایک دن لا پرواہی سے طنزاً بولی۔ ”ایسا شوق ہے تو ملا دوں دونوں کو۔“

”تم“ وہ چلایا ”تم اور ایسی بات۔ پہلے تو۔۔۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“
 ”کیوں؟“

”پہلے تو تم ایسی بات پر غصے سے بھوت بن جایا کرتی تھی۔ یاد ہے رحمت کی ماں کے متعلق کتنا پاکھنڈ مچایا تھا تم نے۔“
 وہ مسکرا دی۔ ”اب بھی مذاق کر رہی ہوں۔“

”میں جانتا ہوں لیکن پہلے تو ایسا مذاق سہانہ جاتا تھا تم سے۔“

”ہاں“ وہ ہنسی۔ ”مجھے معلوم نہ تھا کہ جسم کے میل سے کیا ہوتا ہے؟“ اس کی ہنسی میں مایوسی اور طنز کی جھلک تھی۔

”لیکن اس کی عزت کا خیال نہیں کیا۔“ وہ نظراں کے گھر کی طرف ہاتھ چلا کر بولا۔

”آپ ہی تو کہتے تھے۔ میاں کسی اور سے لو لگائیں تو بیوی۔۔۔۔۔۔“ وہ رک گئی۔

”اچھا تو اب تم ہم دونوں میں پل بنو گی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”میں کیوں بنوں پل تو وہ ہے آپ کی نظراں“

”ہوں تو تمہارے حساب سے میں گاڑی ہوا۔ مگر پل اور گاڑی ملائے گی کسے دو علاقے بھی تو ہوں۔“ اس نے مذاق سے کہا۔

”بے چاری“ وہ اپنی دھن میں بولی۔ ”سارا سارا دن انتظار میں بیٹھتی ہے۔ کب گاڑی آئے اور اوپر سے گزرے۔“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پھر قریب ہو بیٹھا۔ ”برج!“ اس نے پیار بھری آواز میں کہا ”برج۔۔۔۔۔۔“ اس کے بے تکلف ہاتھ

کسی پل نما ابھار کونا پنپنے لگے۔

”اوہوں۔۔۔۔۔۔“ وہ چلائی۔ ”نہ جانے آپ تو ہر سے۔۔۔۔۔۔“

اقبال نے دور سے آتی ہوئی گاڑی کی آواز سنی۔ وہ آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ کنپٹیوں میں تھرکنے لگی۔

”برج“ وہ چلایا۔ وہ جھجک کر اٹھ بیٹھی۔۔۔۔۔۔ ”کیا کرتے ہیں۔“ وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ اور سامنے کھڑی گاڑی

کو کھوئی کھوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ”دیکھئے نا“ اس نے اقبال سے کہا۔ ”سب مسافر اپنی اپنی دھن میں لگے ہیں۔ کسی کو احساس

نہیں کہ گاڑی رک گئی ہے۔“

”ہاں“ وہ ہنسا ”لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ان کا مطلب تو پہنچنے سے ہے۔ آخر پہنچ ہی جائیں گے۔“

”کون جانتا ہے؟“ وہ ایک آہ بھر کر بولی۔

”پنگی“ وہ ہنسا ”جو چل پڑے ہیں وہ پہنچ ہی جاتا ہے کبھی نہ کبھی۔“

”سچ؟“ وہ کھوئی کھوئی بولی۔

”ہاں“ وہ پاس آ کھڑا ہوا۔ اس کے بے تکلف ہاتھ پہنچنے کی کوشش میں لگ گئے۔

وہ تڑپ کر پیچھے ہٹی اور اس کی پہنچ سے دور ہو کر بولی ”انہوں‘ ادھر“ اس نے نظر کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ باہر سیٹی کی آواز سن کر وہ چونکی اور کھڑکی میں دیکھ کر مسکرا دی۔

”کون۔۔۔۔۔ نائب ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں سیٹی کی آواز سنی آپ نے دور دیس کارہنے والا بچار ہاتھا۔“

”بے چارہ پر اے دیس گیا ہے نا۔“

”ہاں“ وہ ہنسی اور پھر اقبال کی بات دہرانے لگی۔ ”جو چیل پڑے“ آخر پہنچ ہی جاتا ہے نا۔“

کہاں تو دن رات وہ دونوں نظر اور نہاں باتیں کیا کرتے۔ روز بروز اقبال کا شوق بڑھتا جاتا۔ اور وہ درز میں سے نظر کو دیکھتا رہتا۔ ادھر نظر میں یہ احساس بڑھتا گیا کہ کوئی اسے چوری چوری دیکھتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے اسے احساس تنہائی اور انتظام کم ہوتا گیا۔ روز بروز برچیس کی نگاہیں اور بھری پرے پھٹتیں گئیں۔۔۔۔۔ دور۔۔۔۔۔ دور۔۔۔۔۔

پھر نظر نے ان کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ سارا سارا دن برج کے پاس رہنے لگی۔ اقبال کے ذکر پر نظر کی آنکھ میں چمک لہراتی۔ برج منہ موڑ کر مسکراتی اور پھر نظر کی طرف ایسے معصوم انداز سے دیکھتی جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔ نہاں کی بات ہوتی تو برج انہماک سے کام میں مصروف ہو جاتی۔ یا نہ جانے کیوں عین اس وقت مشین کی سوئی میں دھاگہ نکل جاتا اور اسے جھک کر دھاگہ پرونا پڑتا۔ اگرچہ یوں کرنے سے اس کے کان نظر کے منہ کے قریب ہوتے۔ پھر دوپٹہ سر سے ڈھلک کر نیچے گر جاتا اور نیلا آویزہ ڈولتا۔ جیسے بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی ڈول رہی ہو۔

اکثر جب ایسے سے اقبال آ جاتا تو نظر مسکرا کر منہ موڑ لیتی اور اپنا آپ چھپانے کی کوشش میں لگ جاتی۔ ”لاحول ولا قوۃ“ اقبال کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا یا شاید خود ساختہ۔ بہر حال وہ مسکرا کر باہر نکل جاتا۔ پھر نظر دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی ”توبہ باتوں میں پتہ ہی نہ چلا ان کے آنے کا۔ نہ جانے مجھے یوں بیٹھے دیکھ کر کیا کہتے ہوں دل میں۔“ اور برج مسکراہٹ بھیج کر کہتی ”واہ اس میں کیا برائی ہے۔ انہوں نے دیکھ لیا تو کیا یوں گھبرانے لگیں تم تو گزرا کیسے ہوگا۔“ ایک دن وہ چڑ کر بولی ”تو کیا سامنے آ جایا کروں ان کے۔ پھر

تم کیوں پردہ کرتی ہو ان سے؟“

”کہاں کرتی ہوں میں؟“ وہ مشین میں تاگا پروتے ہوئے بولی اور مسکرائی۔

”لیکن وہ تو کبھی آئے ہی نہیں تمہارے سامنے۔“ نظر آپ ہی آپ بولی۔

”تو یہ میرا قصور ہے کیا؟“ برج ہنسی۔

”وہ آ بھی جائیں تو نہ آنے کے برابر۔“ نظر ہنستے ہوئے بولی۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”ان کی عادت ہی ایسی ہے کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ نہ جانے کیا ہے انہیں؟“ وہ منہ بنا کر گویا اپنے آپ سے گفتگو کرتی تھی۔ اور پھر کسی گہرے خیال میں ڈوب گئی۔

اس روز شام کو برج اداس بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ پاس سعیدہ کھیل رہی تھی۔ اقبال ابھی اسٹیشن پر ہی تھا کہ نظر آئی اور بولی ”ذرا سی شکر ہوگی؟“ برج کام کرتے ہوئے کہنے لگے ”اندر باورچی خانے میں ہے سبز سائین ہے خود ہی جا کر لے لو۔“ اس کے جاتے ہی اقبال آ گیا۔ پٹی ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔ آتے ہی پوچھنے لگا۔ ”میری دھوتی کہاں ہے؟“ عین اس وقت سوئی میں سے دھاگہ نکل گیا۔ برج جھک کر دھاگہ ڈالنے لگی اس کا ہاتھ کانپا لٹ منہ پر گر پڑی۔ کان میں نیلا آویزہ لرز نے لگا۔ بولی ”اندر باورچی خانے میں کھونٹی پر ہوگی۔“

”اچھا“ کہہ کر وہ باہر صحن میں نکل گیا۔

برج نے منہ اٹھایا تو آنکھیں بھیگی سی تھیں۔ منہ پر سرخی کی جھلک تھی۔

”اماں“ سعیدہ چلائی ”روتی ہو تم؟“

”اوں ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”پھر یہ آنچھوں؟“ سعیدہ نے اس کی گال پر انگلی رکھ کر کہا۔

برج نے پیار سے سعیدہ کی انگلی چوم لی۔ ”نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔“

”نظر۔۔۔۔۔۔“

اندر سے آوازیں سنائی دیں۔ برج کے کان میں نیلا آویزہ اور بھی لرز نے لگا۔

”اوں آنچھوں ہیں۔“ سعیدہ تلا کر بولی۔

”کہاں ہیں؟“

”گھوشی کے ہیں؟“ سعیدہ نے پوچھا۔

برج سر ہلا کر مسکرا دی۔

”آہا۔۔۔۔۔ گاڑی“ سعیدہ گاڑی کو آتا دیکھ کر چلائی۔

برج نے اسے اٹھا لیا اور دروازہ میں جا کھڑی ہوئی۔ اس وقت اسے قطعی طور پر احساس نہ تھا کہ دروازہ کی چک لیٹی ہوئی ہے۔

اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔۔۔۔۔ اور نجانے کہاں دیکھ رہی تھی۔ دور۔۔۔۔۔

”امی۔۔۔۔۔ بابو“ سعیدہ نائب کو آتے دیکھ کر چلائی۔ لیکن برج نے اس کی بات نہ سنی۔

گاڑی میں مسافر منزل کے خیال میں کھوئے ہوئے تھے۔ کسی کو احساس نہ تھا کہ پل ایک اسٹیشن ہے۔ ایک اہم اسٹیشن جو دو

سرحدوں کو ملاتا ہے بلکہ وہ اسٹیشن کے وجود ہی سے منکر تھے۔ اور انہیں پتہ نہ تھا کہ ایک اہم ریل گزر رہی ہے۔ گزر چکی ہے یا وہ غیر

علاقہ میں داخل ہونے والے ہیں۔

البتہ نائب کھڑا حیرانی سے برجیس کو دیکھ رہا تھا۔

”ہائے میرے اللہ“ وہ دفعتاً نائب کو دیکھ کر چلائی اور پیچھے ہٹی۔

”ہائے میرے اللہ“ باورچی خانے سے مدھم آواز سنائی دی۔

”ہائے میرے اللہ۔۔۔۔۔ ہائے میرے اللہ“ گاڑی شور مچاتی ہوئی غیر علاقہ میں داخل ہو گئی۔



”جی ہاں، جی ہاں، وہاں کی آب و ہوا دل کے لئے اچھی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پھر ان کے منہ پر جھریاں کیوں پڑ جاتی ہیں؟“

”مسٹر نہال چند۔۔۔۔۔ جنٹلمین بات یہ ہے کہ یہ ایک انپارنٹ جنکشن ہے۔“ اسٹیشن ماسٹر چلایا۔

”جی ہاں، جی ہاں۔ ارجنٹ ٹریٹل“، تنہا لچند مسکرا کر بولا

”ٹرمینل۔۔۔۔۔؟ ہاں ہاں ٹرمینل بھی“

”ویٹ از دی ٹریبل۔“ گارڈ بولا ”بوتھ ٹریمنل اینڈ جٹکشن“

”رائیٹ۔ ٹرمینل بھی ہے اور جنکشن بھی۔“

”جی ہاں“ یہی میں کہہ رہا ہوں۔ یہ کہے ہو سکتا ہے؟“

”اپنی ہاؤ“ گارڈ بڑبڑایا۔۔۔۔۔ ”یہ ہے ضرور“

”ہاؤا پور“ کرائتی پور سے بھی۔“ سٹیشن ماسٹر نے بات جاری رکھنے کی کوشش کی۔

”جی ہاں۔ اور یریم نگر سے بھی، سبھی“

”بالکل“ سٹیشن ماسٹر بڑبڑایا۔ ”خیر خیر“ کراختی سے گاڑی ای نمبر یر آتی ہے۔ اور پھر وہ سائڈنگ میں لگا دی جاتی ہے۔ پھر وہ نمبر

3 سے یریم نگر کو چلتی ہے۔“

”جی ہاں“ جی ہاں۔ نمبر 3 سے یریم نگر کو چلتی ہے۔ ”نہا لچھ بڑ بڑایا۔“

”اونو نمبر چار سے چلتا ہے۔ شش تحری ای۔“ گارڈ چلایا

”جی ہاں یہی کہہ رہا تھا میں ششل تھری ایپ۔“ نہالچند نے معذرت بھری نگاہ سے دیکھا۔

”لا حول ولا قوۃ“، ٹکٹ کلکٹر نے منہ بن کر کہا۔

”صرف گڑ بڑیشن اور کیا۔ ٹیشن ماسٹر صاحب ایک بات ہے کہ کبھی وہ آتی ہے دویر اور کبھی جاریر۔“ کیمن مین نے وضاحت کی۔

”نوںو“ گارڈاٹھ بیٹھا۔ ”کوچن یہ ہے کہ لوگ بھول کڑیریم نگر ہی کیسٹرڈ اور ہوتے ہیں۔ عقیل بوڑ نہیں۔“

”خدا آپ کا بھلا کرے۔ یہی تو ثبوت ہے کہ ناظم صاحب کا کوئی قصور نہیں، لوگوں کا ہے۔۔۔۔۔۔“ ٹکٹ کلکٹر مسکرا دیا۔

”ویٹ از اسٹ“ پریم نگر کا پہاڑی علاقہ گرین ہے۔ کھوبصورت ہے اور عقلیل پوڑ ریت ہی ریت۔“

”لیکن حضرت سوال یہ ہے کہ جو گاڑی کرائتی سے آتی ہے وہ سیدھی عقیل پور کیوں نہ چلی جائے۔ رن تھرو۔۔۔۔۔ اس طرح غلطی

ہوتی۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ اس سے کیا ہوگا؟“ نہالچند نے عینک سنوار کر کہا۔

”ہمارے پاس ایسے بیسیوں ثبوت ہیں۔“ ٹکٹ کلکٹر بامعنی انداز سے مسکرانے لگا۔

”اس بات پر ایل ٹی سی کو اپنا اناام ملنا چاہیے اور کیا۔۔۔۔۔؟“ کبین مین بولا۔

”جی ہاں“ نہالچند بولا ”لیکن انعام۔۔۔۔۔؟“

”لاحول ولا قوۃ“ ٹکٹ کلکٹر نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔

”اس لئے کہ وہ ریلوے کی اکہم زیادہ کرتی ہے۔“ کبین مین چلایا۔

”انکم کا کیا سوال ہے یہاں؟“

”آئی سی“ گارڈ بولا ”ہی از راسیٹ۔ فرض کڑ و ایک پسنجر غلطی سے پریم نگر جاتا ہے وہاں ہم سے چارج کڑے گا۔ تین روپیہ پھر وہ

واپس دوڑا ہا کو آئے گا۔ ڈیڑھ روپیہ۔ اب اسے پھر نیا ٹکٹ خود پنا پڑے گا۔“ دوڑا ہا کو عقیل پوڑ پڑا ٹکٹ نہیں چلے گا۔ زیٹ از کل۔

چھ روپیہ اکس فیڈ دے گا۔ پیوڑ انکم۔“

”انکم نہیں یہ دھوکہ ہے۔ مسافروں کے ساتھ دھوکہ۔“ ٹکٹ کلکٹر چلایا۔

”جی ہاں روپیہ روپیہ ہے مہاراج دھن ہے مہاراج دھن۔“ نہالچند متاثر ہو کر بڑبڑانے لگا۔

”لیکن پبلک کولوننا۔۔۔۔۔“

”پر سوال اسے ہے کہ ہم پبلک بینڈ ہیں یا ریلوے۔“

”دیٹ از اٹ، دیٹ از اٹ“ گارڈ چلایا۔ ”ریلوے نے صاف بول دیا ہے۔ ٹریول لائیٹ“

”نان سنس“ سٹیشن ماسٹر غصے سے چلایا ”یہاں ہلکا بھاری کا سوال نہیں انکم اور خرچ کا سوال ہے۔ ہمارا ریوٹیشن خراب ہو رہا ہے۔

چاہے پسنجر غلطی سے پریم نگر کیڑاؤر ہو جائیں یا عقیل پور۔ ہمارا کنسرن نہیں۔ لیکن ہمارا ریوٹیشن خراب نہ ہو۔ اتنے بڑے جنکشن کا

ریوٹیشن خراب نہیں ہونا چاہیے۔ آج کل سب سے بڑی کوالیفیکیشن گڈ ریوٹیشن ہے۔

”یہی کہہ رہا تھا حضرت لیڈی ٹکٹ چیکر کی ریوٹیشن اچھی نہیں۔“ ٹکٹ کلکٹر نے جھرجھری لی۔

”اوڈیم اٹ۔۔۔۔۔ جنٹلمین ہمیں روز شکایتیں موصول ہوتی ہیں۔ اس کو بند ہونا چاہیے جو پسنجر اپنی غلطی سے پریم نگر کیڑاؤر ہو

جاتا ہے وہ واپس آ کر ہمارا قصور بتاتا ہے۔ ہمیں ڈانٹتا ہے۔ دس از بیڈ۔“

”جی ہاں ویری ویری“

”یہ تو قدرتی بات ہے حضرت۔ لوگ اپنی غلطی کا الزام دوسروں پر تھوپنا چاہتے ہیں۔ اس میں ناظم صاحب کا کیا قصور ہے؟“

”لیکن سپرنٹنڈنٹ خود موقع پر کیوں نہیں آتا؟ ہم نے بار بار لکھا ہے۔ کوئی جواب نہیں دیتا، یہ کس گاڑی کی گھنٹی ہے؟“

”جی ہاں یہی سوچ رہا ہوں میں۔“ نہالچند بڑبڑایا۔

”ویل“ گارڈ اٹھ بیٹھا ”یہ ٹیلیفون کال ہے۔“

”اوڈیشا۔ پھر کوئی کمپلیٹ۔۔۔۔۔ ہمارے کان پک گئے ہیں۔“ سٹیشن ماسٹر نے ٹیلیفون اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو۔۔۔۔۔“

اسٹیشن ماسٹر دورا ہا۔۔۔۔۔ کون نہیں پہنچے؟ عقل پور۔۔۔۔۔ آپ کے مسنڈ۔ ہاں شاید غلطی سے کیرڈ اور ہو گئے ہوں۔ نہیں پریم نگر

سے ان کا کوئی تار نہیں آیا۔ کیا نام بتایا آپ نے؟ مسٹر رے؟ نہیں کوئی تار نہیں۔“ انہوں نے فون رکھ دیا۔

”جی ہاں“ نہالچند نے ایک کاغذ پڑھتے ہوئے کہا۔ ”بالکل ٹھیک ہے۔ مسٹر رے کا تار یہ رہا۔ پریم نگر سے آیا تھا۔“

”اوہ“ اسٹیشن ماسٹر گنگنا نے لگے۔ ”اچھا تو تم ان مسافروں کی لسٹ رکھتے ہو جو غلطی سے پریم نگر کیرڈ اور ہو جاتے ہیں۔“

”لسٹ۔۔۔۔۔؟“ نہالچند نے سر کھجلا یا۔ ”لسٹ۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔“

”امپاسیبل“ گارڈ نے کش لگا کر کہا۔ ”اتنی لمبی لسٹ“

”جی ہاں۔ یہی کہہ رہا تھا میں اس کے لئے ایک الگ دفتر چاہیے۔“

”ویٹ ازاٹ۔۔۔۔۔“

”سب گز بڑیشن ہے۔“ کیمین مین چلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”لاحول ولا قوۃ“ ٹکٹ کلکٹر بڑبڑایا اور اٹھ کر چل پڑا۔

”وڈیشا آل“ سٹیشن ماسٹر بولا۔

یعنی اس وقت پروفیسر نجی داخل ہوئے ”اے صاحب یعنی یعنی مسجر اسٹڈ کہاں ملیں گے؟“

”مسجر اسٹڈ؟“ نہالچند نے سر کھجلا تے ہوئے غور سے پروفیسر کی طرف دیکھا۔

”سلی“ پروفیسر چلائے اور باہر جاتے جاتے رک گئے۔ ”آپ سٹیشن ماسٹر ہیں؟ میرا مطلب ہے پریم نگر سے گاڑی کب آئے گی۔“

”غلطی!“ پروفیسر چلایا ”غلطی بہانہ ہے بہانہ۔ ایسی ویسی خواہشات پر ڈھکنا اور جو گاڑی پر اتنا بڑا بورڈ لٹکا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس کا فائدہ؟ ہوں۔۔۔۔۔“

”جی ہاں۔ بورڈ باقاعدہ لگا دیا جاتا ہے جی ہاں“ نہالچند چلانے لگا۔
 ”ہم ان باریکیوں کو نہیں سمجھتے۔“ اسٹیشن ماسٹر بولا اور پھر ”اچھا جنٹلمین خدا حافظ“ کہہ کر باہر نکل گیا۔
 ”باریکیاں“ پروفیسر نے امجد کو گھور کر کہا۔ ”میں کہتا ہوں اس سے موٹی بات اور کیا ہوگی۔ جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور عقیل پور کی بجائے پریم نگر پہنچ کر وہاں سے تار دے دیا۔ غلطی سے یہاں آ گئی ہوں۔ اونہ۔۔۔۔۔ میں کیا سمجھتا نہیں۔“
 ”تار۔۔۔۔۔“ نہالچند بڑبڑایا۔ اور اسٹیشن ماسٹر کے پیچھے پیچھے باہر نکل گیا۔
 ”میں نے تو تار نہیں دیا تھا۔“ امجد بولا ”پچھلی اتوار کو تمہارے پاس آ رہا تھا میں لیکن۔۔۔۔۔“
 ”جی ہاں پروفیسر نے طنزاً کہا ”غلطی سے پریم نگر چلے گئے۔“
 ”پھر میں مسٹر امین کے یہاں ٹھہر گیا۔“ امجد اپنے ہی دھیان میں کہے گیا۔
 ”مسٹر امین۔۔۔۔۔“ پروفیسر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
 ”تم جانتے ہو اسے۔ وہی گورا چٹانو جوان۔“

”ہاں گورا چٹا۔ جانتا ہوں نہ جانے تم لوگ صاف کیوں نہیں کہتے کہ وہاں آشنائی ہے۔ مسٹر امین۔“
 ”نہیں نہیں مس امین کے بارے میں ایسا نہ کہو میرے دل میں اس کی بے حد عزت ہے۔“ امجد نے متاثر ہو کر کہا۔
 ”مس امین؟ مس امین کس نے کہا ہے۔۔۔۔۔ ہائیں“ دفعتاً اسے بات سمجھ میں آ گئی ”اوہ یہ بات ہے۔“ پروفیسر مسکرائے لگا۔
 ”عزت“ پروفیسر غصے میں بولا۔ ”پہلے جذبات کی ہنڈیا پر عزت کا ڈھکنا رکھ دیا تا کہ اندر کچھڑی پکتی رہے اور اوپر عزت ہی عزت نظر آئے۔ اونہوں۔۔۔۔۔ عزت۔ نان سنس۔۔۔۔۔ وہ بھی یونہی کہا کرتی تھی۔۔۔۔۔“ پروفیسر نقل اتارتے ہوئے بولا
 ”میرے دل میں مسٹر امین کی بڑی عزت ہے اور اب جا کر وہاں سے تار دے دیا۔۔۔۔۔ غلطی۔۔۔۔۔ نان سنس“

”کس نے تار دے دیا کس کی بات کر رہے ہو؟“ امجد جھلا اٹھا۔
 ”فیروزہ۔۔۔۔۔ اپنی بیوی کی اور کس کی“ پروفیسر گھورنے لگا۔
 ”امجد نے اطمینان کا سانس لیا“ میں سمجھانہ جانے کیا ہو گیا ہے۔“

”ایک دم احمق۔۔۔۔۔“ پروفیسر چلایا ”اگر ایک جنٹلمین کی بیوی جو میٹرکولیٹ ہو اور جس کی آنکھوں پر اتنے بڑے بڑے شیشوں کی رولڈ گولڈ عینک ہو وہ گاڑی پر لکھے ہوئے دور ہاٹو پریم نگر کو عقل پور پڑھ کر اس نگر میں جا پہنچے جہاں تمہارا گورا چٹا دوست رہتا ہے جس کے لئے بیگم کے دل میں بے حد عزت ہے۔ تو تمہارے خیال میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایڈیٹ۔ تم سمجھتے ہو یہ دنیا سیدھی سادی چیز ہے۔ سرخ جھنڈی دکھا دی تو گاڑی ٹھہر گئی۔ سبز۔۔۔۔۔ چل پڑی۔ یہ گاڑی نہیں بیوی کا معاملہ ہے۔ بیوی کا۔۔۔۔۔ یہ گاڑی کیا جانتی ہے جھنڈیوں کو۔۔۔۔۔ کیا سمجھے؟ ہیں۔۔۔۔۔“

”لاحول ولا قوۃ..... یعنی اب تم مجھے گھور کر دل ٹھنڈا کر رہے ہو۔ لیکن اس سے کیا ہوگا۔ بیگم کا وہاں جانا امر واقعہ ہو چکا۔ بلکہ اس کا واپس آ جانا تو بذات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہاں گئی تھی۔“

”یعنی اسے آنے سے روک دوں۔ نان سنس۔ مسجر امیڈ تم قطعی طور پر شادی نہ کرنا، تم عورت کو نہیں سمجھتے“

”میں کیا اسے سمجھنے کے لئے بیاہوں گا۔ میں تو اس سے جراثیم دھلواؤں گا، کھانا پکواؤں گا اور۔۔۔۔۔“

”اور اگر وہ اس نگر میں چلی گئی۔ جہاں تمہارا گورا چٹا دوست رہتا ہے؟“

”تو سمجھوں گا کہ وہ لوٹ کر آنے کو گئی ہے۔ اوہ پروفیسر تم پریشان ہو کر اس نگر کو اور بھی اہمیت دے رہے ہو۔“

”بالکل ریل کا اثر۔ حرکت، موومنٹ، بوئیمین بنادیتی ہے۔ مثلاً ٹانگہ والا۔ کوئی ٹانگہ والا دیکھ لو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پکنک پر آیا ہو۔ ریل میں تو مسافر کی ذہنیت بھی بدل جاتی ہے۔ غریب آدمی بھی آنے کی گنڈیریاں چوستا ہے اور چار بیویوں والے لیڈرز کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہیں۔ سلی۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور ایک میٹرکولیٹ پریم نگر۔۔۔۔۔“

”تم تو وہی ہو پروفیسر۔ یہی بات ہے تو بیگم کو پردہ میں ڈال دو۔“

”پردہ میں؟ اوہ ہونز جوانی میں تو وہ ننگے منہ پھرتی رہی اور اب برقعہ میں چھپا کر از سر نو خوبصورت بنادوں۔۔۔۔۔؟ تم برقعہ کو پردہ سمجھتے ہو کیا؟“

”پردہ ہی تو ہے اور کیا؟“ امجد چڑ گیا۔

”بس ریل ہی ہانکتی آتی ہے۔ یہ رنگ دار برقعے پردہ ہیں کیا نان سنس۔ جیسے رنگ دار بوتلیں چل پھر رہی ہوں۔ ہر کوئی دور سے بتا سکتا ہے یہاں ابھار ہے یہاں ڈھلان ہے۔ ہونہ۔۔۔۔۔ پردہ۔ مسجر امیڈ بس شادی نہ کرنا بڑے سکھی رہو گے۔“

”لیکن فحشی تمہیں کیوں نہ سوجھی یہ بات آج سے پانچ سال پہلے۔“

”اپنی کمزوریاں ہر کسی کو پیاری ہوتی ہیں نا“

”فیروزہ میری کمزوری ہے۔“

”پانچ سال پہلے تو وہ تمہارا پریم نگر تھی۔ اور اب جب سے وہ پریم نگر گئی ہے، اور بھی پیاری ہو گئی۔ اس کمرے میں یوں سرگراں پھر رہے ہو جیسے بہ صحرا ہو۔“

”کیا کہا؟“ پروفیسر رک گیا اور دھم سے آرام کرسی میں بیٹھ گیا۔

”نان سینس، یعنی تمہارے نزدیک ٹھلنا محبت کی دلیل ہے۔۔۔۔۔ ڈیش اٹ۔۔۔۔۔“ وہ جھنجھلایا۔ ”کیا بے معن کرسی ہے“

”آرام کرسی جو ہوئی۔“ امجد مسکرایا۔

”ہاں نہیں؟“ پروفیسر جھٹکا کر بولا۔

”میرا مطلب ہے یہ کرسی صرف اس کے لئے با معنی ہے جو آرام کرنا چاہتا ہو۔“

ٹررن۔۔۔۔۔ ٹررن۔ گھنٹی بجی۔ پروفیسر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ”یہ کیسی گھنٹی ہے؟“

”گھبرائیے نہیں“ سٹیشن ماسٹر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ اور پھر گھڑی دیکھ کر کہنے لگا ”دومنٹ میں آپ یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”اودہ“ پروفیسر چونکا۔ ”تو میں ریسیدو کراؤں۔ امجد تم چائے منگوا لو۔ اتنی دور سے آرہی ہے۔ اتنی دور سے۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ ہیں؟“ تنہا لچھدرک گیا۔ ”یعنی اپنے آپ کو ریسو کرنے جا رہے ہیں۔“

”نان سینس“ وہ گھورنے لگا ”بیگم کو۔۔۔۔۔ بیگم کو۔“

”اوہ“ نہا لچند نے آہ بھری۔

”سوری کیٹ از آؤٹ آف دی بیگ“ گارڈ دروازے سے چلایا۔ ”صاحب وفاؤ اربہوی سے عمر بھر کڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ امجد نے پوچھا۔

”وہ خود بھی بیٹھ رہتا ہے۔ کھانڈ کو بھی بٹھا رکھتا ہے۔ کبھی اس کا وینٹنگ روم میں انتظار کڑنا ملازگی ڈیٹا ہے ملازگی۔“ وہ ہنسا۔

”آپ کا مطلب ہے پروفیسر یہاں بیٹھے تازگی پیدا کر رہے تھے۔ ان کی تازگی نے تو گھنٹہ بھر سے مجھے باسی بنا رکھا ہے۔“ امجد نے شانے بلائے۔

”تمازگی اور جوش ایک ہی بات ہے۔ پانی کھڑا رہے تو گندا ہو جاتا ہے۔“ بوائے کو چائے اور پیسٹری لاتے دیکھ کر سٹیشن ماسٹر بولا۔

”اور یہ دعوت۔۔۔۔۔؟ یہ کیا پریم نگر سے آنے کی رشوت ہے۔“

”پروفیسر صاحب نے آرڈر دیا ہے جناب۔“ کینٹین کا لڑکا بولا۔

”پرہیس وہاں جانے کا ایوارڈ“ گارڈ ہنسا۔

”جی ہاں۔“ نہالچند چلایا ”نہ جاتی تو آتی کیسے؟“

”اف“ پروفیسر نے کیا پاکھنڈ مچا رکھا ہے۔ ایک معمولی شہر کو خواہ مخواہ اہم بنا رکھا ہے۔ میز پر رکھ دو بوائے۔“

”گھبرا گئے مسٹر امجد۔ اچھا تو آؤ چلیں۔ وہ ابھی یہاں آئیں گے بے چارے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت دیر کے بعد لڑائی جھگڑے کی دلچسپی نصیب ہوئی ہے۔“

”ویٹ از اٹ۔“ گارڈ ہنسا۔ ”میں پر پوز کڑتا ہوں کہ ایوری ناؤ اینڈ ون ہروائف کو نگر کا ایک ٹرپ ضرور لگانا چاہیے۔ آئی مین بانی مسٹیک کیرڈ اور ہو جانا چاہیے۔ لٹ اس موو آن۔“

ان کے جانے کے بعد جلد ہی پروفیسر اور فیروزہ داخل ہوئے۔

”اوہ“ پروفیسر چلایا ”سب چلے گئے۔۔۔۔۔ مگر یہ چائے۔“

”میرا تو پیاس کے مارے دم نکل رہا ہے۔“ فیروزہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ کسی ہوٹل میں ٹھہری تھی کیا؟“ پروفیسر نے پیالہ بناتے ہوئے پوچھا۔

”آپ جانتے ہیں مجھے ہوٹل بازی سے نفرت ہے۔ مسٹر امین کی بیوی۔۔۔۔۔“

”اوہ تو مسٹر امین بازی کرتی آتی ہیں آپ؟“

”میں تو پہلے ہی کوفت سے چور ہوں لیکن آپ۔۔۔۔۔“

”کوفت؟ تم تو بنگلہ میں آرام کرتی رہیں۔ مصیبت تو میرے لئے تھی جو دورا ہے کاپلیٹ فارم ناپتا رہا۔“

”بس جی یہ آپ کی کتابی نفسیات نہیں چلے گی۔“

”بس کتاب کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اور نام کو آپ ہیں۔۔۔۔۔ فیروزہ میٹرکولیٹ۔“

”مجھے میٹرکولیٹ نہ کہا کریں آپ۔“ وہ غصے میں چلائی۔

”تو اور کیا گریجویٹ کہوں؟“

”میں آپ کا لیکچر روم نہیں ہوں۔ خواہ مخواہ گھوڑے کے آگے گاڑی جوتا۔۔۔۔۔“

”آج کل کی گاڑیاں تو آپ چلنے کے لئے بے تاب ہیں۔ دیکھ لیجئے گاڑی تو پریم نگر جا پہنچی اور بے چارہ گھوڑا دورا ہا ہا پتا رہا۔“

”تو یہ قصور کس کا ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”گھوڑے کا اور کس کا۔ دوسرا یہالہ بناؤں؟“

”بس جی آپ کی قلعی کھل چکی ہے اب۔۔۔۔۔“ اس نے ترچھی نظر سے گھور کر لاڈ سے کہا۔
 ”کیا۔۔۔۔۔ میری قلعی؟“

”جی ہاں، بہت بنا کرتے تھے۔ میں۔۔۔۔۔ میں مس امین کو نہیں جانتا۔“ وہ نقل اتارتے ہوئے بولی۔

”نہیں نہیں“ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔“ پروفیسر پریشانی سے بولا۔

”جی ہاں اندھیرے میں ملی ہوگی تا۔“ وہ اور بھی سنجیدہ ہو گئی۔

”لاحول ولا قوۃ..... آ خرابات کیا ہے؟“

”بات کیا ہوئی تھی۔ بس وہی ایک بات، بات، بات پر پوچھتی تھی۔ مسٹر نجمی کو کیوں نہ لائیں آپ۔ مسٹر نجمی کو ضرور لائیے گا آپ۔ میں

ان کے افسانوں کو بہت اڈماڑ کرتی ہوں۔ ہونہہ۔۔۔۔۔ بڑی ایڈماڑ۔۔۔“

”لاحول ولا قوۃ“ یروفیسر نے مسکراہٹ بھینچ کر کہا۔

”اونہوں۔ یہ شیطان لاحول پڑھنے سے نہ جائے گا۔“ وہ بولی

”لیکن فیروزہ۔۔۔۔۔“

”اور پھر۔۔۔۔۔ آپ بڑی خوش قسمت ہیں مسز نجمی۔ آپ ایسے قابل راسٹر کی بیوی ہیں۔۔۔۔۔ سرکھالیا میرا چڑیل نے۔“

”اوہ“ پروفیسر مسکرائے۔ ”عجیب معاملہ ہے“

کمرے میں چار آدمی آ گئے۔ اور وہ دونوں چپ ہو گئے۔

”کیا مصیبت ہے۔“ گہڑی والے پٹھان نے دستانے اتارتے ہوئے کہا۔ ”پریم نگر، خاک نگر، وہاں تو دھول اڑتی ہے دھول۔“

”آپ پریم نگر سے آئے ہیں؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”جانا تو نہیں تھا لیکن چاہیے۔ پھر وہی ناخیں ناخیں فٹ۔ سنا تھا بڑا اچھا شہر ہے لیکن خاک۔ بس عورتیں ہی عورتیں ہیں۔“

”جی ہاں وہ آئے ہیں، 32 ڈاؤن میں۔۔۔۔۔ سپر ٹنڈنٹ“

“گڈ لارڈ”

”میں ان سے ملوں گا۔“ پروفیسر اٹھ بیٹھا۔ ”میں انہیں یقین دلاؤں گا کہ انتظام میں خرابی ہے اور پسینگر کو خواہ مخواہ کوفت ہوتی ہے۔“

”اونہوں۔۔۔ وہ نہ مل سکیں گے۔ اونہوں۔۔۔ بہت گڑ بڑیشن ہے۔“ کیمن مین نے داخل ہو کر کہا۔ ”سیلون کا دروازہ بند ہے۔“

”نان سینس“، سٹیشن ماسٹر چلا یا۔

”جی ہاں، جی ہاں“ تنہا لچند بڑ بڑایا۔ ”وہی نان سینس“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ ٹکٹ کلکٹر بھاگا بھاگا آیا۔ ”ضرور کوئی غلط فہمی ہے۔“

”ڈیش اٹ۔۔۔۔۔ بات کیا ہے؟“ سٹیشن ماسٹر غصے میں بولا۔

”حضرت آرزو یہ ہے کہ ان کی سیلون عقیل پور کو جانے والی گاڑی سے لگا دی جائے۔“

”جی ہاں“ نہالچند بولا ”عقیل پور کا دورہ کر کے وہ یہاں آئیں گے۔“

”آپ نے سنا۔“ امجد نے داخل ہو کر کہا۔ ”لیڈی ٹلٹ چیکر کو پریم نگر کا سٹیشن ماسٹر بنادیا گیا ہے۔“

”نان سینس“، سٹیشن ماسٹر چلایا۔

”ابھی پرنٹنگ کا حکم ملا ہے، ابھی۔ ایل ٹی سی ابھی بوگی میں ہے۔“ ٹکٹ کلکٹر چلایا۔

”کون سی بوگی میں؟“ اسٹیشن ماسٹر نے پوچھا۔

”جی ہاں“ تھا لچند بولا ”سپرٹنڈنٹ کی بوگی میں۔“

”ہیونز“ پروفیسر چلایا ”بیگم تم چلو“ میں ابھی آیا۔ مسٹر امجد فیروزہ کو لے چلے۔“

”شوق سے۔“ امجد فیروزہ کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے بولا ”جلدی آنا پروفیسر گاڑی چلنے والی ہے۔“

”ویٹ از آل ویری اسٹریج“ گارڈ ہنسا۔

”ویل ویل“ اسٹیشن ماسٹر بولا ”مسٹر کیبن مین ان کی بوگی عقیل پور سے لگانے کا انتظام کرو۔ اچھا تو گڈ بائی پروفیسر۔“ وہ پروفیسر سے

مخاطب ہوا۔

”رائیٹ“ پروفیسر نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا ”سولانگ جنٹلمین۔۔۔۔۔ سولانگ۔“ اور وہ انجن دوا انجن بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

”پروفیسر کہاں ہے اسٹیشن ماسٹر صاحب؟“ امجد روڑتا ہوا آیا۔ ”وہاں گاڑی چلنے والی ہے اور ان کا پتہ نہیں۔“

”پروفیسر تو چلا گیا۔“ سٹیشن ماسٹر نے جواب دیا۔ ”جی ہاں میں نے خود دیکھا ہے۔۔۔۔۔ خود“

”کہاں؟“ امجد چلایا ”لو عقل پور کی گاڑی تو چل بھی پڑی۔“ امجد نے کوک سن کر کہا۔

”پریم نگر کی گاڑی میں۔۔۔۔۔ جی ہاں۔ دوانجن، دوانجن کہتے ہوئے وہ اندر جا بیٹھے تھے۔“

”لا حول ولا قوۃ..... کیا مصیبت ہے۔ اب بیگم عقیل پور جا پہنچے گی اور میاں پریم نگر۔“ امجد ہنسنے لگا۔

”ڈیش اٹ آل“ سٹیشن ماسٹر بڑ بڑایا۔

”بالکل گڑبڑیشن ہے ٹیشن ماسٹر صاحب۔۔۔۔۔“ کہیں مین بھاگتا ہوا آیا۔ ”وہ بوگی۔۔۔۔۔“

”خدا خبر کسی نے غلط کاٹنا موڑ دیا اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“

”وہ بوگی پریم نگر والی تھری اپ سے لگ گئی۔“

”گڈ لارڈ۔“ اسٹیشن ماسٹر چلایا ”اب کیا ہوگا؟“

”اب۔۔۔ جی“ نہالچند بڑبڑانے لگا۔ ”یعنی میں کہہ رہا ہوں۔ اگر وہ مرد ہے تو واپس یہاں آ جائے گا اور اگر عورت ہے تو۔۔۔۔۔“

”وہ کون؟“ امجد نے پوچھا۔

”سپرٹنڈنٹ۔۔۔۔۔جی ہاں سپرٹنڈنٹ“ تنہالچند بولا۔

”شٹ اپ“ اسٹیشن ماسٹر چیف کر بولا ”نان سینس“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ یہی کہہ رہا تھا میں۔۔۔۔۔ نان سینس ہے پھر تو شٹ اپ۔ مطلب ہے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔۔۔۔۔“



میاں کی مرضی

”توبہ۔۔۔۔۔ اس گھر میں کوئی کسی کی سنے بھی۔ یہاں تو بس انہی کی چلتی ہے۔ چاہے کوئی چیخ چیخ کر مر جائے۔ انہیں اپنی مرضی سے کام۔“ سعیدہ باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوئے چلائی۔ اور پھر حشمت کی مستفسرانہ نگاہ کو دیکھ کر بولی۔ ”کہتے ہیں فرنی ضرور ہوگی کل کھانے پر۔ اور ٹکڑے۔۔۔۔۔ ٹکڑے تو آخر ٹکڑے ہی ہیں۔ چاہے ڈبل روٹی کے ہی ہوں۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ نہ سنیں گے کسی کی۔ بس لے لیا مزہ پوچھنے کا۔۔۔۔۔؟ میں تو اس گھر کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ مجھ سے کیا چھپا ہے۔۔۔۔۔ ابھی تو کل ہی ان کی منہ چڑھی کا رونا ختم ہوا اور آج دعوت کا جھگڑا لاکھڑا کیا۔ اب کوئی کیا کرے۔ اور وہ چڑیل۔۔۔۔۔ توبہ! گھر میں کہرام مچا رکھا تھا اس نے۔ گنی ہے تو آرام کا سانس لیا ہے۔ دن بھر کبھی نیچے کبھی اوپر۔ گھر کی دیواریں بھی کانپ اٹھی تھیں۔۔۔۔۔ اب ایک مہینہ تو آرام سے کئے گا۔“

سعیدہ نے اپنا دوپٹہ اتار کر دروازے پر لٹکا دیا اور ہنڈیا کی چھینی اتار کر بولی۔ ”حشمت ذرا سا پانی تو دے، دیکھ تو بالکل ہی سوکھ گئی ہے۔ نہ جانے کہاں سے گوشت لے آتا ہے یہ رحیمہ۔ اللہ مارا گلنے میں نہیں آتا۔“ پانی کا گلاس لے کر اسے ہنڈیا میں چار ایک چھینٹے دیے اور چھچھ بلانے لگی۔

”ایک مہینے کے لئے گئی ہے کیا؟“ حشمت نے کہہ کر اسے از سر نو چھیڑ دیا۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ سعیدہ چوکی۔ ”ایک مہینہ زیادہ ہے کیا۔۔۔۔۔؟“ ایمان سے کہنا حشمت۔ ایسے لچھن تو نے دیکھے ہیں کسی کے؟ آخر ہمارے زمانے میں بھی پڑھا کرتی تھیں لڑکیاں۔ میں نے بھی پوری سات جماعتیں کی ہیں۔ پر ہم کو تو باتیں بنانا نہ آیا۔ کہیں آئینہ دیکھا جا رہا ہے۔ اب بال بنائے جا رہے ہیں۔ اب اس کھڑکی میں سے لٹک رہی ہے۔ پھر اس منڈیر سے جھانکا جا رہا ہے۔ دوپٹہ لٹکا نہیں سر پر۔ کبھی اوپر کبھی نیچے۔ ادھر لٹک، ادھر ملٹک، تو یہ ہے۔“

”توبہ لی بی آج کل کی لڑکیاں۔“ حشمت نے داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔

”آج کل کی لڑکیاں کیوں۔۔۔۔۔؟ میری بہن ہے۔ خدا کے فضل سے نویں جماعت میں ہوئی ہے۔ کیا محال ہے کبھی آنکھ اوپر اٹھائے۔ سکول سے آئی ہو گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر پڑھ لیا۔ پھر گھر کے کام میں لگ گئی۔۔۔۔۔ اماں کو تو بیٹھے کھانا ملتا ہے۔۔۔۔۔ بھی حشمت ایمان سے کہتی ہوں ان کی لاڈلی خالہ سی لڑکی میری نظر سے تو نہیں گزری۔۔۔۔۔ ہوں گی اللہ میاں نے ہر رنگ پیدا

کیا ہے لیکن حشمت اللہ پناہ میں رکھے۔ میری بیٹی ہو تو کھال ادھیڑ دوں۔“

”لو بی بی اب تو بہت بدل گئی ہے وہ تمہاری نصیحتیں سن کر۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ میں کیوں نصیحت کرنے لگی۔ میں تو ہوئی سوتیلی۔۔۔۔۔ میری تو وہی بات ہے، نیکی برباد گناہ لازم۔ لڑکی کی عادتیں بگاڑیں اس ماں نے۔ پر لوگ تو یہی کہیں گے کہ سوتیلی تھی، لڑکی کو سلیقہ کیا سکھاتی۔ اور اگر کچھ کہوں تو اور تو اور۔۔۔۔۔ اس کے ابا ہی جتا دیں گے۔“

”ہاں یہی تو بات ہے بی بی“ حشمت نے جھک کر کہا۔ ”ورنہ لڑکی تو دو دن میں سدھر جائے۔ میں تو سچی کہوں گی چاہے تم برا ہی مانو بی بی۔“

”برامانے کی کیا بات ہے اس میں۔ میں تو آپ منہ پر کہہ دینے والی ہوں۔۔۔۔۔ ہاں۔“ سعیدہ سرک کر حشمت کے قریب ہو بیٹھی اور رازدارانہ انداز سے بولی۔ ”تمہیں کیا معلوم، باپ پر تو اس لڑکی نے جادو کر رکھا ہے جادو۔۔۔۔۔ وہ تو جان دیتے ہیں۔ بھیگی بلی جو بنی رہتی ہے ان کے سامنے۔ گویا منہ میں زبان نہ ہو۔۔۔۔۔ پر چھوٹی سے چھوٹی بات ان سے جا لگاتی ہے۔ میں کیا نہیں جانتی۔۔۔۔۔ توبہ۔۔۔۔۔ اللہ بچائے! ہم نے تو کسی جوان لڑکی کو یوں باپ کے کندھوں پر چڑھتے نہیں دیکھا۔ کیا زمانہ آیا ہے۔ ایمان سے حشمت۔ جب میں چودہ سال کی ہوئی تو یکنخت ابا کے پاس جانا بند کر دیا۔ توبہ مجھے شرم آتی تھی۔ بس دور ہی سے جو کہنا ہوا کہہ دیا۔ لیکن یہاں تو بات ہی اور ہے۔ شرم نہیں آتی اسے ابا کے سامنے سینہ چھلکاتے ہوئے۔ ہائے ری کیا زمانہ ہے۔۔۔۔۔ وہ تو اپنے آپ کو دودھ پیتی بچی سمجھتی ہے۔۔۔۔۔ توبہ ہے۔“

”بچی۔۔۔۔۔!“ حشمت چلائی۔ ”کوئی نا واقف دیکھ پائے تو یہی سمجھے کہ گود میں بچہ ہے۔ ہاں۔۔۔۔۔ پر میں پوچھوں ہوں بی بی کیا یونہی گھر بٹھا رکھیں گے اسے۔“

”ہائے ری یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔“ وہ اٹھ کر حشمت کے قریب تر ہو بیٹھی۔ ”تو ہی بتا حشمت! ایمان سے کہیو، جوان لڑکی کا یوں جھانکتے رہنا۔۔۔۔۔ میں تو ڈرتی ہوں کہ کوئی بات نہ نکل آئے۔ میں کیا دیکھتی نہیں۔ سبھی کچھ دیکھتی ہوں۔ پھر چپ کیوں ہوں میں؟ بس حشمت چھوڑ اس بات کو۔ چپ ہی بھلی۔ ایک چپ میں سو سکھ۔“

حشمت بھی گرم ہو گئی۔ ”آخر کب تک رہو گی چپ۔ جب کسی کے ساتھ۔۔۔۔۔“

”اے ہے تو نے وہی کہہ دی میرے دل کی بات۔ اسی ڈر سے تو میں مری جا رہی ہوں۔ لوگ تو یہ کہیں گے سوتیلی ماں تھی۔ بے چاری تنگ آ کر نکل گئی۔ اور تو اور خود ہی سارا الزام مجھ پر دیں گے۔ اے ہے اپنی بچی کو کون برا کہتا ہے۔ اس گھر میں بس ایک میں

میں تو دو سال سے یہی حالت دیکھ رہی ہوں۔ تمہیں یاد ہے، پچھلے سال جب اس نے کہیں سے سن پایا تھا کہ اسلم کی بات ہو رہی ہے۔ توبہ۔۔۔۔۔ لڑکی نے پورا ہفتہ منہ سجائے رکھا اور میرے منہ پر تو صاف جتا دیا، میں دیکھوں گی۔ میرے متعلق کون ایسی ویسی باتیں کرتا ہے۔ دو کوڑی کا آدمی میرے لئے رہ گیا ہے کیا؟۔۔۔۔۔ پر انشاء اللہ دو کوڑی کا ہی ملے گا۔“

”میں کہتی ہوں اسلم نہیں تو اور سہی رشتوں کا کیا کال ہے بی بی۔۔۔۔۔ وہ ڈپٹی صاحب کا لڑکا جو ہے۔“ حشمت بات سمجھے بغیر بڑبڑائی۔

”کیوں اسلم کو کیا ہے۔ کوئی لوالنجا ہے کیا۔ اللہ رکھے پڑھا لکھا ہے۔ اور پھر ہوا بھی اپنا قریبی۔ اس کے لئے اس سے بہتر رشتہ ملے گا کہاں؟۔۔۔۔۔ اور وہ ڈپٹی صاحب۔ انہوں نے کئی بار مجھ سے کہا ہے۔ اللہ رکھے لڑکا ایم اے میں ہے پر تو جانتی ہے نا۔۔۔۔۔“ سعیدہ نے ایک معنی خیز نگاہ سے دیکھا اور پھر ہاتھ چلا کر بولی ”ہائے ری۔۔۔۔۔ تیری سمجھ کو کیا ہوا۔۔۔۔۔؟ ایمان سے کہو، یہ لڑکی گھر بسائے گی کیا۔ تو میں کیوں آؤں اس بات میں۔ مجھے اپنی ناک چوٹی کی لاج نہیں کیا۔۔۔۔۔ ہیں؟“

”نہ بی بی! تجھے کیا پڑی تیری بلا سے۔ پر مصیبت تو یہ ہے کہ ایک بار انکار کرنے کے بعد وہ کب اسلم کی بات ماننے لگے۔“

”اللہ تیرا بھلا کرے۔ یہی تو مصیبت ہے۔“

”پھر ہوگا کیا؟“

”ہونا کیا ہے۔ بس وہی ہوگا جو ہوا کرتا ہے اس گھر میں۔ ان کی مرضی اور کیا۔ یہاں کون سنتا ہے کسی کی؟“

”آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے تمہیں۔ تم کیا برا چاہو گی اس کا۔ تم تو بلکہ لڑکی کی بھلائی ہی سوچتی ہونا۔“

”ہائے حشمت! میرا تو جی ہی ایسا برا ہے کہ کسی کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ اپنے دل کو کیا کروں۔ کسی دشمن کو بھی نہ دے ایسا دل۔ نہ جانے لوگ کسی کی برائی کیسے کرتے ہیں۔ ہم سے تو نہ ہو سکی یہ بات۔“

”پر بی بی! یوں نہ بنے گی بات۔ تم ان سے بات تو کرو۔“

”اچھا تو جو کہتی ہے تو کہہ دیکھوں گی میں۔۔۔۔۔“

”نہ میں مجبور نہیں کرتی بی بی! تیری اپنی مرضی ہے۔ نہیں مانتے تو تیری بلا سے۔ دفع کر۔“

”اچھا تو دیکھ تو سہی۔“ سعیدہ بولی۔ اور پھر چوہے کی طرف منہ پھیر کر مسکراہٹ بھینچنے لگی۔ لیکن کوئی انجانا تبسم خواہ مخواہ اس پر چھائے جا رہا تھا۔ گوشت بھونٹتے ہوئے اس نے محسوس کیا جیسے اس کی بغل میں کچھ پھڑپھڑا رہا ہو۔ قمیض تنگ ہوئی جا رہی تھی۔ اور بدن پر

چیونیاں چل رہی تھیں۔ نہ جانے وہ راز کیا تھا جو یوں اس کے بدن میں لہریں لینے لگا تھا جسے وہ اپنی راز دان حشمت سے تو کیا اپنے آپ سے بھی چھپانا چاہتی تھی۔

پکانے سے فارغ ہو کر اس نے ہاتھ منہ دھویا، بال بنائے۔ غازہ مل کر کاجل کی دھار لگائی اور پھر نیا چٹا ہوا ہوا دوپٹہ شانوں پر ڈال انتظار میں بیٹھ گئی۔ میاں کے سامنے کھانا چن کر سعیدہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”بہت دیر ہو گئی آج۔“ وہ بولی۔

”ہیں۔۔۔۔۔؟“ خان صاحب چونک کر بولے ”ہاں کچھ کام تھا۔“ انہوں نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔

”کچھ اچھی بھی بنی ہے کپنار؟“ سعیدہ خواہ مخواہ مسکرائی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ اچھی ہے۔“

”آج کل تو ملتی ہی نہیں۔ میں نے حشمت کو سبزی منڈی بھیج کر منگوائی ہے۔ میں نے کہا، دو ایک دفعہ تو پکالوں۔ آپ کو پسند جو ہوئی۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ ہاں۔“ انہوں نے ہڈی چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”پانی“

”تو بہ دو دن سے گھر ویران پڑا ہے۔“ سعیدہ نے پانی دیتے ہوئے کہا گویا اپنے آپ سے کہا۔

”ہوں۔۔۔۔۔!“ ان کے ماتھے پر تیوری بن گئی۔

”خالدہ جو چلی گئی ہے تو بہا کیلا بھی کوئی نہ ہو۔“

”ہاں اس کی نانی اصرار کر رہی تھی نا۔ یہ عورتیں۔۔۔۔۔ ہونہ۔۔۔۔۔“

”اللہ رکھے اس سال دسویں کرے گی۔ اب تو جوان ہو گئی ہے۔ آپ کو بھی فکر ہے اس کی۔“

”ابھی بچہ ہے۔۔۔۔۔ دیکھا جائے گا۔“ وہ بھرے ہوئے منہ سے مشکل سے بولے۔

”واہ میں کیا یہ کہتی ہوں کہ ابھی کر دو شادی۔“ سعیدہ نے لاڈ سے کہا۔ ”پر نامزد تو کر دینا چاہیے۔ کوئی کھانا پیتا شریف خاندان ہو۔ آج

کل لائق لڑکا تو ملتا نہیں۔ لوگ پہلے ہی سے بات چیت طے کر لیتے ہیں۔ ورنہ شادی کی جلدی ہی کیا ہے؟“

”ہوں۔۔۔۔۔“ وہ بولے۔ ”پھر ہے کوئی لڑکا نگاہ میں؟“

سعیدہ سوچ میں پڑ گئی۔ ابرو تن گئے۔ پلکیں جھپکیں۔ آنکھوں میں اک بے تعلق چمک لہرائی۔ اسے دیکھ کر وہ رک گئے۔ اور بولے

”کیا کہتی ہے؟“

”مجھے تو کوئی ایسا لڑکا نظر نہیں آتا۔“ سعیدہ نے مزید معصومیت سے کہا ”وہ صدیق تھا اس کا نکاح بھی ہو چکا۔ اور انور وہ تو مدتوں سے منسوب ہے اور کوئی لڑکا تو ہے نہیں۔ البتہ اسلم۔۔۔۔۔۔“

”ڈپٹی صاحب کا لڑکا جو ہے۔ تمہارا تو وہاں بہت آنا جاتا ہے۔“

”ہاں ہے تو سہی۔ لائق بھی ہے لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن کیا؟“ وہ بولے۔

”بس کیا بتاؤں۔ کل ہی اس کی ماں رو رہی تھی۔ سعیدہ رازدارانہ انداز میں ان کی طرف جھکی اور متبسم آنکھوں سے بولی۔ کہتی تھی، کالج کی کسی کرنٹی سے۔“ اس کی آنکھیں چمکیں اور پھر پلکیں جھکیں۔ گویا کسی راز پر پردہ ڈال رہی ہوں۔ پھر وہ از سر نو مسکرائے گی۔

ایک ساعت کے لئے خان صاحب کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ لیکن پھر اسی خشک لہجے میں بولے ”جوانی میں لڑکے کیا کیا نہیں کرتے۔ بڑا ہو کر آپ سدھر جائے گا۔“

”پر معاملہ تو حد تک پہنچ چکا ہے۔“ اس نے دوبارہ جھک کر کہا ”سنا ہے دونوں نے چوری چوری بیاہ بھی کر لیا ہے۔ جیسی تو ماں اندر ہی اندر گھل کر کاٹنا ہوتی جا رہی ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ وہ کھانسنے لگے۔ ”ہاں وہ تمہاری ہم شیرہ کالز کا منور جو ہے۔“

سعیدہ نے برا سامنہ بنالیا۔ ”اب آپ سے کیا چھپانا ہے۔“ وہ بات کاٹ کر بولی۔ اور پھر رک گئی۔

”کیا بات ہے؟“ انہوں نے یانی پر کرگلاس رکھتے ہوئے کہا۔

”لڑکاتو اچھا ہے، اللہ کے فضل سے لائق بھی ہے لیکن۔۔۔۔۔“ وہ پھر رک گئی۔

”لیکن کیا؟“

وہ آبدیدہ ہو گئی۔ ”کیا بتاؤں؟ اللہ کی مرضی ہے۔ ہم تو ہر طرف سے دکھی ہیں۔ نہ جانے یہ سب کس گناہ کی سزا ہے۔“ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

”آ خرابات کیا ہے؟“ انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

”بے چارہ منور۔۔۔۔۔“ اس نے اک آہ بھری۔ ”لے دے کے یہی ایک لڑکا تھا لیکن نہ جانے کیا ہوا۔ آج سے تین سال ہونے

کو آئے ہیں، لڑکے کی چھاتی سے خون آتا ہے۔“

”ہیں۔۔۔۔۔ تم نے مجھ سے تو نہیں کہا کبھی۔“

”کہنے والی بات بھی ہو۔“ وہ روئی روئی آواز میں بولی۔ ”وہ تو سب یہ بات چھپائے بیٹھے ہیں۔ بہن کو تو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا گئی یہ بات۔ سعیدہ از سرنوآ بدیدہ ہو گئی۔“

”تم کیوں مفت میں اپنا دل دکھاتی ہو۔۔۔۔۔ تمہارا دل بہت نرم ہے۔“ وہ مسکرائے۔

”اے ہے کل اسلم کی ماں آئی تھی۔ اس وقت سے دل بھرا بھرا ہے۔ جی چاہتا ہے رو دوں۔“

”کیوں؟“

”بس خیال آ گیا اسلم کیسا اچھا لڑکا ہے۔ اتنا فرمانبردار۔ کتنی عزت کرتا ہے وہ آپ کی۔۔۔۔۔“

”میری عزت!“ وہ چونکے

”پھر منور کا خیال آیا۔ بس کچھ میں چھری چل گئی۔ نہ کرتا ایسے کام تو ایسی بیماری نہ لگتی۔“

”کیسے کام؟“

”نہ جانے کیا کیا گل کھلاتے ہیں کالج میں۔ یہ بیماری ایسے نہیں لگتی۔ کل اسلم کی ماں سے مل کر جی خوش ہو گیا۔ اپنے بیٹے کی طرف سے کتنی سکھی ہے۔ اللہ ایسی اولاد سب کو دے۔“

”کس لئے آئی تھی وہ؟“ وہ خشمگیں انداز میں بولے۔

”کچھ نہیں وہ خالدہ کے بارے میں کہنے آئی تھی۔“

”ہونہ۔۔۔۔۔ وہ تو پاگل ہے۔“ انہوں نے کھانا ختم کر کے کہا۔ ”ہم نے اسے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ خیال چھوڑ دے۔ اگر ایسا ہی خیال تھا اس کا تو لڑکے کو بی اے تو کرایا ہوتا۔ دسویں کو تو آج کل۔۔۔۔۔“

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ میں نے تو اسے صاف کہہ دیا۔“ سعیدہ بات کاٹ کر بولی۔ ”یہ ربا حقہ بھرا ہوا ہے۔“

”ہوں“ انہوں نے حقے کا کش لے کر کہا۔ ”کیا کہا تھا؟“

”کہنے لگی، بہن ہم بے چارے غریب ٹھہرے۔ میں نے کہا، بہن یہ نہ کہو۔ ویسے رشتے کے متعلق تم جانو اور تمہارے بھائی۔ وہ آپ سمجھدار ہیں۔ میں بے چاری کس شمار میں ہوں۔“

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ تم اس سے کہیں زیادہ سمجھدار ہو۔“

”آپ کے سامنے میری حیثیت ہی کیا ہے۔“

”خیر خیر۔۔۔۔۔ پھر کیا بولی وہ؟“

”اس نے کیا کہنا تھا۔ میں نے ہی کہا، بہن ان کے دل میں اونچ نیچ نہیں ہے حالانکہ اللہ رکھے برادری میں ان کے برابر کون ہے، لیکن ان کی طبیعت میں امیری کی بو نہیں۔ اونچ نیچ کا خیال نہیں۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔ ہمارے دل میں یہ خیال تو کبھی نہیں آیا کہ وہ چھوٹے ہیں۔ یہ پڑوس میں رمضان کی اماں رہتی ہے۔ بے چاری کتنی غریب ہے۔ وہ سارا سارا دن آ کر بیٹھی رہتی ہے، لیکن ہمارے دل میں کبھی خیال نہیں آیا۔“

”اور پھر اسلم۔۔۔۔۔ میں نے کہا، اسلم کو تو وہ اپنا بیٹا سمجھتے ہیں اور مردوں کے دل میں ایسی ویسی باتیں ہوں گی لیکن ان کے دل میں نہیں۔“

”میں نے کہا، بہن تم اسلم کی نوکری کی فکر نہ کرو۔ وہ چاہیں تو آج ہی کروادیں اسے نوکر۔ ان کا رسوخ کیا کم ہے۔ بڑے بڑے افسر آپ ان سے ملنے آتے ہیں۔ میں نے کہا، ابھی کل ہی رمضان کو نوکر کروایا ہے۔ فی الحال بیس لے گا پھر بائیس ہوں گے پھر تیس۔ اسی طرح ایک دن مرتبے والا ہو جائے گا۔ اور میں نے کہا، صرف آٹھ جماعتیں پاس ہے وہ۔ تمہارا بیٹا تو اللہ رکھے دس پاس ہے۔ افسر نہ بنوادیں تو کہنا۔ ان کی بات کون ٹال سکتا ہے بہن۔۔۔۔۔ ہاں“

”ہی ہی ہی“ وہ ہنسی ”بے چارے بڑی اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ ابھی کل ہی مسٹر صدیقی کہہ رہے تھے، بھی کوئی کام بتایا کرو۔ ریلوے کے افسر ہیں وہ۔ سب ریلیں انہی کے حکم سے چلتی ہیں۔ مالک ہوئے ریلوں کے۔ رمضان کا کام بھی انہوں نے کیا تھا۔ میں نے ویسے سرسری بات کی تھی۔ سارے ہی لحاظ کرتے ہیں۔“ وہ حقہ پینے لگے۔

”ہر روز دیکھتی جو ہوں۔ بڑے بڑے افسر گھر پر آتے ہیں۔ اکٹھا کھانا پینا، ہنسی مذاق۔“

”ہاں ہاں، بڑے اچھے ہیں بے چارے۔۔۔۔۔ اور اسلم کو نوکر کر دانا کیا مشکل ہے۔“

”میں نے کہا، بہن تم جو چاہو سو کہو، جو چاہو سمجھو۔ پر میں نے ان جیسا بھائی نہیں دیکھا، میرا اپنا بھائی ہے کبھی بھول کر بھی یاد نہیں کیا اس نے۔ پر تمہارے بھائی کو اٹھتے بیٹھتے ہر وقت تمہارا خیال رہتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ وہ حقے کا کش لے کر بولے۔ ”آخر بہن ہے، لیکن بہت بے وقوف ہے۔ ہاں۔۔۔۔۔ پھر کیا بولی؟“

”کہنے لگے بھائی تو چاہتا ہے، پر بے چارے کا بس بھی چلے۔“

”ہیں۔۔۔۔۔؟“ وہ چونکے ”بس کیسا؟“

”میرے متعلق کہہ رہی تھی۔“ وہ ایک رسیلی مسکراہٹ سے بولی ”ان کا خیال ہے کہ میری وجہ سے آپ نے رشتے سے انکار کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ لڑکی کا رشتہ میں اپنے رشتہ داروں میں کرنا چاہتی ہوں بلکہ یہ بات تو وہ کئی بار میرے منہ پر جتا چکی ہیں۔ یہ خیال تو آنا ہی ہوا انہیں۔ قدرتی بات ہے۔ ایمان سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔“ اس کے دانت سرخ ہونٹوں تلے چمکے۔

”لاحول ولاقوة..... کیا بے ہودہ خیال ہے۔ پاگل ہے پاگل۔“

”میں نے تو صاف کہہ دیا۔ میں نے کہا، بہن مجھے جو جی میں آئے کہہ دو لیکن ان پر جھوٹا الزام نہ دھرو۔ وہ کوئی زن مرید نہیں۔ اللہ رکھے اپنی عقل کے مالک ہیں۔ بڑے بڑے افسران کی صلاح لئے بغیر قدم نہیں اٹھاتے۔ ہاں وہ بھلا عورت کے پیچھے بھیڑ کیوں نہیں۔ ان کی ایسی عادت نہیں۔“

”ہاں سچ کہہ رہی تھی وہ۔ اپنے میاں کی بات کر رہی تھی نا۔ میں جانتا ہوں۔ خدا جانے مرد عورتوں کی باتوں میں آ کر اپنے آپ کو بیوقوف کیوں بناتے ہیں؟“

”بس یہی بات ہے وہ سمجھتی ہے جیسے اس کا مرد ہے ویسے ہی دوسرے بھی ہوں گے۔“

”لاحول ولاقوة..... تمہارے متعلق تو اس کا خیال بالکل غلط ہے۔ تم تو الٹا ہمیں آپس میں مل بیٹھنے کی ترغیب دیتی رہتی ہو۔“

”ان سے نہ ملیں تو ہم کس سے ملیں۔ ان سے زیادہ عزیز کون ہے ہمیں۔ آپ ہی بتائیں۔ ویسے میرا آپ کی باتوں میں دخل ہی کیا ہو سکتا ہے۔ تو بہ میں کیا آپ کی عقل تک نہیں پہنچ سکتی ہوں؟“

”نہیں نہیں۔ تم بڑی سمجھدار ہو۔ بیوقوف تو وہ ہے۔ پاگل ہے۔۔۔۔۔۔ پاگل۔“

”میں نے بھی اسے لا جواب کر دیا تھا۔ میں نے کہا، بہن خالدہ کے لئے تم سے بہتر ساس کون ہوگی۔ ویسے تو انہیں ہزاروں رشتے ملتے ہیں۔ ان کے دوست کوئی چھوٹے موٹے آدمی نہیں۔ ابھی تو ڈپٹی صاحب کی بیوی کل ہی رشتے کے لئے کہہ رہی تھی اور پھر وہ ریلوں کے مالک نہ جانے کیا نام ہے، ان کا لڑکا ولایت پاس ہے۔ آخر انہیں اپنے عزیزوں کا خیال ہی تھا نا کہ لڑکی منسوب نہ کی۔ ورنہ آج تک.....“

”ہاں ہاں وہ تو اب بھی۔۔۔۔۔۔“

”یہی تو میں نے بتایا اسے۔ میں نے کہا، بہن سچ کہنا۔ آخر وہ کیوں نہیں کر دیتے رشتہ۔ ایمان سے کہنا، کیا تم نے ان سے کبھی بات بھی

کی ہے۔ مجھے ہی کہتی ہوں۔ میں ایسی باتیں ان سے کیسے کروں۔ میری تو جرات نہیں۔“ اس نے لجا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ ”تم خود کہو ان سے۔ میں نے کہا، تمہاری بات کیوں رد کرنے لگے وہ۔“

”نہیں اس نے کہا تھا مجھ سے۔۔۔۔۔“

”تو آپ نے کون سا توڑ کر جواب دے دیا تھا۔ بس اتنا ہی کہا تھا کہ لڑکی تعلیم سے فارغ ہو لے اور لڑکا صرف دس پاس ہے۔“

”ہاں ہاں یہی کہا تھا ہم نے اور۔۔۔۔۔“

”اور میں نے کہا۔ یہ کیا جھوٹی بات ہے سوچ کہتے ہیں وہ۔“

”پھر کیا بولی؟“

”میں نے ہی کہا۔ میں نے کہا، بہن وہ خالدہ کو اس لئے تو نہیں پڑھا رہے کہ اللہ نہ کرے اس سے نوکری کروانی ہے۔ تو بہ کرو بہن وہ تو

آپ پڑھی لکھی استانی لڑکی کے لئے نوکر رکھ سکتے ہیں۔ بھلا خالدہ سے نوکری کیوں کروانے لگے وہ۔“

”اؤں ہوں۔ یہ کس نے کہہ دیا ان سے۔ ہمارا تو قطعی یہ ارادہ نہیں۔۔۔۔۔ پاگل ہے۔“

”میں نے کہا، بہن لڑکی کو جو پڑھا رہے ہیں تو صرف اس لئے کہ پڑھ کر اچھی بیوی بنے۔ اس میں تو تمہاری ہی بھلائی ہے۔ پڑھی لکھی

بہو ہوگی۔ اور ماشاء اللہ وہ پہلے ہی ایسی لڑکی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ وہ آپ بیٹی کی تربیت کا خیال رکھتے ہیں۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ پھر کیا بولی؟“

”پھر کیا بولتی۔ گلی بغلیں جھانکنے اور پھر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ بولی آخر مجھے بھی تو اپنے بھائی ہی سے امیدیں ہیں۔

اسی پر ناز ہے مجھے اور میرا ہے ہی کون۔ اک بھائی ہے ناجس کے آسرے جیتی ہوں۔ چاہے اٹھالے یا ٹھکرا دے۔ اس کی مرضی۔“

خان حقے کا کش لینا بھول گیا۔ بولا ”پاگل ہے پاگل۔۔۔۔۔“

”میں نے کہا، وہ بھائی ایسا نہیں جو ٹھکرا دے گا۔ تم نے تو اسے سمجھا ہی نہیں۔“

”ہاں ہاں وہ بیچاری کیا سمجھے گی۔“

”اور میں نے کہا، یہ نہ سمجھنا کہ وہ اسی بات پر اڑے رہیں گے کہ اسلم بی اے کر لے۔ اونہوں۔“

”کیا جواب دیا اس نے؟“ وہ پھر چمک کر بولے۔

”میں نے کہا، وہ ایسی نوکری دلوا سکتے ہیں اسے جو بی اے کو بھی نصیب نہ ہو۔ میں نے کہا، بہن آج کل جماعتوں کو کون پوچھتا ہے، کئی

بی اے دھکے کھا رہے ہیں۔ بیس روپے کی نوکری کو ترستے پھرتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ان کی سفارش پر سو روپے کی نوکری نہ ملی تو کہنا۔
تو نے سمجھا کیا ہے؟“

”ہاں بی اے کو کون پوچھتا ہے آج کل۔“

”یہی تو میں نے کہا تھا۔“

”پھر کیا بولی؟“

”بولی میں تو بھائی کے قدموں پر جاگروں گی۔ ایمان سے۔۔۔۔۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ یاگل ہے یاگل“

”یہ تو خیر آپ ہی جانیں۔ پر جس قدر اسے پیار ہے آپ سے، میں جانوں شاید ہی کسی بہن کو ہوگا۔ بس وہ آپ کو سمجھی نہیں۔“

”ہاں بہوقوف جو ہوئی۔“

”اتنی عقل لائے بھی کہاں سے؟ وہ تو ظاہر کو دیکھ کر اصل سمجھ لیتی ہے۔ جیسی تو کہتی ہے کہ بھائی ملتے بھی ہیں تو کس رکھائی سے۔ اے کیا معلوم کہ روکھی نگاہوں کے نیچے یہ دال کس قدر گرم۔۔۔۔۔“ اس نے ہاتھ سے ان کا سینہ تھپکا اور پھر اک دلیلاز طریقے سے مسکرا دی۔

”سعیدہ“ ان کی آنکھ چمکی۔ ”ہی ہی ہی۔ تم بات تاڑ جاتی ہو۔۔۔۔۔ حد ہوا دھر آنا ذرا۔ میری طرف دیکھو تو۔“

”چلو ہٹو۔“ وہ لاڈ سے بولی۔ ”خواہ مخواہ میرا نام بدنام کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتی ہے میں ہی ورغلا رہی ہوں جیسے کوئی ورغلا سکتا ہے آپ کو۔“

”خدا کی قسم بڑی شریر ہوں۔ اچھا میری بات سنو۔“

”میں جانتی ہوں۔“ وہ بولی

”سعیدہ“ انہوں نے سنجیدگی سے لگا کر۔ ایک ساعت کے لئے وہ سہم گئی۔ پھر منہ موڑ کر ان کے روبرو ہو بیٹھی۔ ”بات تو سنو تم“ وہ بولے۔ ”میرا مطلب ہے تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن اسلم اچھا لڑکا ثابت نہ ہوا تو۔۔۔۔۔؟“

”نہ ہوا تو“ وہ بولی ”مستغنی چھڑانے میں کیا دیر لگتی ہے۔“

”ہاں ہاں‘ یہی ہمارا خیال ہے۔ اچھا تو تم کل اسے بلا کر بات کر لینا۔“

الصدق

خط پڑھ کر میں نے محسوس کیا گویا کسی نے میرے کلیجے میں چھری بھونک دی ہو۔ میرے دل میں بیگم کے متعلق شکوک ریٹنے لگے۔ اسد کے ان چار لفظوں نے ایک قیامت برپا کر دی تھی۔ کس قدر مختصر خط تھا۔ ”فورا واپس چلے آؤ۔“ اس کو بھلا میری واپسی کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے گھر سے دورے پر آئے ہوئے ابھی چار دن ہی ہوئے تھے۔ اگر گھر میں کوئی ایسی بات ہوتی تو کیا وہ مجھے مفصل خط نہ لکھ سکتا تھا۔ ضرور اس نے مجھے بیگم کے متعلق بلا یا ہے۔

نیگم کا بے پناہ حسن میرے لئے کبھی سکون یا خوشی کا باعث نہیں ہوا۔ اس کا حسن ایسا نہ تھا جسے دیکھ کر دل میں راحت یا خوشی پیدا ہو یا احساس ہو کہ میں جی رہا ہوں۔ جینا چاہتا ہوں۔ اس کے برعکس اسے دیکھ کر میں یوں محسوس کرتا گویا کسی رنگین بے قراری نے ڈس لیا ہو۔ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کروں۔ میں دیوانہ وار ادھر ادھر گھومنے لگتا۔ ”اب میں کیا کروں؟ کیا کروں میں؟“

اس کی نیم وانو کیلی آنکھیں در پردہ مسکرایا کرتیں۔ بچنے ہوئے خم دار پتلے ہونٹ زیر لب کچھ کہتے ہوئے محسوس ہوتے۔ کمان سے ابرو اشارے کرتے رہتے۔ رخساروں میں نیم رضا مندی کی سلوٹ نمایاں رہتی۔ اف وہ دھار کی طرح چبھ جانے والا حسن۔۔۔۔۔ سریلی چیخ کی طرح چونکا دینے والا۔

ہماری شادی ہوئے پورے دو سال ہو چکے تھے۔ مجھے بیگم سے عشق تھا۔۔۔۔۔ عشق۔ میرے دل میں ایک بھٹی سلگتی رہتی تھی۔ اسے دیکھ کر رگ رگ میں تڑپ اٹھتی اور یوں دیوانہ وار جھومتی جیسے کوئی موت کا ناچ ناچ رہا ہو۔

ہر مرتبہ جب میں نیگم سے ملتا تو مجھے محسوس ہوتا گویا ہم پہلی مرتبہ مل رہے ہیں۔ اس کے انداز میں کچھ ایسا نیا پن تھا جو اکثر بیگانگی یا بے نیازی میں بدل جاتا تھا۔ لیکن وہ اسے خوب پھبتا تھا۔ جب وہ معصومیت سے گردن موڑ کر کہتی۔ ”کہئے آئیے آگئے آپ۔“ اس وقت اسے یہ قطعی احساس نہ ہوتا کہ قریب ہی کوئی تڑپ رہا ہے اور نہیں جانتا کہ کیا کرے۔

ہمارے نوجوان پڑوسی نواب ظفر علی کے آنے پر تو اس کی آنکھیں اور بھی مترنم اور ہونٹ اور بھی متکلم ہو جاتے۔۔۔۔۔۔
بھنوئیں رمز سے تن جاتیں۔ گالوں کی نیم رضا سلوٹ اور بھی واضح ہو جاتی۔ اس وقت میں محسوس کرتا کہ وہ دور بیٹھ کر کربھی بن بولے باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے یہ ہنس رہے ہیں۔ نواب کی مست آنکھیں اور بیگم کی بے نیازی میرے شکوک کو ابھارتے اور میں تڑپتا۔ ضرور

وہ ملتے ہوں گے۔ ان کی نگاہوں میں شوق اور بے تکلفی جھلکتی ہے۔ ان کے انداز میں گزشتہ ملاقاتوں کے متعلق اشارات نمایاں ہیں۔ اس وقت میراجی چاہتا کہ نوکری سے استعفیٰ دے کر گھر بیٹھ رہوں۔ مہینے میں بیس دن باہر دورے پر رہنا۔۔۔۔۔ اف کیا مصیبت تھی۔

انہی دنوں میرا پرانا دوست اسد مجھ سے ملنے کے لئے آ گیا۔ دو ایک دن خوب کئے۔ لیکن وہ فوراً تازہ گیا کہ میرے دل میں گھن لگا ہوا ہے۔ اس کے اصرار پر مجھے اپنے شکوک کا قصہ سنانا ہی پڑا۔ ”واہ۔۔۔۔۔ یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”بڑی بات۔“ میں نے آہ بھر کر کہا۔ ”اس بات پر میری زندگی کا دار و مدار ہے۔ اسد میں صرف جاننا چاہتا ہوں‘ حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”میں سمجھتا ہوں‘ میں بڑی سے بڑی بات برداشت کر سکتا ہوں۔ لیکن شبہات مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتے۔“

”ہوں“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”اچھا تم دورے پر چلے جاؤ۔ میں یہیں رہوں گا۔ جلد ہی سب بھید معلوم ہو جائے گا۔ حقیقت کا انکشاف ہو گیا تو تمہیں بلا لوں گا۔ تم فوراً آ جانا۔ دیر نہ کرنا۔ ممکن ہے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو۔ میں کوشش کروں گا۔“

نہ جانے اسد مجھے کیا دکھانا چاہتا تھا۔ بس اور کیا ہوگا۔ وہی جس کا مجھے ڈر تھا وہ میری نہیں۔ وہ کسی کی بھی نہیں۔ اف۔۔۔۔۔

میرا دل عجیب خدشات سے بھرا تھا۔

نوکروں نے جب سنا کہ میں اکیلا جا رہا ہوں تو حیران رہ گئے۔ مجھے نوکروں کو دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ سارے اس بھید سے واقف ہیں۔ ان کا زیر لب تبسم مجھے کس قدر کھلتا ہے۔

”ہاں اکیلے۔۔۔۔۔“ میں نے چلا کر کہا۔ ”گھوڑا تیار کرو۔“

گھور گھاٹ سے چل کر میں نے رات دس بجے تک پچاس میل کا سفر طے کر لیا اور بھور پور کے ریٹ ہاؤس میں آدھ گھنٹہ سستا کر آگے چل پڑا۔ اس رات میرے نصیب میں آرام کہاں۔ دل میں الجھن لگی ہوئی تھی۔ کوئی کلیجہ مل رہا تھا۔

بھور مندر سے کاش گڑھ کو دور استے جاتے ہیں۔ سڑک سے جاؤ تو کاش گڑھ 35 میل سے کم نہیں۔ مگر پگنڈی کے راستے میں بیس میل ہوگا۔ میرا ارادہ تھا کہ آدھی رات تک گھر پہنچ جاؤں گا۔ اس لئے میں نے گھوڑے کو پگنڈی کی طرف موڑ دیا۔

یہ پگنڈی ایک جھاڑی دار جنگل میں سے نکل گئی ہے۔ اگرچہ راستہ قطعی سنان ہے لیکن یہاں وہاں کہیں کہیں کسانوں یا سلیٹ

کوزی کے مزدوروں کے جھونپڑے ہیں۔ جنگل میں درندے کثرت سے ہیں لیکن اس روز درندوں کا خوف میرے دل میں نام کو نہ تھا۔ دل میں بس یہی لگن تھی۔ نہ جانے آج مجھے کیا دیکھنا ہے؟

رات کس قدر اندھیری تھی۔ آسمان پر ستارے بھی یوں ٹٹمارہے تھے گویا کاڑھے ہوئے اندھیرے میں دم توڑ رہے ہوں۔ ہوا جھاڑیوں میں کراہ رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ جھاڑیوں کا رکھ گویا زندگی سے بھرپور تھا۔ پگڈنڈی یوں بل کھا رہی، لہر رہی تھی جیسے کوئی مہیب اژدھا رینگ رہا ہو۔ چاروں طرف سے عجیب و غریب آوازیں آرہی تھیں۔ کوئی قہقہہ مار رہا تھا۔ کوئی بڑھیا چیخ رہی تھی۔ بچہ رو رہا تھا۔ کوئی گھنگھرو پہنے ناچ رہی تھی۔ عجیب سی بے معنی آوازیں۔ یہاں وہاں کوئی دیا جھلملاتا۔ پھر وہ شعلہ بن جاتا اور لپک کر ٹہنیوں پر جا بیٹھتا۔ دفعتاً آگ روشن ہو جاتی اور اس کے گرد سائے ناچتے۔ جنگل نہ جانے چیخوں، یا قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ لیکن میں ایک ہی دن دھن میں چلا جا رہا تھا۔ چلا جا رہا تھا۔ گویا گھوڑے پر خود ایک بھوت سوار ہو جس پر کسی ڈائن کا سایہ ہو۔ میری بغل میں ٹارچ تھی۔ بایاں ہاتھ تھامے اور دایاں ہاتھ پستول پر جو میری پٹی میں لٹک رہا تھا۔

میں یونہی دو تین گھنٹے چلتا رہا۔ دفعتاً پگڈنڈی پر روشنی نمودار ہوئی۔ سامنے ایک بڑھاوردی پہنے لائین لئے کھڑا تھا۔ گویا میرا ہی انتظار کر رہا ہو۔ گھوڑا آپ ہی آپ رک گیا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ پھنسا۔ اس ویران پگڈنڈی پر آدھی رات کے وقت ایک بڑھا۔ کچھ دیر تک میرے منہ سے بات تک نہ نکل سکی۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

”جمعہ دار یہاں سے کاش گڑھ کتنی دور ہے؟“ میں نے اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے بات کی۔

بڑھے نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے منہ پر اس قدر جھریاں تھیں جیسے مکڑی نے جال اتن رکھا ہو۔ دو بلویں آنکھیں چمک رہی تھیں۔ بڑھے نے نفی میں سر ہلادیا اور پھر لائین کی طرف دیکھنے لگا۔ ”ہائیں یہ راستہ کاش گڑھ کو نہیں جاتا۔“ بڑھے نے پھر نفی میں سر ہلادیا۔

عین اس وقت زبردست گرج کی آواز سنائی دی اور ہوا زور سے چلنے لگی۔ ”راستہ بھول گئے۔“ بڑھے نے مدھم آواز میں کہا۔

”راستہ بھول گئے۔۔۔۔۔ راستہ بھول گئے۔“ ہر جھاڑی میں اس کی بات گونجنے لگی۔ ”بھول گئے۔“ بادل گرجا۔

بڑھے نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ پھر انگلی سے مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے ادھر آنکھ اٹھائی۔ دیکھتا ہوں کہ پگڈنڈی سے ذرا ہٹ کر ایک قلعہ نما مکان کھڑا ہے۔ مکان کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ کاش گڑھ کے راستے میں کوئی ایسا مکان نہ تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ واقعی میں راستہ بھول چکا ہوں۔

میں گھوڑے سے اترا۔ اور بڑھے کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ قریب جانے پر معلوم ہوا کہ وہ مکان ایک وسیع و عریض مگرویران نائک چندی قلعہ ہے۔ دروازہ پر پتھر میں ”الصف“ کندہ تھا۔

”تمہارے آقا ناراض تو نہ ہوں گے؟“ میں نے بڑھے سے پوچھا۔

”نہیں“ اس نے سر ہلا کر کہا ”خوش“

پھر وہ گھوڑا لے کر چلا گیا اور میں تن تنہا وہاں کھڑا رہ گیا۔ عین اس وقت بالائی منزل میں ایک کھڑکی کھلی اور ایک بتی روشن ہو گئی۔ کھڑکی میں ایک دہلی پتلی اداس حسینہ آکھڑی ہوئی گویا کسی کا انتظار کر رہی ہو۔

”آئیے“ بڑھے نے واپس آ کر مجھے چونکا دیا۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

اب میرے تمام شبہات مٹ چکے تھے۔ بلکہ میں خوش تھا کہ رات کاٹنے کے لئے ایک محفوظ جگہ مل گئی۔ دو ایک اندھیرے کمروں کے بعد زینے سے ہوتے ہوئے ہم دونوں اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں میں نے حسینہ کو دیکھا تھا۔ وہ ایک وسیع کمرہ تھا جس کا ایک حصہ باریک پردے سے علیحدہ کر دیا گیا۔ بڑھے مجھے اس پردے کے پیچھے لے گیا۔ اور پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ کمرے کے بڑے حصے میں ایک مدھم سی بتی جل رہی تھی۔ پلنگ اور پلنگ پوش دونوں پرانی وضع کے تھے مگر تھے دونوں ہی قیمتی۔ بچھونے پر گرد و غبار کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ بڑھے کا آقا مہمان نواز تھا لیکن اسے رکھ رکھاؤ کا طریقہ مطلقاً آتا تھا۔ اس غبار آلود پلنگ پر سونا میرے لئے ناممکن تھا۔ میں نے کچھ کہنے کے لئے مڑ کر بڑھے کی طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ بڑھے کی اس عجلت پر مجھے حیرانی ہوئی۔ مایوس ہو کر پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ تمام کمرہ گرد آلود تھا۔ گویا برسوں سے کسی نے جھاڑا نہ ہو۔ بستر کے علاوہ کمرے کا سارا فرنیچر بے حد پرانا تھا۔ اگرچہ تھا قیمتی۔ فرش پر کشمیری قالین بچھے ہوئے تھے۔ دو ایک چوکیاں جو یہاں وہاں رکھی تھیں بہت بھاری اور بھدی تھیں۔ پرلے کونے میں لکڑی کا جالی دار پردہ کھڑا تھا۔ جس کے پاس ہی دیوار پر ایک عجیب سی شکل کا کلاک لٹکا ہوا تھا۔ جس کے پنڈولم کی رفتار اس قدرست تھی کہ اس کے چلنے کی آواز تک سنائی نہ دیتی تھی۔ شمع دان پر ایک بڑا گتہ رکھا ہوا تھا جس پر جلی اور خوش خط قلم سے ”بیگم آصف الدولہ“ لکھا تھا۔ پاس ہی ایک کیلنڈر لٹکا ہوا تھا جس پر 31 دسمبر کی تاریخ لگی ہوئی تھی۔ 31 دسمبر۔۔۔۔۔ میں نے حیرانی سے اسے دوبارہ دیکھا۔ اس دن تو جون کی گیارہ تاریخ تھی۔

ہائیں میں نے دیکھا۔ وہی حسینہ چپ چاپ چوکی پر بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر میں 31 دسمبر کو قطعی بھول گیا۔ حسینہ اٹھ بیٹھی۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ کمرے میں مدھم آہ تیرنے لگی۔

اس کی آنکھیں موٹی تھیں اور جسم لچکدار۔ اگرچہ لباس پرانی وضع کا تھا لیکن اس لباس میں وہ کس قدر پیاری لگتی تھی۔ نہ جانے بے

چاری کو کیا دکھ تھا کہ اس قدر اداس تھی۔

باہرہ دروازے پر مدھم دستک سنائی دی۔ ”سعیدہ“

حسینہ نے اپنا سر اٹھایا ”اسفند“ اس کا چہرہ خوشی سے چمکا۔

ایک خوش رو جوان کمرہ میں داخل ہوا۔ سعیدہ اور وہ دونوں آپس میں لپٹ گئے۔

”تم آ گئے اسفند“

”ہاں میں آ گیا۔“

”میں جانتی تھی کہ تم آؤ گے۔“

”تمہارے میاں؟“

”او نہ، وہ گنگنائی۔“

”کیوں؟“

”چلے گئے“

”اوہ“ جوان مسکرایا۔

”دونوں چوکی پر بیٹھ گئے۔ جوان نے اپنی مرصع پگڑی اتار کر رکھ دی۔“

”سعیدہ“ جوان نے آہ بھری۔

”اسفند“

”اوہ سعیدہ“

کمرہ میں دھم آہیں تیرنے لگیں۔

”اگر وہ آ گئے تو؟“

”ایسا نہ کہو۔“ سعیدہ نے اس کے منہ پر انگلی رکھ دی۔ جوان نے اس کو چوم لیا۔

”تم میری ہو؟“

”ہاں۔“ ایک بار پھر وہ لپٹ گئے۔

میں حیران بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ وہ پردہ جو ہمارے درمیان حائل تھا۔ اس قدر باریک تھا کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ ان کی معمولی جنبش بھی پورے طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ اگر انہوں نے مجھے دیکھ پایا تو۔۔۔۔۔ اس خیال سے میں گھبرا گیا۔ نہ جانے وہ سڑی بڑھا مجھے وہاں کیوں بٹھا گیا تھا۔ پھر دفعتاً میرا خیال اپنی بیگم کی طرف چلا گیا۔ نہ جانے اس وقت کس سے مل رہی ہوگی۔ اف میرا راستہ بھول جانا کس قیامت کی غلطی تھی۔

پھر سیزھیوں کی طرف سے آوازیں سنائی دیں۔ مدھم آوازیں۔ اور میرا سلسلہ خیال منقطع ہو گیا۔
”بیگم کہاں ہیں؟“ ایک بار عجب مگر مدھم آواز آئی۔

”بڑے کمرے میں حضور۔“

”اس وقت؟“

”جی“

”کیا کر رہی ہیں۔۔۔۔۔؟ آرام کر رہی ہوگی؟“

”جی“

”اچھا تم جاؤ۔“

پھر ایک مدھم مگر گہری آہ کی آواز آئی جو کافی دیر تک میرے ارد گرد منڈلاتی رہی۔ پھر کوئی بڑبڑانے لگا۔

”وہ بے آرام ہوگی۔ کل ہو جائے گی اطلاع ہمارے آنے کی۔ لیکن۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔! اس سے دور رہنا کتنا مشکل ہے۔“

پھر بڑے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دونوں چونک پڑے۔ ”کون ہے؟“ وہ بولی۔

”بیگم۔۔۔۔۔“

”اوہ“ کمرہ میں ایک آہ تیرنے لگی۔ دونوں خوف سے بھوت بن گئے۔ سعیدہ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر مسکرا کر جالی دار پردے

کی طرف اشارہ کیا۔ اور وہ پردے کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔

”بیگم ہم ہیں۔“ پھر دستک ہوئی۔

سعیدہ نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ ”آپ۔۔۔۔۔؟ اس وقت؟“

”ہاں اس وقت۔ آرام کر رہی تھیں کیا؟“

”آپ آگئے۔“

”ہاں تم سے دور رہنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے بیگم۔“

”اوہ“ کمرہ میں دو آہیں گونجیں۔ مدھم اداس آہیں۔

”یہ پگڑی؟“ آصف الدولہ نے چوکی سے نوجوان کی پگڑی اٹھا کر حیرانی سے پوچھا۔

بیگم بے پرواہی سے کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

”بیگم۔۔۔۔۔“

”بیگم۔۔۔۔۔ کوئی آیا تھا؟“

”نہیں تو۔“ وہ وہیں سے بولی۔

”اوہ۔۔۔۔۔“

آصف الدولہ نے کمرہ میں چاروں طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں لکڑی کے پردے پر جم گئیں۔ کمرہ کے ہر کونہ سے آہیں سنائی دینے لگیں۔

”آپ کو شک ہے کیا؟“ بیگم نے چتون چڑھا کر پوچھا۔

”نہیں تو۔“

”پھر۔۔۔۔۔؟“

آصف الدولہ پردہ کی طرف بڑھا۔ بیگم نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”اگر وہاں کوئی نہ ہوا تو۔۔۔۔۔؟“

”تو؟“ وہ رک گیا۔

بیگم شمع دان سے وہ گتہ اٹھالائی جس پر بیگم آصف الدولہ لکھا ہوا تھا اور اسے یوں پھاڑ دیا کہ ”بیگم اور آصف الدولہ الگ الگ ہو گئے۔“ تو کہہ کر اس نے وہ ٹکڑے الگ الگ میاں کو دکھا دیئے۔ اور پھر آپ نہایت متانت سے باہر نکل گئی۔ اور باہر دروازہ کی اوٹ میں کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔

”اوہ۔۔۔۔۔“

”ہوں“ کمرے میں اداس سی آہیں گونجنے لگیں۔ آصف الدولہ بے تابانہ ادھر ادھر ٹھٹھکتا رہا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

”آؤ۔“ بیگم نے آہستہ سے پکارا۔

”ہوں“ وہ چونک پڑا۔ اور پھر اس چوکی پر بیٹھ گیا جو اس کو نے میں اندھیرے میں پڑی تھی۔ اس کے بعد ایک عرصے تک خاموشی چھائی رہی۔

پھر وہ بیٹھا بیٹھا بڑبڑانے لگا ”اگر وہاں کوئی نہ ہوا تو۔۔۔۔۔۔؟“

”اگر وہاں کوئی نہ ہوا تو۔۔۔۔۔۔؟“ کمرہ میں ہلکی ہلکی مدھم آوازیں سنائی دیں۔ گویا وہ قالین اور کلاک باری باری اسے دہرا رہے تھے۔

”اور اگر کوئی ہوا تو۔“ اس کا چہرہ ایک ساعت کے لیے نہ جانے خوف یا غصہ سے چکا۔ وہ اٹھ بیٹھا لیکن پھر کچھ سوچ کر چپ چاپ آہستہ سے بیٹھ گیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔۔“ وہ بڑبڑایا جیسے کوئی خوف ناک فیصلہ کر چکا ہو۔

”اب آ بھی جاؤ۔“ بیگم باہر سے بولی ”آؤ بھی نا۔“

نوجوان لکڑی کے پردے سے باہر نکل آیا۔ بیگم نے اسے دیکھا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔

آصف الدولہ نے کنکھیوں سے اسے دیکھا۔ لیکن سر جھکائے رکھا۔ پھر وہ بڑبڑایا۔ ”کوئی ہے۔۔۔۔۔۔ خدمت گار ہے۔ خدمت گار۔ جاؤ ہمارے لئے حمام تیار کرو اور بیگم کو یہاں بھیج دو۔“ ان لفظوں کو کہتے ہوئے آصف الدولہ کے ماتھے پر کرب کی ایک لہر پیدا ہو گئی اور اس کی روح میں ڈوب گئی۔ ایک ساعت کے لئے اس کا چہرہ اذیب سے بھیا نک ہو گیا۔

نوجوان پہلے تو ڈرا اور حیرانی سے ٹھنکا لیکن پھر جلدی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ میں پہنچ کر اس نے بیگم کی طرف پر معنی نگاہ ڈالی لیکن سعیدہ نے منہ موڑ لیا اور اندر آ گئی۔

کمرہ میں عرصہ تک خاموشی چھائی رہی۔ کراہ زدہ خاموشی۔

”تم آ گئیں سعیدہ۔“ آصف شوق سے اٹھ بیٹھا۔

بیگم کی آواز میں شرمساری کی جھلک تھی۔

”مغموم کیوں ہو۔ آؤ یہاں۔“ آصف بولا ”بیگم۔۔۔۔۔۔ تم خاموش کیوں ہو گئیں؟“

”میں۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔“ پریشانی کی وجہ سے بیگم کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

کمرہ میں ایک قہقہہ گونجا۔ ”یہ میں۔۔۔۔۔ میں کیا ہوا کیا مذاق کر رہی ہو سعیدہ؟“
”مجھے افسوس ہے۔“ سعیدہ گنگنائی۔

”النا ہم شرمندہ ہیں کہ ہم نے تم پر شک کیا۔ ہمیں معاف کر دو سعیدہ۔“ اور وہ دونوں آپس میں لپٹ گئے۔

انہیں تھلے میں دیکھنا مجھے گوارا نہ تھا۔ میں نے جھٹ آ نکھیں نیچی کر لیں۔ لیکن رہ رہ کر مجھے خیال آتا کہ وہ عورت کس قدر چالاک تھی اور وہ مرد سب کچھ جاننے کے باوجود۔۔۔۔۔ سارا قصہ ہی عجیب تھا۔

میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ انگلیٹھی پر ایک کی بجائے دو دیئے جل رہے تھے۔ دونوں شعلے ابھر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے وہ شعلے بہت بلند ہو گئے اور اوپر جا کر یوں خم کھا کر مل گئے کہ ایک محراب بن گئی۔

ڈر کے مارے میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ لیکن حلق میں آواز نہ تھی۔ میں بھاگا اور نہ جانے کیسے ٹھوکریں کھاتا ہوا سیڑھیوں میں جا پہنچا۔ وہاں وہی بڑھالائین اٹھائے سڑک کی طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے ہولیا۔ دروازہ پر میرا گھوڑا اکھڑا تھا۔ ”چلے“ اس نے مجھے گھوڑا پکڑاتے ہوئے کہا۔ اور ہم دونوں چپ چاپ پگڈنڈی کی طرف چل دیئے۔

میرے دائیں بائیں چاروں طرف سے مدھم اور مبہم آوازیں آرہی تھیں۔

”اب ہم آزاد ہیں، بیگم آزاد ہیں۔۔۔۔۔ ہم چاہتے ہیں کہ سب کو آزاد کرادیں۔ سب قیدیوں کو آزاد کر دو۔ قیدیوں کو آزاد کر دو۔“

پگڈنڈی پر آصف الدولہ کھڑا گنگنارہا تھا۔ ”سب قیدیوں کو آزاد کر دو قیدیوں کو تم آزاد ہو۔۔۔۔۔ آزاد۔“ خوف کے مارے میں چیخ نکل گئی۔ ”بھوت“

”بھوت“ بڑھا چلا یا اور اپنی بلوریں آنکھیں میری طرف اٹھائیں۔ اس کا چہرہ ڈر سے بھیانک ہو گیا۔ اور وہ کانپ کانپ کر گر پڑا۔ لائین گل ہو گئی۔

میں نے فوراً نارچ جلائی۔ پگڈنڈی ویران پڑی تھی۔ وہاں نہ بڑھا تھا اور نہ اس کی لائین۔ میں نے نارچ کی روشنی میں اپنے گرد چاروں طرف پھینکی۔ ارد گرد کسی مکان کا نام و نشان نہ تھا جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی جھاڑیوں کا ایک وسیع پھیلاؤ دکھائی دے رہا تھا۔

۔۔۔۔۔ سامنے دور دو ایک میل پر کاش گڑھ کی مسجد کے گنبد صبح کے دھندلکے میں جھلما رہے تھے۔

”آزاد۔۔۔۔۔“ کوئی موذن مینار پر کھڑا چلا رہا تھا ”آزاد“

نہ جانے کیا ہوا مجھے۔ دفعتاً میرے دل کا ڈر دور ہو گیا۔ اطمینان سا پیدا ہو گیا۔ ایسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ تمام زنجیریں کٹ گئی ہوں جو مجھے جکڑے ہوئے تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ کاش گڑھ کو جانا بے کار ہے۔ نہ جانے کیوں۔ حقیقت حال جاننے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ میں نے گھوڑے کا منہ واپس بھور گھاٹ کی طرف موڑ دیا اور اسے ایڑ لگا دی۔

کئی ایک سال کے بعد مجھے پہلی مرتبہ کشمیر جانا پڑا۔ پہاڑیوں میں پھرتے پھرتے ایک دن میں جھمن وادی کی طرف جانکا۔ راہ میں ایک ویران سے دروازے پر جو نظر پڑی تو میں ٹھنکا۔ دروازے کے پتھر پر ”الصدق“ کندہ تھا۔

میں نے مکان کی طرف دیکھا۔ اف۔۔۔۔۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ٹکائی گویا گلے میں پھندہ بن گئی۔ بالکل وہی وہی الصدق جہاں میں نے رات وہ رات بسر کی تھی۔ وہی سبزھیاں وہی دروازہ اور چوبارہ۔ وہی ”الصدق“ جو اس رات بھور مندر سے کاش گڑھ جانے والی ویران پگڈنڈی پر آ گیا تھا۔

وہ قلعہ نما مکان ویران پڑا تھا۔ صرف چار دیواری کھڑی تھی۔ چھتیں بوسیدہ ہو کر گر گئی تھیں۔

”یہ مکان کس کا ہے؟“ میں نے ایک بیرے سے پوچھا جو ماحقہ کو اثر میں رہتا تھا۔

”معلوم نہیں جناب“ وہ بولا ”یہ تو برسوں سے یونہی ویران پڑا ہے۔“

عین اس وقت وہ بڈھا عیسائی وہاں آ گیا جو پڑوس میں رہتا تھا۔

”یہ مکان؟“ اس نے کھانتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھ میں چمک ابھرائی۔

”ہاں یہی“

”یہ مکان کسی نواب صاحب کا تھا۔“

”اب کیا اس کا کوئی والی وارث نہیں؟“

”اونہوں“ اس نے سر ہلا کر کہا۔ ”مکان پر بجلی کوندی اور سب مر گئے۔ ایک قیامت پھا ہو گئی تھی یہاں اس روز۔ کوئی ساٹھ سال ہوئے ہوں گے۔ صاحب ساٹھ سال۔ میرا مکان پاس ہی ہے وہاں۔ ہاں وہ رات 31 دسمبر کی رات تھی۔ ہم نئے سال کی خوشی میں لگے ہوئے تھے کہ نواب صاحب کا سارا کنبہ تباہ ہو گیا۔“

”تباہ ہو گیا؟“ میں نے دہرایا۔

”ہاں جب سے یہ محل نما مکان ویران پڑا ہے۔“

صاحب ساری رات نہ جانے کیا کیا چیخ پکار سنائی دیتی ہے۔ کبھی کوئی آزاد آزاد چیتا ہے۔ کبھی بیگم بیگم اور کبھی قیدیوں کو آزاد کر

دو۔“ میرا بولا

”اس نواب کا کیا نام تھا؟ بڑے میاں تمہیں یاد ہے کیا؟“ میں نے شوق سے مہبوت ہو کر پوچھا۔

ایک منٹ کے لئے بڑھا خاموش رہا۔

”ہاں ایسا ہی تھا کچھ نواب دولہا۔۔۔۔۔ آصف دولہا“

”آصف الدولہ“ حیرانی سے میری چیخ نکل گئی۔

”آزاد کر دو۔“ مکان سے کوئی چگا در چیتا ہوئی اڑی۔۔۔۔۔ ”آزاد کر دو۔“



راں ٹیاں

”ہائیں۔۔۔۔۔! پھول دار لہنگے والے نے مونچھیں مروڑتے ہوئے کہا ”سچ؟“
 ”ہاں“ بڈھے نے داڑھی جھاڑ کر کہا۔ ”سب کار کھر کھاؤ اکیلی کرے ہے وہ بدرائ۔“
 ”گھر میں کوئی نہیں کیا؟“

”بھی کھیت پر رہیں ہیں۔ بھائی، باپو چاچا۔۔۔۔۔ ساری بستی میں چار ایک مرد ہوں گے۔ ویسے تو آتے جاتے رہتے ہیں
 ہفتے میں ایک بار۔“

”اچھا“ نو جوان ہنسا۔۔۔۔۔ ”معلوم ہوتا ہے انہیں کوئی ملا نہیں۔“

بڈھا قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”میاں یہ راں ٹیاں ہے۔۔۔۔۔ راں ٹیاں سمجھے۔۔۔۔۔؟“ وہ پھر ہنسنے لگا۔ اپنے چودھری کا گھر
 سونے سے بھرا ہے۔ پریوں سمجھو جیسے مندر میں مورتی۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ لو وہ ریا کنواں۔ درختوں کے اس
 جھنڈ میں ہے۔ پی لو پانی جا کر اس جھنڈ میں۔ اللہ بلی۔“ یہ کہہ کر بڈھا ڈنڈی پر اتر گیا۔

”بدرائ۔۔۔۔۔!“ نو جوان مسکرا دیا۔ لہنگا سوار کر مونچھوں کو تادیتے ہوئے زیر لب بولا ”راں ٹیاں کی بدرائ۔“

”راں ٹیاں ہو اور راں ٹیاں آں آں۔“

دور کہیں سے پہاڑی کی تان سنائی دی۔

”جس جاں ٹیاں اوس نہ ماں ٹیاں۔ جس ماں ٹیاں ان جانڑیاں۔“

”راں ٹیاں۔ ہو اور راں ٹیاں۔ آں آں۔“

چناب کے شمال مغرب میں چلے جاؤ تو چٹن وال سے آگے درختوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے اور قد چھوٹا۔ درختوں کے جھنڈ اور
 گاؤں سرک سرک کر دور ہٹتے جاتے ہیں۔ زمین پتھر ملی ہوتی جاتی ہے اور مٹی کا رنگ لاکھا۔ یہ علاقہ پلچھی کا ہے جس کے عین وسط میں
 راں ٹیاں کا گاؤں آباد ہے۔

گاؤں کے ارد گرد خود رو گلابی کی جھاڑیاں دیکھ کر یقین نہیں پڑتا کہ اس زمین میں کاشت کرنے کے لئے اس قدر مشقت کی

ضرورت پڑتی ہوگی، لیکن وہاں کے مردوں کو دیکھ کر اجنبی راہ گیر ایک ساعت کے لئے رک جاتے ہیں۔ اونچا لمبا قد، ابھرتی چھاتی، فراخ شانے، پٹھوں میں موروثی جدوجہد کا تناؤ، آنکھ میں ردعمل کی جھلک۔۔۔۔۔ شاید کامیابی۔ اور عورتوں کو دیکھ کر بھی دیکھتے انہیں۔ چونکہ وہ پردہ و پردہ نہیں جانتیں، لیکن وہی تناؤ، قد و قامت۔ شاہانہ چال، نڈر آنکھیں جو شرما کر کسی دعوت دینے کے فن سے بیگانہ ہیں اور بھرا بھرا منیا جسم گھبرا کر یا سٹ کر راہ گیر کی توجہ اکسانے سے بے نیاز ہے ان کی آنکھ چھلکی ہوئی ہونے کے باوجود چھلکتی نہیں۔ سرخ ہونے کے باوجود گال شرم سے متمتاتے نہیں۔ شاید راں ٹریاں کے مردوں نے ان کے نسوانی پہلو کو عریاں دیکھا ہو۔ لیکن اجنبی۔۔۔۔۔ اجنبی کو تو وہ یوں دیکھتی ہیں جیسے سڑک پر گڑا ہوا کھمبا۔ شاید اسی لئے اس علاقے کی عورتوں کو راں ٹریاں کہتے ہیں۔ بہر حال پلپھی کی عورتیں واقعی راں ٹریاں ہیں اور راں ٹریاں کی ہر عورت ملکہ۔

وہ سرمہ، سیندور اور اخروٹ کے چھلکے کی شوقین ہیں۔ رنگ دار کپڑوں کی دالہ اور خوشبو۔۔۔۔۔ خوشبو سے تو انہیں عشق ہے عشق۔ حتیٰ کہ لونگ ابا لے پانی بغیر نہاتی نہیں۔ شاید اسی لئے انہیں راں ٹریاں کہا جاتا ہے۔ لیکن اس نفیس مزاجی کے باوجود ان کے انداز میں نسائی نمائش نہیں، دعوت نہیں۔ جیسے مندر ہو، مورتی ہو، پوجا کا سامان ہو، سیس نوانے کی آ گیانہ ہو۔

شاید ان کا ”عورت“ کو چھپائے رکھنا تلاش پر مائل کرنے کا انوکھا انداز ہو لیکن راں ٹریاں کے مرد متلاشی دکھائی نہیں دیتے۔ ان میں جستجو کی بے تابی نہیں بلکہ پالینے کا نشہ ہے۔ وہ عموماً اپنی زمین پر رہتی ہیں۔ انہیں اس پتھریلی زمین کو تسخیر کرنے کا شوق ہے اور اپنی رنگین مگر سنگین راں ٹریاں پر بھروسہ ہے۔

قاسو پہلی مرتبہ اس علاقہ میں آیا تھا۔ ویسے تو بیلی پر سوار ہو کر رات رات میں سو سو میل کا سفر کرنا اس کا شغل تھا، لیکن عموماً پو پھونٹنے سے پہلے وہ اپنے گاؤں میں واپس پہنچ جایا کرتا تھا۔ جاکھڑاں کے گرد و نواح میں کون تھا جو قاسو اور بیلی کو نہ جانتا تھا لیکن وہ سب اس کے متعلق اظہار خیال کرنے سے گریز کرتے تھے۔ بہر حال ہر کوئی کوشش کرتا کہ قاسو کے بارے میں لاعلمی ظاہر کرے۔ آدھی رات کو لوگ بیلی کا ہنہانا سنتے، ٹھنک جاتے اور پھر معابات ٹالنے کے لئے کوئی موضوع چھیڑ دیتے۔ پو پھنٹنے وقت ہل چلاتے ہوئے کسان قاسو کی تان سن پاتے تو دوسری جانب منہ موڑ کر شدت سے کام میں مصروف ہو جاتے۔ ”تت تا۔۔۔۔۔ تت تا“ چلتے ہوئے بیلوں کو ہانکنا شروع کر دیتے۔ عورتیں معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسری کی طرف دیکھتی ڈر کر دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیتیں اور بالآخر مسکرا کر دہی بلونے میں مصروف ہو جاتیں۔

اس روز قاسو اور بیلی نو سار کی جانب آئے۔ بھیلی پورہ کے پاس جہاں سے نو سار کو ڈنڈی نکل جاتی ہے، قاسو نے بیلی کو موڑنے

کے لئے لگام کھینچی لیکن خلاف معمول بیلی اڑ کر کھڑا ہو گیا۔ قاسو نے دوسری مرتبہ اسے موڑا تو وہ بدک کر رک گیا۔ قاسو نے غصے میں ایڑ لگائی۔ تو بھی اپنی جگہ سے نہ سرکا۔ پھر نہ جانے کیا خیال آیا۔ قاسو نے اسے گردن پر تھپکی دی اور بولا ”اچھا بیلیا! تیری مرضی نہیں تو نہ سہی۔ آج قاسو بیلی کی مرضی پر چلے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے لگام ہاتھ سے پھینک دی اور بیلی ہوا ہو گیا۔ اندھیرے میں قاسو کو معلوم نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ لیکن اسے یقین تھا کہ بیلی اسے واپس لے آئے گا۔ اس لئے وہ بے پرواہی سے بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ وہ راں ریاں آ پہنچے۔ بیلی رک گیا اور قاسو نے پگڑی سر تلے رکھی اور سو گیا۔ شام کو وہ جاگا تو اسے بڑی شدت کی پیاس لگی تھی۔ پانی پینے کے لئے خشک درختوں کے اس ویران جھنڈ سے باہر نکلا تو اس بڑھے سے ملاقات ہو گئی۔

”راں ٹیاں۔۔۔۔۔ہو راں ٹیاں“

”کن جاں ٹریاں نے کن ماں ٹریاں“

یانی عینے کے بعد مونچھ مروڑتا ہوا وہ گاؤں کی طرف چل دیا۔

قاسوڈ یوزھی سے ہوتا ہوا ایک کھلے صحن میں پہنچا۔ ”چودھری!“ اس نے آواز دی۔ ”کون ہے؟“ بدرائے نے سرسری طور پر آواز دی اور چرخہ کا تنے میں لگی رہی۔ قاسو نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سفید سفید بھرے ہوئے ہاتھ میں تاگا اور حرکت میں بے نام سی چلک۔۔۔۔۔ نساہیت کا پتہ دے رہے تھے۔ سر اٹھائے بغیر بدرائے نے دوپٹے کو سر کا کر ماتھا ڈھانپ لیا اور بولی ”کون ہے؟“

”پیارا لگی ہے۔“ قاسم دوروازے میں کھڑا ہو گیا۔

وہ اٹھ بیٹھی ”لسی پیو گے ویر یا دودھ؟“

”لسی“ قاسونے اس کے ہاتھ کی چوڑیوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

”بیٹھ جاؤ ویر“ بدر اراں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پیڑھی ادھر سرکا دی اور گزوا اٹھا چائی کے قریب جا بیٹھی۔ اس نے اتنی بڑی چائی کو یوں اٹھا لیا گویا وہ تنکوں کی بنی ہو ”میٹھا گراؤں یا نمک“ کیوں ویر؟“

”نہیں نہیں“ نمک نہیں“ وہ چونک کر بولا۔

اجنبی کی آواز میں اضطراب کی جھلک پا کر اس نے آنکھ اٹھا کر پہلی مرتبہ غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ٹمکنی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس بات پر بدراں کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی۔ ”میٹھا ڈال دو؟“ وہ منہ موڑ کر بولی۔

”نہیں“ قاسو نے جواب دیا۔ ”ایسے ہی دے دے۔“

بدرائے نے منہ موڑے بغیر گڑوا ادھر بڑھا دیا۔ دو ایک ساعت وہ یونہی گڑوا لئے کھڑی رہی۔ لیکن اجنبی نے گڑوا نہ پکڑا۔ بدرائے نے مڑ کر دیکھا، وہ حریص نگاہوں سے اس کے کڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ ماتھے کی تیوری اتر گئی۔ ”لے ویر لسی“ وہ بولی۔ گڑوا دے کر وہ اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور آنکھ بچا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ گڑوے کے کنارے کی اوٹ لے کر مکان کا جائزہ لے رہا تھا۔

”پر دیسی ہوویر؟“ بدرائے نے سرسری طور پر پوچھا۔ ”کہیں دور جانا ہے؟“

”نہیں نہیں، ادھر ہی کام تھا۔“

”راں ڈیاں میں؟“

”ہاں ہاں، یہاں پاس ہی ادھر۔“

”اب روٹی کھا کر ہی جانا ویر“

”روٹی۔۔۔۔۔ نہیں نہیں، مجھے جلدی ہے۔“ غنا غٹ لسی پی کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ”یہ لو۔“ اس نے گڑوا بڑھایا۔

وہ بیٹھی رہی۔ غالباً وہ اسے دعوت دے رہی تھی کہ گڑوا زمین پر رکھ دے لیکن اسے منتظر دیکھ کر بدرائے کو اٹھنا ہی پڑا۔ گڑوا پکڑاتے ہوئے اس نے آخری مرتبہ اس کے کڑوں پر نگاہ ڈالی۔

”پسند ہیں ویر؟“ وہ خشک لہجے میں بولی۔

”کیا؟“ وہ چونکا۔

وہ کڑے اتارنے لگی۔ ”یہ کڑے۔۔۔۔۔ میری طرف سے اپنی گھروالی کو دے دینا۔ میری بھابی کو۔“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ”تکلیف نہ کرو، کڑوں کی کیا کمی ہے۔ گھروالی بھی ہو۔“

”کمی نہیں ویر تو اس کام کا فائدہ؟“

”کون سا کام؟“

”میری مانتو تو یہ کام چھوڑ دو۔“

وہ پھر ہنسا۔ ”ہم باکھڑاں والے دان نہیں لیتے۔ ہاتھ کا کمایا کھاتے ہیں۔“ اس نے بازو دکھاتے ہوئے کہا۔

”اسے ہاتھ کا کمایا نہیں کہتے ویر۔“

”اپنا اپنا کام ہے۔ اپنی اپنی بولی۔ تجھے زیادہ فکر ہے تو لا پلا دے نمک والی لسی۔“ اس نے معنی خیز انداز سے کہا۔ ”پھر تو تسلی ہو جائے گی۔“

بدرائے کی آنکھیں انگارہ ہو گئیں۔ ”میں راساں ڈیاں ہوں ویر۔ ہم تسلی نہیں چاہتے، تسلی دیتے ہیں ہم۔ میں نے تجھے ویر کہا ہے، میں پھر بھی لحاظ کروں گی تیرا راساں ڈیاں میں اور کسی نے تجھے ویر نہیں کہا۔ ٹھہر ذرا۔۔۔۔۔ ادھر آ“ اس نے قاسو کو لگا لگا کر۔ وہ ایک بچے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ بدرائے نے صندوق کھولا۔ ”یہ دیکھ۔۔۔۔۔ یہ چوڑیاں، چوک، ہنسی، تعویذ۔“ اور اس نے کڑے اور ہار اتار کر وہیں ڈھیر کر دیئے۔ پھر جلدی جلدی قفل لگا کر چابی طاقچہ میں رکھ کر بولی ”یہاں ہوگی چابی۔ اندر والے صندوق سب کھلے ہیں، دروازے کھلے ہوں گے۔ میں وہاں سوتی ہوں، اس پلنگ پر۔۔۔۔۔ اکیلی۔ جب تیرا جی چاہے آ جائیو ویر۔ صرف جاتے ہوئے مجھے جگا دینا۔ پھر اگر تو گٹھنڑی باہر لے جائے تو تیری اور اگر تو یہاں آنے سے پہلے کسی اور جگہ یہ کام کرے تو اپنے باپ کا نہ ہوگا۔ سنا تو نے؟“

”عورت کے ساتھ شرط باندھوں؟“ وہ ہنسا

”عورت۔۔۔۔۔“ وہ ہنسی۔ ”یہ راں ٹیاں ہے ویڑ راں ٹیاں۔“

”راں ٹیاں۔۔۔۔۔ہوراں ٹیاں“

دور کسی کے گانے کی آواز آئی۔ وہ چونکا۔ جیسے کسی نے اس کی مردانگی کو لاکھا رہا ہو۔

بدراں نے سراٹھایا اور یوں تن کر کھڑی ہو گئی جیسے لڑائی کا ڈھول سن کر بولی ”سورما! جب تیرا جی چاہے آ جائیو۔“

دیوار پھانسنے سے پہلے اسے خیال آیا۔ بھلا آزمائش تو سہی۔ کیا وہ سچ کہتی تھی۔ کیا واقعی دروازہ کھلا ہے اور وہ دروازے کی طرف چلا۔ اف کس قدر اندھیری ہے یہ رات۔ اس نے سوچا۔ آخر عورت ہے نا۔ مسکرا کر اس نے پٹ پر انگلی کا دباؤ دیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ ہوں۔۔۔۔۔ کتا ہوگا۔ کتا۔۔۔۔۔! وہ پھر مسکرایا اور اندر داخل ہو گیا۔ آہٹ کرنے کے باوجود کوئی آواز نہ آئی۔ اونہوں۔۔۔۔۔ اس نے سر ہلایا۔ طاقچہ پر دیا غٹھا رہا تھا۔ پلنگ پر چادر لپیٹے وہ سو رہی تھی۔ اس کے علاوہ مکان خالی پڑا تھا۔ دیئے کے پاس صندوق کی چابی دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی۔

گٹھڑی باندھ کر وہ بدراں کے سرہانے آکھڑا ہوا۔ فضول بے آرام کرنا۔۔۔۔۔ اس نے سوچا۔ جگا بھی دوں تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ معا سے خیال آیا کہ وہ کس قدر نڈرتھی۔ ورنہ یوں بے فکر گہری نیند میں پڑے رہنا آسان کام نہیں۔

قاسو نے بدرائ کی بائیں کلائی پکڑ کر اسے بلایا۔ بدرائ نے کروٹ بدلی لیکن اس کی آنکھ نہ کھلی۔ دوبارہ قاسو کے جھنجھوڑنے پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک ساعت کے لے جوں کی توں پڑی رہی۔ پھر اس نے لپک کر دائیں ہاتھ سے قاسو کی کلائی پکڑ لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بولی ”اب اگر تو کلائی چھڑا لے تو وہ گٹھڑی تیری ہے۔“

وہ ہنس پڑا اور بے پرواہی سے ہاتھ چھڑانے کے لئے جھٹکا دیا۔ لیکن بدرائ کی گرفت اور بھی آہنی ہو گئی۔ ابھی وہ دوسرا جھٹکا دینے کی سوچ رہا تھا کہ بدرائ نے کلائی مروڑ کر اسے چارپائی پر گرالیا۔ ”آرام سے بیٹھ کر ویر۔“ وہ بولی ”لے اب چھڑا۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے کلائی پکڑ کر کہا۔

قاسو غصے سے آگ بگولا ہو گیا لیکن بدرائ کی گرفت بلا کی تھی۔

ایک بار پھر وہ چلائی۔ قاسو نے دوسرے ہاتھ سے اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ اس بات پر وہ بھوکی شیرنی کی طرح اٹھ بیٹھی۔ ”افسوس ہے کہ میں نے تجھے ویر کہا ہے ورنہ۔۔۔۔۔۔“ اس نے قاسو کو دھک دیا اور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ کچھ دیر کے لئے وہ خاموش کھڑا رہا۔

”میں تو تجھے آزمایا تھا۔“ قاسو نے اپنا انداز بدلا۔

”تو آزمادیکھا۔“ وہ اکڑ کر بولی۔

”تو نے مجھے ویر کہا ہے۔“ وہ مسکرایا

”ہاں“ وہ بولی ”ورنہ۔۔۔۔۔۔“

بیلی کے ہنہانے کی آواز سن کر وہ چونکا۔ ”اچھا میں جانتا ہوں۔“

”قول دے پہلے۔“ وہ مسکرائی۔

”اوہوں۔۔۔۔۔۔“ اس نے سر بلایا۔ ”مجھ سے نبھایا نہ جائے گا۔“

”اچھا“ وہ سوچ کر بولی ”نہ سہی“

”ادھر نہ آؤں گا کبھی راتیں ٹیاں کو۔“

”تو دودھ پی کر جا۔“

”ضروری ہے کیا؟“

”ہاں“ وہ بولی ”یا قول دے یا دودھ پی کر جا یہاں کی ریت ہے۔“

”اچھا“ وہ بیٹھ گیا ”لاؤ وہ“

بدراں اٹھ کر کاڑھنی کی طرف چلی۔ ڈول میں دودھ ڈالا۔ پھر اندر جا کر شکر تلاش کرنے لگی۔ شکر کے علاوہ دودھ میں سبز سا سفوف گھول کر لے آئی۔ قاسونے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

”اوتھوں زہر نہیں۔“ وہ بولی ”ویر کو زہر نہیں دیتے۔“

”اچھا، راس ٹی“ وہ بولا ”جو چاہے دے دے اب کیا ہے۔“ اور غنا غٹ پی گیا اور پھر ”اللہ بلی“ کہہ کر وہ صحن کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

جا کھڑاں کے لوگ چند دن تو خاموش رہے۔ پھر دبی دبی باتیں شروع ہو گئیں۔ کسی نے کہا ”میں کہتی ہوں تم نے سنا کچھ؟ اب تو بلی ساری ساری رات گلیوں میں جھنٹا تا رہتا ہے۔“ کوئی بولی ”اچھا نہ ہوگا“ اللہ مارا“ تیسری نے کہا ”اوں۔۔۔۔۔ اچھا نہ ہوگا“ بھلا چنگا پھرتا ہے۔“

رات کے وقت ہر آہٹ پر کسانوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ پھر کوئی بول اٹھتا ”اوہ۔۔۔۔۔ یہ تو یگی چلا رہی ہے۔ صبح سویرے پو پھونٹنے کے وقت وہ متوقع نظروں سے دیکھتے اور پھر دارے میں جا کر چہ میگوئیاں کرتے۔“ چھوڑ دیا اپنا کام۔ بھی اللہ ہی جانے۔ کہتے ہیں رات بھر پیر جیلانی کے روضہ پر سو یا تھا۔“ ”بس یہ تو پیتے کی کی تو نے“ اجی بڑی کرا متے والے ہیں وہ۔“

ہر جگہ قاسو کی بات چھڑ جاتی۔ اس ہر بات میں قاسو کی اس تبدیلی کا ذکر نکلتا۔ قاسو کے متعلق پہلے جس قدر چپ رہتے تھے، وہ اب اسی قدر زیادہ باتیں کرنے لگے۔

قاسو کا بھائی ماجو آپ حیران تھا۔ اگرچہ قاسو کے دھندے کے حق میں نہ تھا مگر اب اس کے اسے چھوڑ دینے پر یوں چڑ گیا جیسے اسے قاسو کی وہ تبدیلی اچھی نہ لگی ہو۔ یا شاید اسے یہ شکایت تھی کہ قاسو نے اپنے بھائی سے ساری حقیقت کہہ دی۔

”لیکن آخر تھا کیا اس دودھ میں؟“ ماجو نے پوچھا۔

”معلوم نہیں“ قاسونے آہ بھر کر کہا۔ ”جب سے بدن میں جا نہیں ہمت نہیں رہی۔“

”ہمت نہیں رہی؟“

”ہاں جیسے چوڑیاں پہن لی ہوں میں نے۔“ وہ ہر خند ہمیں ہنسا۔

”کیوں عورت بن گئے ہو کیا؟“

”اس سے بھی بدتر۔“ قاسونے شرم سے سر جھکا لیا۔

”قاسو۔۔۔۔۔؟“ ما جو حقیقت حال جان کر چلایا۔

”ہاں ماجو“ قاسویوں خاموش ہو گیا جیسے کسی جرم کا اقبال کر لیا ہو۔

”لیکن۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ کیا تم نے اس پر ہاتھ۔۔۔۔۔؟“

”اونہوں“ وہ بولا ”میں نے اپنی ہار تک مان لی۔ میں نے اسے بہن کہا۔“

”پر کیوں؟“

”یہ نہیں“

”تعجب ہے، تمہیں ایسا بنا دینے سے اسے کیا ملا۔ حرام زادی۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ وفتنا وہ رک گیا اور خاموش ہو رہا۔

اس وقت ماجو کے دل میں ایک خاموش جذبہ پرورش پانے لگا۔ کوئی ارادہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

رات بھر وہ سو نہ سکا۔ دن بھر کھیت پر کچھ کام نہ کر سکا۔ پھر وہ مادو قصائی کے پاس جا بیٹھا اور تفریحاً ایک چھری تیز کرنے لگا اور گھمڑا تے ہوئے ان جانے میں چھری ہاتھ میں لئے چلا آیا۔ ”اونہوں۔۔۔۔۔۔“ وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ ”یہ چھری“ اس نے چھری کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ چھری کام نہ آئے گی۔“ اور وہ مادو کی طرف لوٹا۔ چھری لوٹا نے گیا تو مادو سے پوچھنے لگا۔ ”مادو کوئی ایسی چیز ہے کیا جو کسی کو بے ہوش کر دے۔“

”کیوں؟“ مادونے پوچھا۔

”ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔“

”صدمہ کے پاس ہے۔ صدمہ نائی کے پاس۔“ مادو بولا ”فوراً بے ہوش ہو جائے، بس سو گھنٹے کی دیر ہے۔“ ”کیا چیز ہے؟“ اس نے پوچھا ”پتہ نہیں۔“ مادو نے کہا ”سرکاری چیز ہے کوئی۔ دوا خانے کی ڈبیا میں بند کر کے رکھتا ہے صدمہ“

رات کو چارپائی پر پڑے پڑے نہ جانے وہ کیا کیا سوچتا رہا۔ اور پھر خواب میں ایک اونچی لمبی عورت بے ہوش پڑی تھی۔ اور وہ غصے میں ایسے بھائی قاسم سے کہہ رہا تھا ”یہی ہے نا وہ؟“

اور قاسوم نہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ جاگ اٹھا۔ ”جاؤں گا۔۔۔۔۔ ضرور جاؤں گا۔“

اندھیرے میں دبے پاؤں سرک سرک کر وہ بدراں کے مکان کے دالان تک جا پہنچا۔ سامنے پنگ پر کوئی سویا ہوا تھا۔ اس نے ایک بڑی سی ڈبیا لہنگے کے پلہ سے نکالی۔ اسے مضبوطی سے تھام کر وہ پھر چوپائے کی طرح چلنے لگا۔ چار پائی کے پاس پہنچا تو بدراں نے کروٹ لی۔ ماجو چار پائی تلے چھپ گیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے سر باہر نکالا۔ بدراں دائیں پہلو پر یوں لیٹی تھی کہ اس کی ناک چار پائی کے سرے کے قریب تھی۔ وہ سرک کر قریب ہو بیٹھا اور ڈبیہ کھولنے لگا۔ پیشتر اس کے کہ وہ ڈھکنا کھولتا۔ اس کے دونوں ہاتھ بدراں کی گرفت میں تھے۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ وہ اٹھ بیٹھی۔ ”مجھے معلوم تھا تو آئے گا۔“ لیکن ماجو کے چہرے کی طرف دیکھ کر ٹھنکی۔ ”تو۔۔۔۔۔ تو کون ہے؟“ وہ بولی ”اونہوں۔۔۔۔۔“ اسے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ کر گنگنائی۔ ”چوری کرنے آیا تھا کیا؟ کر لے چوری کس لئے آیا تھا تو؟“ بدراں نے پوچھا۔ ماجو کو جوش آ گیا۔ بولا ”تیرے لئے۔“

”میرے لئے؟“ وہ حیران ہو گئی۔

”ہاں تجھے لین کے لئے۔“ اس نے دانت پیسے۔

”تو“ بدراں نے نفرت سے ہونٹ نکالے ”اپنی جان کی خیر نہیں کیا؟“

”اونہوں“ ماجو نے نفی میں سر ہلادیا ”ایک روز مرنا تو ہے ہی۔“

”حرام موت“

”نہیں حرام کیوں نہ چلے گی میرے ساتھ تو تجھے مار ڈالوں گا۔ آپ مر جاؤں گا۔“

”بڑا بہادر ہے تو؟ پر یہ ڈبیا کیا ہے۔۔۔۔۔ ہوں؟“

”کچھ ہے ہی نا“

”زہر ہے کیا؟“

”زہر۔۔۔۔۔؟“ وہ مسکرایا۔

”تو پھر؟“ وہ بولی

”دوائی ہے اور کیا“

”دوائی؟“

”ہاں تجھے بے ہوش کرنے کو۔۔۔۔۔ تو سونگھ لیتی تو میں کب سے تجھے اٹھا کر چل دیتا۔“

”اچھا مجھے بے ہوش کر کے لے جانا تھا تو نے“ بڑا بہادر مرد ہے۔“ بدر اراں نے اسے دیوار پر دے پٹھا۔ مابو کھسیانا ہو کر اٹھ بیٹھا۔

”بس یہی ہمت ہے تیری۔ گھر سے راں ڈی لینے آیا تھا۔ ہمت بھی ہے تجھ میں۔“

”نہ سہی“ وہ بولا ”خواہش تو ہے۔“

”تیرے جیسے تو ہمارے کمین ہیں، کمین۔“ وہ غرائی۔

”کمین ہی سہی۔“

”چل دفعہ ہو۔“ وہ بولی ”دور ہو جا یہاں سے جاتا ہے یا نہیں۔“ بدر اں نے اسے پھر دھکا دیا اور وہ دبلیزیر گر پڑا۔ منہ پر خراش

آئی لیکن جلد ہی سنبھل کر اٹھ بیٹھا۔

”جائے گا یا نہیں؟“ وہ پھر غرائی۔

”اچھا“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”پھر سہی“

”تو۔۔۔۔۔“ وہ غصہ سے چلائی اور اسے پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”کون ہے؟“ پڑوس سے دتا بھاگتا ہوا اندر آیا۔ ”کون ہے بدر اے؟“

”کون ہے یہ؟“ دتے نے ماجر کو دیکھ کر بدراں سے پوچھا۔

”پتہ نہیں“ وہ بولی

”چور ہے؟“ دتے نے پوچھا۔

”یو چھو اس سے کہتا ہے تجھے لینے آیا ہوں۔“ وہ ہنسی۔

”تھی؟“

“ہاں”

”حرام خور۔۔۔۔۔“ دتے نے اسکی گردن پر ایک دی۔ اور وہ چکرا کر بدراں کے پاؤں میں آگرا۔

”یا گل ہے کوئی۔“ وہ بولی۔

”خون پی لوں گا اس کا۔۔۔۔۔ میں“ دتا ایک بار پھر اس کی طرف بڑھا۔

ماجو بدراں کی اوٹ لے کر بیٹھ گیا۔ اور یوں اس کا دامن کھینچنے لگا، گویا ماں بچے سے پناہ مانگ رہا ہو۔ ”دے!“ بدراں چلائی ”تو کچھ نہ کہہ اسے میں کر لوں ٹھیک۔۔۔۔۔ دے“ وہ پھر چیخی لیکن دتے نے ایک اور لگائی اسے اور وہ چیخا ”راں ٹی“ ماجو نے اعلانیٰ اس سے پناہ مانگی۔ ”رہنے دے بہادری تو“ وہ دتے کا ہاتھ پکڑ کر بولی ”تو جا“ اس نے دتے کو دروازے کی طرف دھکیلا اور خود رسی لے کر ماجو کو باندھنے لگی۔ یہ دیکھ کر دتا ہنسا بولا ”اچھا جیسے تیری خوشی۔“

”کہتی جو ہوں پاگل ہے کوئی۔۔۔۔۔ سر پھرا۔“

دتا ہنسا اور باہر نکل گیا۔ اسے بندھا ہوا دیکھ کر بدراں کی ہنسی نکل گئی۔ ”مجھے لے جانے کا خط نہیں گیا۔“

”اب تو باندھ دیا ہے مجھے تو نے۔“ ماجو بولا ”بندھے ہوئے کو باندھنے میں بڑی بہادری ہے۔“ اس نے دکھلاوے کی محبت جتائی۔

”اوہ“ وہ ہنسی اور اسے کھولنے لگی ”اچھا اگر میں سو نگھ لیتی اسے تو کیا ہوتا؟“ اس نے ڈبیہ کی طرف اشارہ کیا۔

”بے ہوش ہو جاتی تو۔“

”پھر؟“

”پھر میں گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا تجھے۔“

”سچ“ وہ بولی ”پھر؟“

”پھر۔۔۔۔۔“ وہ گھبرا گیا۔ ”بس“ لیکن عین اس وقت اسے سوچھی۔ ”تو نے میرے بھائی کو نہ جانے کیا پلا دیا ہے۔ اس میں

ہمت نہیں رہی۔ اب سارا گاؤں دشمن ہے۔ ہم کیا کریں؟“

”اچھا“ وہ بولی ”تو اس کا بھائی ہے؟“

”ہاں“ وہ بولا ”جب سے قاسو نے کام چھوڑا ہے۔ سبھی دشمن ہو رہے ہیں۔“

”میں وہاں چلی جاتی۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوتا؟“ وہ بولی۔

”پھر۔۔۔۔۔ پھر ہمیں کیا پرواہ تھی۔“ وہ جوش میں اٹھ بیٹھا۔ ”تو چلی جاتی تو کسی کو ہم پر ہنسنے کی جرات نہ ہوتی۔“

”اچھا“ وہ مسکرائی۔ ”کیا اس ڈبیہ کو سو نگھ لیتی تو واقعی بے ہوش ہو جاتی؟“ اس نے ڈبیہ سے کھیلنے ہوئے کہا اور کھیل ہی کھیل میں

گھوراندھیرا

امرنگھ نے آنکھیں کھول دیں۔ چاروں طرف گاڑھا اندھیرا چھا رہا تھا۔ اندھیرے کے تدرتہ انباروں تلے اسے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ اپنے جسم کو اٹھا نہیں سکتا جیسے اس نے اپنے جسم پر قدرت نہ رہی ہو۔ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔

نہ دیکھنے کے باوجود وہ محسوس کرنے لگا کہ بوجھل اندھیرے کے بادل اس کے ارد گرد جمع ہو رہے تھے۔ اندھیرے کے بڑے بڑے بھیانک ٹکڑے چمکاڈروں کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے۔ اور گدھوں کی طرح اس کے ارد گرد اکٹھے ہوتے جاتے رہے تھے۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

تاریک اندھیرے کا ایک کلبھاڑ اس کی طرف بڑھا۔ پیٹ کے دائیں پہلو میں ایک ٹھیس لگی۔ درد سے وہ بلبلایا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

ہائیں۔۔۔۔۔ وہ حیران رہ گیا۔ بوجھ کے اس بے نام سے احساس کے باوجود وہ یوں اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے اسے سپرنگ لگے ہوں۔ اس نے اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ اس پھیلے ہوئے اندھیرے میں وہ خود بھی سیاہ بادل کے ٹکڑے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ سیال متحرک ٹکڑا۔ یہ بات اس کے لئے حیران کن تھی۔ اس کا نچلا دھڑیولہ لہرا رہا تھا جیسے لگتی پر لٹکا ہوا کپڑا ہوا میں پھڑپھڑاتا ہے۔ امرنگھ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اندھیرا دھندلا ہوا جا رہا تھا۔ اس دھندلے میں سیاہ فرش کی ایک لکیر دور تک جا رہی تھی جس پر یہاں وہاں سیاہ ستون سے کھڑے تھے۔ جن کے سرے پر زرد سے گولے ٹنگے ہوئے تھے۔ جن سے زرد زرد سا دھواں نکل رہا تھا۔ ستونوں کے پیچھے دھندلے دھندلے پردے لٹک رہے تھے۔ جن پر مکانات کے مبہم نقوش دکھائی دے رہے تھے۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ جگہ مانوس تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کون سی جگہ ہے اور وہ اس جگہ کیوں پڑا ہے۔ دفعتاً اس کی توجہ اپنی طرف مبذول ہو گئی لیکن میں؟ میں کون ہوں۔۔۔۔۔؟ وہ سوچنے لگا۔ اسے خیال نہیں پڑتا کہ وہ کون ہے۔ عجیب بات تھی کہ اسے اپنی ذات کے متعلق واضح طور پر کچھ معلوم نہ تھا۔

پاؤم۔۔۔۔۔ پاؤم۔۔۔۔۔ دور موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

پاؤم۔۔۔۔۔ وہ پھر اٹھ بیٹھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ آواز مانوس سی تھی۔ دفعتاً اس کے ذہن میں حرکت ہوئی۔ ریڈیو۔۔۔۔۔ ہاں۔ ہاں وہ خوشی سے چلایا۔ وہ ریڈیو کا سیٹ ٹھیک کر رہا تھا اور اس روز جلد ہی گھر سے آ گیا تھا۔ ٹفن کیرئیر میں اس کا کھانا تھا۔ ہائیں۔۔۔۔۔ وہ دایاں ہاتھ دیکھ کر بولا۔ روٹی کا ڈبہ کہاں گیا۔ وہ لپک کر اٹھ بیٹھا۔ اور آپ ہی آپ بغیر کوشش کئے یوں تیرنے لگا جیسے اندھیرے کے سمندر میں وہ ایک ناؤ ہو۔

دو ر تک ٹفن کیرئیر کا نشان نہ تھا۔

گھوں گھوں۔۔۔۔۔ دور سے کوئی چیز چنچ ہوتی آ رہی تھی۔ سیاہ ڈراؤنی چیز۔ ”اوہ ملٹری کی لاری“ اور سمجھے بغیر وہ ڈر کر درخت کے پیچھے چھپ گیا۔

موٹر میں بندوقیں تانے ہوئے سپاہی دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ فسادات کے دن تھے اور اسے محتاط رہنا چاہیے۔ اس احساس پر چاروں طرف سے سیاہ سائے اس کی طرف لپکنے لگے۔ اس نے بایاں پہلو ٹٹولا۔ کرپان۔۔۔۔۔؟ اس کی کرپان کہاں تھی۔ روٹی کا ڈبہ اور کرپان۔ اب وہ کرپان کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھا۔

دفعۃً وہ رکا۔ سامنے سرخ توپ زمین میں گڑی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ ”اوہ یہ تو پٹرول پمپ ہے۔“ وہ اس کی طرف غور سے دیکھ کر گنگنایا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ کچھ بھی یاد نہ پڑتا تھا۔ چیزیں نئی نئی دکھ رہی تھیں اور وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس ان چیزوں سے دور کا تعلق نہ تھا۔

اس پٹرول پمپ سے تو میں روز گزرا کرتا تھا۔ روز۔۔۔۔۔ کھانے کا ڈبہ اور کرپان اٹھائے۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ کیا ہوا تھا۔۔۔۔۔؟ ہاں وہ سب دکانیں بند کر رہے تھے۔ بھاگ رہے تھے۔ اور چھاپے خانے کا وہ مزدور کھڑا تھا۔ کھڑا گھور رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا۔ میں مزدور سے پوچھوں۔ اس کی طبیعت کیسی ہے۔ لیکن اس کے ماتھے پر تیوری کیوں تھی؟ دفعتاً وہ سب مجھے گھورنے لگے۔ اور پھر ایک سیاہ ڈراؤنی شکل پسلی اور۔۔۔۔۔ میرے پہلو میں بجلی سی چمکی۔ معاً اس نے پہلو میں دردناک ٹیس محسوس کی۔

”پھر کیا ہوا؟“ اس نے بصد مشکل سوچنے کی کوشش کی۔ دھندلکا۔۔۔۔۔ دھندلکا۔ اندھیرا۔۔۔۔۔ وہ سب دور بھاگ رہے تھے۔ جیسے میں بھوت بن گیا تھا۔ بھوت۔۔۔۔۔ اور میں انہیں پاس بلانا چاہتا تھا۔ مجھے اکیلے میں ڈر لگ رہا تھا۔ اور چاروں طرف سے بو جھل اندھیرا میرے گرد جمع ہوا جا رہا تھا۔

وہ چھاپے خانے کا مزدور مجھ سے دور کیوں بھاگ رہا تھا۔ حالانکہ اس روز جب چھاپے خانے پر بم پڑا تھا تو میں نے مزدوروں

سے کس طرح ہمدردی محسوس کی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ جا کر ان سے خیریت پوچھوں۔ پھر۔۔۔۔۔ پھر میں ڈر کیوں گیا تھا۔ کیوں۔۔۔۔۔؟ شاید وہ بھی مجھ سے ڈر گیا ہو۔ میری کرپان سے ڈر گیا ہو۔ لیکن وہ تو میرے مزدور بھائی تھے۔ پھر ڈر کیسا۔ کیوں۔۔۔۔۔ اور کرپان۔۔۔۔۔ وہ تو میں نے اپنے بچاؤ کے لئے پکڑ رکھی تھی۔ کرتار سنگھ کی بات میرے جی لگی تھی۔ جب میں نے پوچھا کرتار تم کرپان کیوں نہیں رکھتے تو وہ بولا تھا ”مجھے شرم آتی ہے“ نہتے لوگوں میں کرپان لئے پھرتے شرم آتی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے ڈر مجھ پر حاوی ہو۔ اس کے بعد مجھے شرم آنے لگی تھی۔ لیکن میں کرپان اٹھالیا کرتا تھا، محض عادت کے طور پر۔“

نہیں نہیں وہ میری کرپان سے نہیں ڈراتا تھا۔ پھر اس نے وہ بجلی سی کیوں گرائی تھی اور وہ ٹیس۔۔۔۔۔ اور پھر سارے جسم میں بند بند میں درد ہورہا تھا۔

ایک بار پھر امر سنگھ نے پہلو میں ٹیس محسوس کی اور درد کی شدت سے وہ ایک تاریک ستون تلے گر کر ڈھیر ہو گیا۔ چاروں طرف سے بوجھل اندھیرے کے انبار تہ در تہ اس کے ارد گرد اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ بڑی بڑی چگاڑیاں پر پھڑ پھڑاتی ہوئی اترنے لگیں۔ گلدھ۔۔۔۔۔

اس کا جسم منوں بوجھل ہو گیا اور اس نے محسوس کیا کہ اسے اپنے جسم پر قدرت نہیں رہی۔ نہ جانے کب تک وہ یونہی پڑا رہا۔ گھٹنگھرو کی آواز سن کر وہ چونکا۔ سامنے سے ایک تانگہ آ رہا تھا۔ تانگہ۔۔۔۔۔؟ اس وقت۔۔۔۔۔؟ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر نہ جانے کس خیال پر اس نے جست بھری اور پھسل کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔“ کوچوان نے لپکتا ہوا سایہ دیکھ کر چلانا شروع کر دیا۔

”نہیں نہیں میں مسلمان نہیں ہوں۔ میں تو کوچوان ہوں کوچوان۔“

”کوچوان؟“ امر سنگھ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”پھر؟“

”پھر۔۔۔۔۔“ کوچوان بولا ”پھر کیا“ میں تو کہہ رہا ہوں میں۔۔۔۔۔ میں تو کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں۔“

”کچھ بھی نہیں۔ اوہ“ امر سنگھ کھوسا گیا۔ ”اور میں میں۔۔۔۔۔“

”تم تم۔۔۔۔۔“ اس نے اس کے کیسوں کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر دفعتاً گھبرا کر چلانے لگا۔ ”نہیں نہیں میں کرشن نگر نہیں جاؤں گا۔ اس دن بھی میں وہاں جانے کے لئے تیار نہ تھا۔“ کوچوان نے یوں بیان کرنا شروع کر دیا جیسے وہ دہلی دہلی ہچکیاں لے رہا ہو۔ ”تیار نہیں تھا حالانکہ وہ دس دس روپے دینے کو تیار تھے۔ لیکن روپے کا کیا جی، چلتی پھرتی چھائوں۔ میں وہاں کبھی نہ جاتا۔ مگر وہ

بڑھیا۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے ماں یاد آ گئی۔ ماں، امر سنگھ کے ہاتھ پر نہ جانے کہاں سے پانی کے قطرے گرے۔ ”انہوں نے اسے امر تر میں۔۔۔۔۔“

”پھر؟“ کوچوان چونکا۔ ”پھر کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں۔ یہ بڑی بڑی دوکانیں، اونچے محل، کچھ بھی نہیں۔“

”لیکن ماں۔۔۔۔۔“ امر سنگھ گنگنا یا۔

”ماں۔۔۔۔۔ وہ بڑھیا۔ آنسوؤں والی بڑھیا۔ میں نے کہا، میں لئے چلتا ہوں تمہیں ماں۔ اور وہ مجھے دعائیں دینے لگی جس طرح میری ماں دعائیں دیا کرتی تھی۔“

”پھر؟“ امر سنگھ نے آہ بھری۔

”پھر پھر۔۔۔۔۔ وہ بہت سے تھے۔ بہت سے۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ وہ بڑھیا انہیں کوس رہی تھی۔ پھر وہ ان کی منتیں کرنے لگی اور آخر رونے لگی۔ لیکن ان پر اثر نہ ہوا۔ ان پر اثر کیوں نہ ہوا؟ لیکن مجھ پر اس کے آنسوؤں کا اثر کیوں ہوا تھا؟ کیوں۔۔۔۔۔ کیا وہ ان کی ماں نہ تھی۔ بولو۔ تم کرشن نگر کے ہو۔ بولو“

”میں۔۔۔۔۔“ امر سنگھ چونکا۔ ”میں۔۔۔۔۔“ اس کے گلے میں گویا آنسو ٹپک رہے تھے۔

”انہوں نے گھسیٹ کر بڑھیا کو اتار لیا اور وہ میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔“ کوچوان نے آہ بھری اور گھوڑا رک گیا۔ اس مظلوم نگاہوں سے کوچوان کی طرف دیکھا اور اور پھر ایک لمبی چیخ ماری۔ ”مجھے مار دیتے تو کوئی حرج نہ تھا۔“ کوچوان بڑبڑایا۔ ”لیکن موتی۔۔۔۔۔ بے زبان موتی پر ہاتھ اٹھانا۔“ اس نے گھوڑے کی طرف پر نرم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا ”موتی تو مسلمان نہ تھا۔“

موتی نے ایک اور چیخ ماری، ڈراؤنی لمبی چیخ اور پھر بدک کر چل پڑا۔

”وہ سب“ کوچوان اپنی ہی دھن میں بولتا گیا۔ ”وہ سب جیوتیہ کے نام پر کانوں پر ہاتھ رکھا کرتے تھے۔ میں جانتا ہوں۔ عمر بھر کرشن نگر کے اڈے پر رہا ہوں۔ پھر انہوں نے موتی پر بھالے کر پان۔۔۔۔۔ دفعتاً وہ چپ ہو گیا۔

چاروں طرف فضا سے سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ موتی کراہتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ امر سنگھ آہیں بھر رہا تھا۔ اور کوچوان دور افق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے افق میں کھو گیا ہو۔ دفعتاً اس نے اپنے ہی آپ گنگنا نا شروع کر دیا۔ ”پھر۔۔۔۔۔ اندھیرا۔ چاروں طرف سے اندھیرا، گھپ اندھیرا۔“

”ٹھہرو“ سڑک پر کھڑا ہوا سپاہی چلایا۔ ”ٹھہرو“

کوچوان نے چونک کر لگام ڈھونڈنا شروع کر دی۔ لیکن ٹانگہ رکنے سے پہلے ہی سپاہی اوپر چڑھ آیا۔
”تم کہاں جا رہے ہو؟“ سپاہی نے حکمانہ انداز سے پوچھا۔

”میں“ کوچوان بولا ”میں کہاں جا رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ کیوں بابو جی؟“ اس نے امر سنگھ سے پوچھا۔

امر سنگھ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ ”میں میں یعنی ہم۔۔۔۔۔۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ سپاہی آپ ہی گنگنا نے لگا۔ ”لیکن مجھے ضرور وہاں پہنچنا چاہیے ورنہ وہ سب بھوک سے مرجائیں گے۔۔۔۔۔۔“

”اوہ۔۔۔۔۔۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔“ مجھے جانا ہے مجھے انہیں بچانا ہے مگر۔۔۔۔۔۔ کہاں جانا ہے۔ کہاں جانا ہے مجھے؟“

”تھانے جانا ہوگا۔“ کوچوان بولا۔

”نہیں نہیں“ وہ بولا ”وہاں سے تو میں آ رہا ہوں۔“

”ہاں ہاں“ امر سنگھ خواہ مخواہ بول پڑا۔

”مجھے کہاں جانا ہے؟“ سنتری نے امر سنگھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”بولو ورنہ وہ سب بھوکے مرجائیں گے۔“

”کیا فرق پڑتا ہے؟“ کوچوان نے آہ بھری۔ ”کیا فرق پڑتا ہے؟“

”نہیں نہیں۔“ سنتری چلایا۔ ”بکونہیں وہاں گئے ہوں نہیں ہے۔ لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔“

”میں تھانے میں رپورٹ کرنے آ رہا تھا۔ ادھر سے نہ جاؤ وہ بولے۔ وہ تمہیں مار دیں گے۔ بے وقوف مجھے رپورٹ کرنی تھی۔

ورنہ وہ سب بھوکے مر جاتے۔“

”پھر؟“ امر سنگھ بولا۔

”پھر چھتوں سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ اور پھر اندھیرا گھپ اندھیرا۔ اور وہ ہنس رہے تھے۔ بے وقوف انہیں معلوم نہ تھا

کہ مجھے ضروری طور پر جانا ہے۔ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ میں ان کو سمجھوں گا۔ مل لیں۔ بغیر وارنٹ کے ہتھکڑی نہ لگائی تو میرا نام

میرا نام۔۔۔۔۔۔ لیکن میرا نام کیا ہے میرا نام۔۔۔۔۔۔ بتاؤ۔۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔۔؟ کہاں جانا ہے مجھے۔۔۔۔۔۔ اور میرا

نام۔۔۔۔۔۔ کیا نام ہے میرا کون ہوں میں؟ بولو۔۔۔۔۔۔ نہیں بتاتے۔ اچھا میں تمہارا چالان کروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ تانگے

سے اتر گیا اور چلانے لگا۔ ”ٹھہر ٹھہرو“

موتی نے ایک اور چیخ ماری اور بدک کر بھاگا۔

”نہیں نہیں“ کوچوان چلایا۔ ”ہم کرشن نگر نہیں جائیں گے بیٹے! ہم تو شاہ عالمی جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ شاہ عالمی۔“

”شاہ عالمی نہ جانا، شاہ عالمی نہ جانا۔“ کسی نے بڑھ کر گھوڑے کی لگام تھام لی۔

”شاہ عالمی“ نوچوان پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ ”اف۔۔۔۔۔ آگ، آگ“

”آگ“ امر سنگھ چلایا۔

”بھگوان“ نوچوان غصے سے بولا ”نہیں نہیں بھگوان تو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب تو یہاں شیطان بستے ہیں۔۔۔۔۔“

شیطان۔ بھگوان کی دنیا میں اینٹوں سے شعلے نہیں نکلتے۔“

”ہاں“ امر سنگھ گنگنایا۔ ”یہ شیطان کی دنیا ہے۔ بھاگ چلو، بھاگ چلو۔“

نوچوان قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔ رام لال بھاگا تھا۔ وہ بھاگ کر کھڑکی سے اترنے

لگا۔ اف گولیوں کی بو چھاڑ۔ پٹاک پٹاخ اور ننھا مادھو۔ اسے کیا معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ آتش بازی چل رہی ہے اور

پھر وہ خود اتار کی طرح چلنے لگا۔ دھڑا۔۔۔۔۔ دھڑا۔ بھگوان۔

”پھر؟“ کوچوان نے کہا۔

”پھر۔۔۔۔۔“ وہ چونکا۔ ”پھر دیواریں مل گئیں۔ آسمان گر گیا۔ زمین۔۔۔۔۔ زمین۔ اندھیرا، گھپ اندھیرا، ٹھہرو

ٹھہرو۔“ دفعتاً وہ چلایا۔ ”دینا مجھے دینے کو بچانا ہے۔ دینا، دینا۔“ وہ چلاتا ہوا چلا گیا۔ دور سے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ”دینا

دینا“

کوچوان ہاتھ میں باگ پکڑے بالکل چپ چاپ بیٹھا تھا۔ امر سنگھ ہونٹوں میں کچھ گنگنارہا تھا۔ موتی منہ اٹھائے افق کی طرف

گھور رہا تھا۔ وہ سب یوں ساکت تھے جیسے کپڑے پر تصویر کھینچی ہو۔

”دینو۔۔۔۔۔“ کسی نے دینو کو پکارا۔ ایک بڑھیا نہ جانے کہاں سے آ گئی۔

”کہاں ہے میرا دینو؟“ وہ ٹانگے کے پاس آ کر رک گئی۔ اور پھر امر سنگھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”تمہیں نے دینو کو مارا ہے۔ تم

اس کے قاتل ہو۔ تم۔۔۔۔۔ مارو مجھے بھی مارو۔“ وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔

”نہیں نہیں“ امر سنگھ گنگناتا رہا۔

”پکڑ لو“ وہ کوچوان کی طرف لپکی۔ ”پکڑ لو۔ یہ قاتل ہے۔“

کوچوان چپ چاپ بیٹھا اس کا منہ تکتا رہا۔

”کوئی نہیں سنا، کوئی نہیں۔“ وہ چلانے لگی۔ ”انہوں نے بھی کچھ نہیں سنا تھا۔۔۔۔۔ ان کی لمبی لمبی داڑھیاں تھیں، خاکی وردیاں۔ انہوں نے پولیس کے بھیس میں ہمیں گھیر لیا۔ اور وہ سب اللہ دتہ، غفوراً رحیم۔۔۔۔۔ سبھی گئے کہ ان کے پاس شکایت کریں۔ میرے اللہ اور۔۔۔۔۔ وہ سب بھون دیئے گئے جیسے مکئی کے دانے ہوں۔ پھر وہ سب ہمارے پاس آ گئے اور ہمیں گھیر لیا۔“

”۔۔۔۔۔ اور دینا مجھے بھی مارو“ وہ پھر چلائی ”دینے کے بغیر میں جی کر کیا کروں گی؟ مجھے بھی مارو۔“ دفعتاً اس نے اپنا سراپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

”ہائے۔۔۔۔۔“ وہ چلائی۔ ”میرا سہاے میرا سہا“ وہ بیٹھ گئی۔ ”میرا سہا میرا سہا“

موتی نے مڑ کر کوچوان کی طرف دیکھا۔ اس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ کوچوان نے آسمان کی طرف دیکھ کر لمبی آہ بھری۔ امر سنگھ مدھم آواز میں کراہنے لگا۔ فضا میں اس کی کراہ گونجی۔ گرد و پیش سے آہوں اور کراہیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔
”دینا دینا“ دور بہت دور سے آواز آئی۔

”دینا“ بڑھیا چونکی۔ ”کہاں ہے میرا دینا۔ کس نے پکارا میرے دینے کو۔“ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”دینا“ بہت دور سے پھر آواز آئی۔

”آئی“ بڑھیا چلائی۔ ”میں آ رہی ہوں آ رہی ہوں۔“ اور وہ دیوانہ دار اندھیرے میں کود کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

دفعۃ موتی نے چیخ ماری اور اٹھ بھاگا۔

ارد گرد اڈتا ہوا۔ بل کھاتا ہوا بوجھل اندھیرا گویا کراہ رہا تھا۔ ستونوں کے اوپر لٹکی ہوئی بتیاں دم توڑ رہی تھیں۔ نیچے سیاہ سڑک
سسکیاں بھر رہی تھی۔

”اسے رکھ لو۔“ بڈھا گڑگڑا رہا تھا۔ ”اسے رکھ لو۔ بھگوان کے لئے لیکن مجھے چھوڑ دو۔ میری جان بخش دو۔ میں تو بوڑھا ہوں، مجھے مار کر کیا لو گے؟“ اس کی حسین پتری حیرانی سے بوڑھے باپ کی باتیں سن رہی تھی۔

”نہیں نہیں یہ میرا بچہ نہیں۔“ بڑھیا چلائی ”نہیں بہن میں سچ کہتی ہوں یہ میرا بچہ نہیں۔“

”میں اسے کہاں تک اٹھائے پھروں۔ میں تو اس کی دیکھ بھال کرتے ہار گئی۔“

بچہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ماں۔۔۔۔۔ اس کے ہونٹ یوں کھلے جیسے ”ماں“ کہنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”سردار جی یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ نہیں نہیں، میرا نام تو کوشلیا ہے۔ یہ دیکو لو، یہ کلائی پر ہندی میں نام۔۔۔۔۔ کوشلیا۔“

”ہاہاہاہا۔۔۔۔۔“ مرد ہنسا ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ سردار جی کا منہ ہوس سے سو جھا ہوا تھا۔ اس کے جونک سے ہونٹ

خون چوسنے کے لئے کوشلیا کی طرف بڑھے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ نہیں نہیں۔“ کوشلیا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔

”میں سکھ نہیں۔“ وہ ہنسا۔ ”مسلمان ہوں، یہ کیس تو دھوکا ہیں۔“

”میں انہیں بتاؤں گا، مجھے اپنوں نے۔۔۔۔۔“ اس کی آواز مدھم ہو گئی۔ دب گئی جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اور ایک

سیاہ فام برہنہ جسم نے اسے اپنے چنگل میں لے لیا۔

تالگہ رک گیا۔

سامنے میا لے اندھیرے میں ایک بہت بڑا پنجرہ رکھا ہوا تھا۔ جس میں سائے متحرک تھے۔ پاس ہی چند قلی بیٹھے تھے۔ دفعتاً

ایک ریڑھی والا آ نکلا۔ اور بے تکلف قلیوں کی طرف بڑھا۔ ہائیں۔۔۔۔۔ امرنگھ نے کلیجہ تھام لیا۔ ”وہ سب کچلے جائیں گے۔“

لیکن ریڑھی گزر گئی اور وہ قلی جوں کے توں بیٹھے تھے۔ امرنگھ حیران رہ گیا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ کتے بلا تکلف دیوار میں سے پھاند

کر ادھر سے ادھر نکل آتے۔ کوئے اڑتے اڑتے موتی کے پیٹ میں سے نکل جاتے جیسے وہاں کوئی کھڑکی کھلتی ہو۔ عجیب بات تھی۔ وہ

سوچنے لگا۔ سوچتا سوچتا وہ قلیوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔

اسے دیکھ کر بڑھا قلی چلایا۔ ”نہیں بھی، تم جانو تمہارا کام۔ ہم سامان نہیں اٹھائیں گے۔“

وہ بھی میری منتیں کرتی تھی۔ منتیں اور مجھے اس پر ترس آ گیا۔ اور وہ صندوق کتنا بھاری تھا۔ وہ صندوق۔۔۔۔۔ وہ میرے

کندھے سے پھسل گیا۔ پھر۔۔۔۔۔ نہ جانے کیا ہوا۔ بادل کڑکا اور بجلی، پھر۔۔۔۔۔ قلی کا چہرہ بھیانک ہو گیا اور پھر ہوا میں

فکڑے سے اڑے اور جیسے سب ہوائی جہاز بن گئے ہوں۔ سبھی۔۔۔۔۔ چاروں طرف ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور مدھم آوازیں۔

نہیں، نہیں، نہیں۔ اور پھر پھر اندھیرا اندھیرا۔

کو۔۔۔۔۔ کوکو۔ گاڑی کے وسل کی آواز سنائی دی۔

”میں جاؤں گا۔ میں جاؤں گا۔“ امر سنگھ چلایا۔ ”میں یہاں نہیں رہوں گا۔“ وہ ہوا میں تیرنے لگا اور آہنی پل کے درمیان سے گزرتا ہوا گاڑی کے پاس جا پہنچا۔ ”امر تسرا امر تسرا“ وہ خوشی سے چلایا۔

”امرتسر“ ایک بھاری اور بھیانک آواز آئی۔ ”امرتسر۔۔۔۔۔“

امرنگھ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ گاڑی کے پائیدان کے پاس پڑا کٹا ہوا سردانت نکال رہا تھا۔ امرنگھ گھبرا گیا۔ گاڑی سے ایک عورت نے سر نکالا۔ اس کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں۔ جس سے ایک بچہ لٹکا ہوا تھا۔ عورت نے اپنی چھاتیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا ”امر تسر-----“

امرنگھ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر بولا ”امر ترس“ اور پھر ڈر کر ایک ڈبے میں گھس گیا۔

ڈبے کی دیواریں سرخ چھینٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ نیچے لہو کی چھنڑیوں میں گوشت کی گٹھڑیاں رکھی تھیں۔ امرنگھ سہم کر ایک طرف ہو گیا۔ سیٹ پر پڑے کٹے ہوئے سرنے آنکھیں کھول دیں۔ امرنگھ کو کھڑے دیکھ کر اس کی آنکھیں اور بھی ابل آئیں۔ ”نہیں نہیں میں مسلمان نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی قسم۔“

سیٹ پر لڑھکتا ہوا وہ نیچے گرا اور پائیدان سے پلیٹ فارم پر جا پڑا۔

”الحمد للہ“ بائیں طرف کے ڈھیر سے ایک بزرگانہ آواز آئی۔ ”الحمد للہ۔ اشہدان لا۔۔۔۔۔“

وفاً ایک شور بلند ہوا۔ گوشت کی گٹھڑیاں حرکت کرنے لگیں۔ اعضاء میں جنبش ہوئی۔

”میری ٹانگ‘میری ٹانگ“

”خدا کے لئے مجھے مار دو مجھے مار دو۔“

”یاکستان۔۔۔۔۔!“

”پاکستان“ باہر پلیٹ فارم سے آواز گونجی۔ امر سنگھ سہم کر باہر کی طرف بھاگا۔ پلیٹ فارم پر انسانی اعضاء ریگ رہے تھے۔

کٹے ہوئے سرر بڑکے گیندوں کی طرح لڑھک رہے تھے۔

”پاکستان“ کتنا ہوا سرگردن کے بل کھڑا ہو کر چلا یا۔ ”ہا ہا ہا ہا۔“ یہ بھیا نک قہقہہ چاروں طرف گونجنے لگا۔ کٹے ہوئے سر کی آنکھوں سے موتی ڈھلک آئے۔

کئے ہوئے بازوؤں والابڈھا مسکرا دیا۔ ”پاکستان“ اس کی مسکراہٹ حسرت آلود تھی۔

”الحمد للہ“ قریب ہی کوئی زیر لب بولا ”الحمد للہ ہم پہنچ گئے۔“

”پہنچ گئے؟“ جوان عورت ہنسی۔ ”پہنچ گئے“ اس کے قبضے میں طنز گونج رہا تھا۔

”شکر ہے“ بڑھیا بولی جو کہنیوں کے بل ریگ رہی تھی۔ اور پھر تھک کر منہ کے بل گر پڑی۔

امر سنگھ نے منہ موڑ لیا۔ ارے اس کے ساتھ کوچوان کھڑا تھا۔ ”کوچوان۔۔۔۔۔“ وہ بولا۔ لیکن کوچوان بڑھیا کی طرف غور

سے دیکھ رہا تھا۔

کوچوان بڑھیا کی طرف بڑھا۔ اور اسے سہارا دیتے ہوئے بولا ”اٹھو۔۔۔۔۔ اٹھو“

”اے اٹھاؤ“ اس نے ساتھ والی جوان عورت کی طرف اشارہ کیا۔ جس کا نچلا دھڑلنگ رہا تھا۔ کوچوان نے محسوس کیا کہ وہ اکیلا

اسے اٹھانے کے لئے کافی نہیں۔ ”تمہارے ساتھی؟“ اس نے عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ساتھی“ جوان عورت نے نفرت سے کہا۔ ”ساتھی وہیں تھے، وہیں۔۔۔۔۔“

”وہیں۔“ کوچوان نے حیرانی سے دہرایا۔

”وہ سامنے کھڑے تھے میرے سامنے۔“ اس کی آواز میں نفرت کی شدت تھی۔ ”وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ ان کی

آنکھیں پھٹ نہ گئیں۔ ایمان، جرات۔۔۔۔۔ جھوٹ سب جھوٹ۔ اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ اور عزت۔“ وہ قبضہ مار کر

ہنسی اور پھر دھڑام سے منہ کے بل گر پڑی۔

”پانی پانی“ وہ اپنا آپ گسیٹے ہوئے بولی۔

امر سنگھ نے چاروں طرف دیکھا۔ سامنے کمرے پر پانی والا دیکھ کر وہ لپک کر ڈبے میں داخل ہو گیا۔ کمر خالی پڑا تھا۔

”نہیں نہیں“ کونے میں دبکا ہوا بچہ چلایا۔ ”مجھے پیاس نہیں لگی۔ میں نے تو پانی نہیں مانگا۔“ وہ رونے لگا ”مجھے نہ مارو میں پانی

نہیں مانگوں گا، نہیں مانگوں گا۔ مجھے پیاس نہیں لگی۔“

”پانی نہیں مانگوں گا۔“ امر سنگھ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں نہیں“ وہ چلایا۔ اس کے سوکھے ہونٹوں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ چلایا۔ اس کے سوکھے ہونٹوں پر پچھڑیاں جم گئیں۔ لکڑی سی زبان باہر آئی۔ ”پاپا پاپا۔۔۔۔۔“ اس کی

آنکھیں پتھر اُنے لگیں۔

”پاپا پاپا۔۔۔۔۔“ سیٹوں تلے سے آوازیں آنے لگیں۔ امرنگھ نے جھک کر سیٹوں تلے نگاہ دوڑائی۔ ”پاپا پاپا۔۔۔۔۔“

بیسوں سوکھے ہوئے ہونٹ حرکت کر رہے تھے۔ زبانیں لٹک رہی تھیں۔ ”پاپا۔“

”نہیں نہیں، میں مسلمان نہیں ہوں۔“ پلیٹ فارم پر کوئی چیخنے لگ۔

”ساتھی۔۔۔۔۔ بابا بابا“ عورت نے قہقہہ لگایا۔

الحمد للہ ہم پاکستان پہنچ گئے۔“

”اشہدان لا الہ۔۔۔۔۔“

امرنگھ نے ایک جست بھری اور فضا میں تیرنے لگا۔ وہ بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دور دور۔۔۔۔۔ جہاں شاہ عالمی نہ ہو، امرتسر نہ ہو، کچھ بھی نہ ہو۔ دور دور۔۔۔۔۔ جہاں وہ آوازیں نہ پہنچ سکیں۔ وہ آوازیں مدھم پڑتی گئیں، مدھم پڑتی گئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا کسی نامعلوم اثر سے بھیگی ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ دور افق کے قریب بجلی چمکتی اور پھر گہرا اندھیرا چھا جاتا۔ نیچے زمین گویا سناں پڑی تھی۔ کبھی کبھی مدھم سی آوازیں سنائی دیتیں جو کبھی تیز ہوتی جاتیں۔ پھر ایک چیخ، پھر خاموشی چھا جاتی۔ اور خاموشی کے پس منظر پر کراہیں اور سسکیاں۔ اور پھر وہی چیخ۔ اور پھر آوازیں اور سرگوشیاں۔

”دینا۔۔۔۔۔ دینا“

”آگ۔۔۔۔۔ آگ“

”میں مسلمان ہوں، دھرم کی قسم میں مسلمان ہوں۔“

”پاکستان۔۔۔۔۔ بابا بابا“

”راولپنڈی، امرتسر، شاہ عالمی۔۔۔۔۔“

”مجھے پیاس نہیں لگی، نہیں نہیں۔ بیسوں سوکھے ہوئے ہونٹوں سے لکڑی سی زبانیں لٹک پڑیں۔“ ”پاپا پاپا“

بھاگتے بھاگتے وہ تھک چکا تھا۔ لیکن وہ آوازیں ختم نہ ہوتی تھیں۔ جیسے اتفاقاً اس کا پیچھا کر رہی ہوں۔ ہار کر امرنگھ نے آنکھیں بند کر لیں اور دھڑام سے نیچے آگرا۔

چاروں طرف کھیت لہرا رہے تھے جن میں مویشی کھڑے چر رہے تھے۔ جن کے پاس ہی بیسوں مویشی زمین پر پڑے ہوئے

تھے۔ ان کے پیٹ پھولے ہوئے تھے۔ جیسے کھا کھا کر گر پڑے ہوں۔ ادھر دھندلے میں گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔ بائیں طرف ایک ٹوٹا ہوا شیڈ تھا۔ جس میں دیا ٹنٹا رہا تھا۔ دور کہیں کتے رو رہے تھے۔ ادھر سڑک کے کنارے گدھ اور چیلیں پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اتنے گدھ۔۔۔۔۔ اتنے گدھ اس نے عمر بھر ایک جگہ نہ دیکھے تھے۔ سڑک پر ٹوٹے ہوئے ٹرک کھڑے تھے۔

وہ پھسل کر سڑک کی طرف چل دیا۔ اور گدھوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ لیکن گدھ جوں کے توں بیٹھے رہے۔ کبھی کبھار کوئی سرکتا تو یوں محسوس ہوتا کہ اس میں جنبش کی ہمت نہیں۔ وہ پر پھڑ پھڑاتا مگر اس کا جسم حرکت نہ کرتا۔ ان کے پاؤں میں گلابی گٹھڑیاں سی پڑی تھیں۔ ان کی چونچیں رنگی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی طبیعت متلانے لگی۔ اور وہ شیڈ کی طرف چل دیا۔

اس نے شیڈ کا دروازہ کھولا۔ طاق پر دیا ٹنٹا رہا تھا۔ دیے کی مدھم روشنی چاروں طرف پڑ رہی تھی۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ایسی ویرانی جو ہنگامے کے عقب میں آتی ہے اور ہیبت ناک خاموشی کو جنم دیتی ہے۔ ایسی خاموشی جس میں سے چیخوں اور سسکیوں کی بو آتی ہے۔

امر سنگھ گھبرا کر باہر نکل رہا تھا کہ دروازے کی اوٹ سے بچہ نکل آیا۔ ”وہ چھو رہی ہے۔“ بچے نے تڑپ کر کہا ”چھو رہی ہے“ جا گی نہیں جا گئی نہیں۔“

”سورہی ہے؟“ امر سنگھ نے حیرانی سے دہرایا۔

”ہاں۔“ وہ بولی ”وہ“ اس نے فرش کے درمیان انگلی سے اشارہ کیا۔

فرش پر وہ پڑی تھی بازو اور ٹانگیں پھیلائے، لیکن کپڑے۔ امر سنگھ نے آنکھیں ملیں۔ سفید جسم، سنہرے بال۔ سرخ رنگ جیسے ہوئی کھیل کر سو گئی ہے۔ اس کی نیلی سو جھی ہوئی چھاتیاں لٹک رہی تھیں۔

”چھو رہی ہے۔“ پکی چلائی۔ پھر وہ بھاگی بھاگی اس کی طرف گئی۔ ”امی امی!۔۔۔۔۔ دیکھا، وہ چھو رہی ہے۔ بیمار ہے امی۔ ہاں۔“

”پیار“ امر سنگھ نے آہ بھری۔

”ہاں“ وہ بولی ”ڈاکو آئے تھے“ لیکن انہوں نے امی کو ڈاکوؤں سے بچا لیا۔ ہاں وہ بڑے اچھے تھے۔ وہ کہتے تھے ”امی ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر انہوں نے امی کو مالش کی۔“

”مالش؟“ اس نے ایک بار پھر غور سے عورت کی طرف دیکھا۔

”وہ سب امی کے پنڈے پر مالش کرتے رہے۔“ وہ بولی ”وہ کہتے تھے امی اچھی ہو کر سونگی ہے۔ وہ بہت اچھے ہیں۔“

امرنگھ نے محسوس کیا، گویا عورت کے ہونٹوں پر تبسم آ رہا ہے۔ طنز بھرا تبسم۔ ”وہ ڈاکٹر کو لینے گئے ہیں۔“ بچی نے کہا۔

”اوہ“ امرنگھ کا سر چکرانے لگا۔ اس اجالے سے تو باہر کا اندھیرا ہی اچھا تھا۔ اور اس معصوم بچی کی بھولی بھالی باتوں سے تو سڑک کے گدھوں کی خاموش حقیقت بیانی کہیں قابل برداشت تھی۔ امرنگھ گھبرا کر باہر نکل آیا۔

”امی امی“ اندر بچی کی آواز آ رہی تھی۔ لیکن وہ دور بھاگا جا رہا تھا۔ دور۔۔۔۔۔ دور۔

”ہائیں“۔۔۔۔۔ وہ حیران رہ گیا۔ سامنے سڑک پر موتی دوڑا جا رہا تھا۔ تانگے میں کوچوان سر تھا مے بیٹھا ہوا تھا۔

”موتی موتی“ وہ چلا یا۔ اور پھر تانگے کے پیچھے بھاگا۔ اور لپک کر سیٹ پر جا بیٹھا۔ کوچوان اپنی ہی دھن میں بیٹھا رہا۔ اسے امرنگھ کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا۔ البتہ موتی مسرت سے ہنسنایا اور پھر نہ جانے کیوں سڑک چھوڑ کر کھیتوں میں ہولیا۔

کھیت ویران پڑے تھے۔ یہاں وہاں مویشی پکی ہوئی گیبوں کے خوشوں پر منہ مار رہے تھے۔ اس کے باوجود گویا وہ کھانے سے گریز کر رہے تھے۔ جیسے کھا کھا کر اکتا گئے ہوں۔ میدانوں میں کتے موتی کو دیکھ کر بھونکنے کی کوشش کرتے لیکن ان کی آواز گلے میں پھنس کر رہ جاتی اور جسم میں حرکت نہ ہوتی۔ مرغیاں زمین پر بچھی ہوئی آنتوں کو پاؤں سے رول رہی تھیں۔ بستیوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دفعتاً موتی رک گیا۔ اس کے رکنے سے امرنگھ تانگے کے نیچے پھسل گیا۔ کوچوان نے چونک کر سر اٹھایا۔ ”نہیں نہیں بیٹے ہم کرشن نگر نہیں جائیں گے، نہیں جائیں گے۔“ لیکن موتی کھڑا رہا۔ دو ایک ساعت کے بعد کوچوان پھر سر کو ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔ امرنگھ تیرتا ہوا گاؤں میں جا پہنچا۔

حویلی کے صدر دروازے پر دراز قد آدمی کھڑا تھا۔ اس نے مونچھوں اور داڑھی کے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر اپنا منہ نکالا اور امرنگھ سے کہنے لگا۔ ”تمہیں شک ہے کیا؟ شک ہے تو آ کر دیکھ لو آؤ“ اس نے حویلی کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرے گھر میں کوئی مسلمان نہیں۔ میں نے کسی مسلمان کو پناہ نہیں دی۔ سنا تم نے۔ جاؤ دوڑ جاؤ یہاں سے۔ بدمعاش، کینے۔“ دراز قد آدمی دوڑ کر حویلی میں گھس گیا اور پھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔

”آہ آہ“ اندر سے آواز آئی۔ ”میرا سر، میرا سر، مجھ کو پکڑو۔ نہیں نہیں، میرے گھر میں کوئی مسلمان نہیں۔“

”کوئی مچھلمان نہیں“ بچے کی آواز آئی۔ ”وہ چھیدہ کے ابا ہیں۔ مچھلمان تو نہیں، وہ بڑے اچھے ہیں۔ چھیدہ میری چھیلی کے ابا۔“ پھر بچے کی ایک لمبی چیخ سنائی دی اور پھر مکان پر سناٹا چھا گیا۔

دفعۃً امر سنگھ کو خیال سا آ یا اور وہ تانگے کی طرف بھاگا۔

اس نے کوچوان کو جھنجھوڑا۔ ”بھاگ جاؤ“ وہ بولا ”تم کرشن نگر آ گئے ہو۔“ موتی نے چیخ ماری اور تڑپ کر ساز توڑ کر بھاگ نکلا۔

”موتی موتی“ کو چوان چلا یا مگر موتی جا چکا تھا۔ کو چوان نے قمیض کے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔

”میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟“ امر سنگھ چلایا ”چلے جاؤ، بھاگ جاؤ۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

”کہاں؟“ کوچوان نے ٹوٹے ہوئے تانگے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”پاکستان“

”پاکستان۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا“ فضا سے قہقہے کی آواز سنائی دی۔

کوچوان نے ٹوٹے ہوئے تانگے کی طرف دیکھا۔ ”موتی“ وہ زیر لب گنگنایا۔ ”میرا ساتھی“

”ساتھی“ اندھیرے سے آواز آئی۔ اور سوچھے ہوئے جسم والی عورت ریختی ہوئی سامنے آگئی۔ ”ساتھی“ وہ ہنسی ”جھوٹ جھوٹ“ وہ

کھڑے تماشا دیکھتے رہے جیسے وہ تماشا ہو۔۔۔۔۔ ”ساتھی“ وہ منہ کے بل گر پڑی۔ اس کے بازو اکڑ گئے۔ گردن مڑ گئی۔

”چھیدہ چھیدہ“ حویلی سے معصوم بچہ نکل آیا۔ ”تمہارے ابا یہاں ہیں۔ یہاں۔۔۔۔۔“ دفعتاً اس کی نگاہ امر سنگھ پر پڑی۔

”نہیں نہیں، وہ مجھ لمان نہیں وہ تو چھیدہ کے ابا ہیں۔“

”چپ۔۔۔۔۔“ وہ بولی۔ ”چپ۔ امی چھوڑ ہی ہے، چھوڑ ہی ہے۔ وہ بڑے اچھے تھے۔ انہوں نے امی کو مالش کی اور امی اچھی ہو

”کرسو گئی۔“

”کو جوان۔۔۔۔۔ کو جوان“ امر سنگھ نے اسے گھسیٹا۔ ”آؤ آؤ بھاگ چلیں۔“ اور وہ دونوں بھاگنے لگے۔

”لیکن کہاں کہاں۔۔۔۔۔؟ کو جوان نے بھاگتے ہوئے امر سنگھ کی طرف دیکھا۔

”کہاں؟“ امرنگھ نے دہرایا اور دفعتاً رک گیا۔

اس کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ راستہ رو کے کھڑی تھی وہ۔

”مجھے مار دو۔“ وہ چلائی ”مار دو مجھے“ اس نے امر سنگھ سے کہا۔ ”میں مسلمان ہوں۔ مجھے مار دو۔“ اس کا حسن اور جوانی دیکھ کر وہ دونوں

ٹھٹھک گئے۔

”تم پاکستان کیوں نہیں چلی جاتی؟“ امر سنگھ حلا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ بولی ”میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔ مجھے قتل کر دو لیکن میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی۔ تمہیں اپنے گرو کی قسم مجھے قتل کر دو۔ مار دو۔ میرا جینا بے کار ہے۔ بے کار۔“

”وہ کہاں ہیں وہ دونوں؟“ وہ بکنے لگی ”میں انہیں یہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ اس کھیت میں وہ دونوں کرپانوں سے لڑ رہے تھے۔ بھائی بھائی لڑ رہے تھے میرے لئے۔“ وہ خاموش ہو گئی اور ایک فخر سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”وہ کون؟“ امر سنگھ نے پوچھا۔

”وہی جو ہمارے گھر آئے تھے۔“ جوان عورت نے ملامت سے اس کی طرف دیکھا جیسے اس کے نہ جاننے پر شکایت کر رہی ہو۔

”انہوں نے میرے پانچوں بھائی شہید کر دیئے اور پھر اماں کی طرف بڑھے۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا۔ میں نے دو پٹہ اتار پھینکا اور اماں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ مجھے مارو مجھے۔ میں مسلمان ہو۔ میں کافروں کے منہ پر تھوکتی ہوں۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ رک گئے۔ اس نے اپنے بھائی سے کہا۔ یہ سب تمہارا مال ہے۔ سب اور یہ۔۔۔۔۔ اس نے میرے کلائی پکڑ لی۔ یہ میرا حصہ ہے۔ یہ کہہ کر وہ گھسیٹا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اور مجھے اس کھیت تک لے آیا۔ یہاں اس نے مڑ کر دیکھا تو چھوٹا پیچھے آ رہا تھا۔ ”ٹھہرو“ سجن سنگھ بولا۔

”اسے مجھے دے دو۔“

”بے وقوف۔“ بڑا چلا یا۔

”جوڑ میرا ہے۔“ وہ بولا

”لیکن وہ مال؟“ بڑے نے کہا

”تھو“ چھوٹے نے تھوک دیا۔ ”میں اس پر تھوکتا ہوں۔“

بڑے نے گھونسہ مارا، چھوٹے نے کرپان نکال لی۔ اور وہ دونوں کرپانوں سے لڑنے لگے۔ اور میں یہاں بیٹھی دیکھتی رہی۔ اور وہ لڑتے رہے میری خاطر۔“

”پھر؟“ امر سنگھ بولا

”پھر سڑک پر موٹر کی اور میں اٹھ کر بھاگی۔ اور وہ لڑتے رہے میرے لئے۔ لڑتے رہے۔ انہوں نے میرے بہن بھائی قتل کر دیئے گھر تباہ کر دیا۔ لیکن انہوں نے مجھے دھوکہ نہیں دیا۔ اور۔۔۔۔۔ اور وہ۔۔۔۔۔ پاکستان کا فریبی اس نے کہا تھا، آؤ میں تمہیں

کیمپ پہنچا دوں۔ اور اور۔۔۔۔۔ میں پاکستان میں پہنچ کر لٹ گئی۔ پاکستان پہنچ کر لٹ گئی۔ نہیں نہیں۔۔۔۔۔ میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی۔ مار دو مجھے۔“

کھیت میں دوکٹی ہوئی سریاں لڑھکنے لگیں۔

”وہ میری ہے۔“ چھوٹا سر بڑے سے ٹکرایا۔

”میری“ بڑا چلایا اور وہ ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔

”بھاگو بھاگو“ امر سنگھ چلایا۔

”کہاں؟“ کوچوان نے اپنے ارد گرد حسرت بھری نگاہ سے دیکھا۔

”نہیں میں نہیں جاؤں گی۔“ حسین عورت چلائی۔ ”پاکستان میں جا کر لٹنے سے یہاں مر جانا بہتر ہے۔“

”نہیں نہیں، جھوٹ ہے۔ یہاں نہ ٹھہرو۔ یہاں نہ رکو۔“ نہ جانے میاں عورت کہاں سے آ کر شور مچانے لگی۔ ”یہ دیکھو میری کلائی پر ہندی۔ شکنتلا میرا نام یہ دیکھو۔“ اس نے امر سنگھ کی طرف کلائی بڑھا دی۔ اس نے اس کی بھی پروا نہ کی۔ وہ مجھے چاہتا تھا۔ وہ میرا بڑوسی تھا۔ لیکن وہ کہنے لگا کہ میں مسلمان ہوں۔ کیس والا مسلمان۔۔۔۔۔۔ باہا با مسلمان۔ باہا با۔۔۔۔۔۔“

وہ ہنسی، زہر خند ہنسی۔۔۔۔۔ ”سب جھوٹ، کوئی مسلمان نہیں۔ کوئی ہندو نہیں“ سکھ نہیں، یہاں درندے بستے ہیں۔ درندے۔“

”یا گل نہ بنو۔“ امر سنگھ چلایا۔ ”بھاگ چلو، بھاگ چلو۔“

”کہاں؟“ کو چوان نے سراٹھایا۔

”جہاں انسان بستے ہوں۔“ وہ پولا

”انسان۔“ دوسری عورت ہنسی۔ ”انسان کہاں ہیں؟ کہاں۔۔۔۔۔ کہیں بھی نہیں۔“

”اوہ“ کو چوان نے پھر سرتھام لیا۔

”میں بھاگوں گی نہیں۔“ ثیابہ عورت چلائی۔ ”نہیں“ مجھے جہنم دینا ہے۔ انسان کو جہنم دینا ہے، میں جہنم دوں گی۔“ اس نے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”جنم دینا ہے؟“ دوسری عورت نے حیرانی سے دیکھا۔

”ہاں میں نے۔۔۔۔۔ تم نے؟ ہم نے۔“

”خدا کرے“ کو چوان بولا۔

”کدا۔۔۔۔۔“ دوسری عورت کھلھلا کر ہنسی۔ ”کاش کہ وہ کچھ کر سکتا۔۔۔۔۔ کاش!“

”میں کروں گی میں۔“ میار چلائی۔ ”انسان۔۔۔۔۔ انسان“

”کس نے پکارا۔۔۔۔۔ کون ہے؟ اس گھور اندھیرے میں؟ لنگوٹی والا لاٹھی پکڑے نہ جانے کہاں سے آ گیا۔ کون۔۔۔۔۔؟“

”انسان“ لنگوٹی والے نے آہ بھری۔

”تم کون ہو؟“ میار نے پوچھا۔

”میں کوئی بھی نہیں، کچھ بھی نہیں۔“ وہ بولا

”کوئی بھی نہیں؟“ کو چوان نے حیرانی سے دیکھا۔

”شانتی شانتی۔“ بڈھے نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ ”نہیں نہیں، بھگوان نہیں۔“

”انسان۔“ وہ چلائی۔ ”میں جنم دے رہی ہوں۔“

”تم۔۔۔۔۔ دھن ہو ماتا۔“ بڈھا بولا اور اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے پر نام کیا۔

”میں تمہاری مدد کروں گی۔“ دوسری عورت بولی۔ اور وہ دونوں کھیت میں گھس گئیں۔

”انسان انسان۔۔۔۔۔“ دور سے آوازیں بلند ہوئیں۔

”انسان انسان۔۔۔۔۔“ گدھ ڈر کر چیخنے لگے۔

”انسان“ گویا لاکھوں بھنورے بجھنہنے لگے اور وہ آواز تیز ہوتی گئی۔ تیز ہوتی گئی۔

”انسان۔۔۔۔۔ انسان۔۔۔۔۔ انسان۔۔۔۔۔ انسان۔۔۔۔۔!“



گڑیا گھر

سفید بنگلے پر ہو کا عالم طاری ہے۔ بنگلے کے نفیس ساز و سامان میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ ریشمیں پردے جوں کے توں لٹکے ہوئے ہیں۔ غالیچے ویسے ہی شوخ رنگ ہیں۔ بنگلے کے افراد حسب معمول اس شوکیس میں کلدار گڑیوں کی طرح چلتے پھرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی حرکات میں وہ روانی نہیں رہی۔ ان کی مسکراہٹوں میں وہ نمائشی چمک نہیں رہی۔ ان کے جملے تو وہی ہیں وہی چمکدار جملے۔ لیکن ان میں وہ شوخی نہیں رہی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی افتاد آ پڑی ہو۔ جیسے سفید بنگلہ شیش محل کے محرابوں سے لڑھک کر غلام گردش میں آگرا ہو۔

شام ہوتے ہی سفید بنگلے کے کمینوں پر تشویش کا عالم چھا جاتا ہے۔ رات کو وہ ہر آہٹ پر گھبرا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ اور ان کے دل دھڑکنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ان میں سے کسی سے پوچھیں تو وہ حیرانی سے آپ کی طرف دیکھے گا اور بس۔

فوضیہ سے پوچھئے تو اس کی آنکھیں دھندلا جائیں گی اور وہ دیوانوں کی طرح آپ کی طرف دیکھنے لگے گی۔ فوضیہ بے چاری بتائے بھی کیا اسے کچھ معلوم بھی ہو۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو نوبت اس حد تک نہ پہنچتی۔ اسے تو ابتدا ہی سے ایسے ریشمیں ماحول میں پالا گیا تھا جہاں بات معلوم ہی نہیں ہو سکتی۔ اس سے کیا پوچھنا اور پھر وہ بے چاری تو بستر پر پڑی رہتی ہے۔ نقاہت کی وجہ سے رنگ زرد ہو چکا ہے۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے ہیں اور گویا وہ اپنے آپ سے جا چکی ہے۔

نوازش سے پوچھئے، تو وہ مونچھ مروڑنے لگے گا۔ اس کی آنکھ میں میلی سی چمک لہرائے گی۔ دفعتاً اپنی حیثیت بھول کر اسے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگے گا لیکن اس کے باوجود وہ آپ کی بات کا جواب نہیں دے گا اور جواب میں کچھ کہے گا بھی تو اسے اصل بات سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ ”پھر کیا ہوا؟“ وہ مسکرائے گا۔ ”رات کو جاگنا پڑتا ہے تو کیا ہوا۔ اپنے لئے کچھ مشکل نہیں، ہم نے تو راتیں آنکھوں میں گزاردی ہیں۔ ہاں کیا پوچھتے ہو اپنی بات، یہ بھی کوئی بات ہے۔ ہونہہ۔“

فوضیہ کی ماں بڑی بیگم سے پوچھتے تو وہ یوں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرے گی جیسے کوئی گرا ہوا شخص فوراً اٹھنے کی کوشش کرتا ہے کہ کوئی دیکھ نہ پائے۔ ”بات کیا ہے؟“ بڑی بیگم درشتی سے کہہ گی۔ ”شکر ہے اس کی جان بچ گئی۔“

ڈاکٹر سے پوچھیے تو وہ جواب دے گا۔ ”ول ول۔۔۔۔۔ شی از آل رامیٹ“ معمولی شاک کا کیس ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔“ اور

سفید بنگلے کے نوکروں سے پوچھئے۔ مگر ان سے کیا پوچھنا۔ وہ تو نوکر ٹھہرے۔ بے چارے خواہ مخواہ سہمے ہوئے ہیں۔
خواہ مخواہ۔۔۔۔۔

آدھی رات کے وقت سفید بنگلے کا وہ پروقار سکوت ٹوٹ جاتا ہے اور بیگم کی خواب گاہ سے چیخوں کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔ نکلی چیخیں جیسے ریشم میں ملبوس گڑیا کپڑے پھاڑ کر مٹلی کیس سے باہر نکل آئی ہو۔ اول تو شریف گھرانے کی بیگم کی خواب گاہ سے آدھی رات کے وقت چیخوں کا سنائی دینا اور پھر بیگم کا نوازش کو پکارنا۔ نوازش ایک معمولی موٹر ڈرائیور۔ نوازش۔۔۔۔۔ بیگم کی آواز بنگلے میں یوں گونجتی ہے جیسے وہ پکار رہی ہو، مٹیں کر رہی ہو۔

فوضیہ کی چیخیں سن کر بڑی بیگم جاگ پڑی ہے۔ آج پھر اس کے ہونٹ ہلتے ہیں اور دل ڈوب جاتا ہے۔ اور وہ محسوس کرتی ہے جیسے نوازش سامنے کھڑا مونچھ مروڑ رہا ہو۔ نوازش ایک معمولی خدمت گزار اس کے روبرو کھڑا ہو کر مونچھ مروڑے۔ اف آپا کی چیخوں کی آواز سن کر آسیہ کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ گھبرا کر پھر سے آنکھیں بند کر کے پڑ جاتی ہے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ جیسے کوئی چیخ ہی نہ رہا ہو۔

نرس بیگم کی چیخ سن کر ایک نظر اس کی طرف دیکھتی ہے اور پھر احتیاط سے کاغذ کی سلپ کی نشانی رکھ کر ناول بند کر دیتی ہے۔ پھر پنجنوں کے بل چل کر خواب گاہ کے دروازے کی چٹخنی کھول کر واپس کرسی پر آ بیٹھتی ہے اور یوں مطمئن ہو کر بیٹھ جاتی ہے جیسے بیگم کی چیخ بھری پکار کر ایک معمولی سی بات ہو۔

بیگم کی چیخوں کی آواز سن کر نوازش پہلے تو گھبرا کر جاگ پڑتا ہے۔ پھر آنکھیں ملے بغیر مسکرانا شروع کر دیتا ہے۔ پھر وہ اپنا اور کوٹ کھونٹی سے اتار کر چوڑے شانوں پر ڈال لیتا ہے اور مونچھ مروڑتا ہوا بیگم کی خواب گاہ کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چل پڑتا ہے۔

خواب گاہ میں داخل ہو کر وہ شان استغنا سے بیگم کی چار پائی کے قریب کھڑا ہو کر کھرج آواز میں کہتا ہے ”بیگم صاحبہ کچھ فکر نہ کرو نوازش تمہارے پاس ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ مونچھ مروڑنے لگتا ہے اور اس کی آنکھوں میں دوویئے روشن ہو جاتے ہیں۔ نوازش کی آواز سن کر بیگم کی چیخیں بند ہو جاتی ہیں۔ آواز بیٹھ جاتی ہے اور وہ زیر لب کہتی ہے۔ ”نوازش وہ آرہے ہیں۔ وہ نوازش۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ”پڑی رہو بیگم پڑی رہو۔“ نوازش تحکمانہ انداز سے کہتا ہے۔ ”جب نوازش یہاں موجود ہے تو کوئی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“۔۔۔۔۔ ”نوازش‘ نوازش“ بیگم کی آواز مدھم پڑ جاتی ہے جیسے کوئی پرائیوٹ بات

کہہ رہی ہو۔ اس کے ہونٹ ہلتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور سفید بنگلے پر ایک بار پھر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔

نوازش ایک نظر بیگم کی طرف دیکھتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں دو شعلے روشن ہوتے ہیں۔ پھر وہ پروقار انداز سے کمرے میں باہر نکل جاتا ہے اور نرس چٹنی بند کر کے پھر سے ”فارا یور ایمر“ کے مطالعے میں کھو جاتی ہے۔

ساتھ والے کمرے میں آسیہ زور سے آنکھیں بند کر لیتی ہے اور پہلو بد لئے لگی ہے اور بڑی بیگم ایک لمبی آہ بھر کر نہ جانے کس سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ اور دور کتے رونے لگتے ہیں جیسے وہ واقعہ کی اہمیت سے واقف ہوں۔ اور نوازش اپنے کمرے میں پہنچ کر لحاف میں بیٹھ کر سگریٹ سلاگ لیتا ہے اور اسے مٹھی میں دبا کر حقے کی طرح کش بھرنے لگتا ہے۔ بار بار چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے ہوئے ان جانے میں گنگناتا ہے۔ ”اب کون تجھے سمجھائے۔“

نوازش نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ بیگم صاحبہ رات کو ڈر کر چیخیں کیوں مارتی ہیں اور خاص طور پر اس کا نام لے کر کیوں پکارتی ہیں۔ اور پھر جب وہ بیگم صاحبہ کی خواب گاہ میں جا کر سے تسلی دیتا ہے تو اس کی آواز سن کر کیوں مطمئن ہو کر سو جاتی ہے۔ وہ اس واقعہ کو خصوصی اہمیت نہیں دیتا بلکہ اب تو وہ اسے ایک دلچسپ کھیل سمجھنے لگا ہے۔ اگرچہ اس کھیل میں وہ اپنے پارٹ کو بے حد اہم سمجھتا ہے۔ اہم تو وہ سمجھنا ہی ہوا کیونکہ بیگم صاحبہ پر کسی اور کی آواز کا اثر نہیں ہوتا بلکہ اس کی دیوانگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ البتہ جب پہلی مرتبہ رات کو بیگم نے چیخیں ماری تھیں تو وہ گھبرا گیا تھا اور یوں بے تحاشا خواب گاہ کی طرف بھاگا تھا جیسے نہ جانے کیا ہو گیا ہو۔ لیکن اب اسے معلوم ہے کہ اس کی آواز سن کر بیگم کا ڈر دور ہو جائے گا۔ جیسی تو بیگم کے سامنے جا کر اس کی آواز میں تحکمانہ لہجہ پیدا ہو جاتا ہے اور خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی وہ ان جانے میں مونچھ مروڑنے لگتا ہے۔

اس بات کے متعلق سفید بنگلے کے کسی فرد نے بھی نہیں سوچا۔ وہ سب تو گھبرائے ہوئے ہیں۔ البتہ ڈاکٹر نے اس بات پر بہت غور کیا تھا۔ اور غور و خوض کرنے کے بعد اعلان کر دیا تھا کہ اس سانحہ سے بیگم کے ذہن کو جھٹکا لگا ہے۔ اور ابھی وہ شاک کی حالت میں ہے۔ آپ جانتے ہیں ایک بار ڈاکٹر کچھ سوچ لے تو اس کے لئے مزید سوچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب روزانہ آ کر مریضہ کو دیکھتے ہیں۔ اس کی نبض مٹولتے ہیں۔ زبان کا رنگ دیکھتے ہیں۔ ٹونمیاں لگاتے ہیں۔ دو ایک سوال پوچھتے ہیں اور پھر ٹیکہ لگا کر نرس کو ہدایات دینے کے بعد اپنا کبس اٹھا کر باہر نکل جاتے ہیں۔

باہر برآمدے میں بڑی بیگم آسیہ اور امجدان کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ”ڈاکٹر صاحب!“ بڑی بیگم انہیں دیکھ کر کہتی

ہیں۔ ”آج پھر ڈاکٹر صاحب“ اور آسہ خوف سے آنکھیں جھپکنے لگتی ہے۔

”ہوں۔۔۔۔۔۔“ ڈاکٹر صاحب یوں سوچ میں پڑ جاتے ہیں جیسے اس واقعہ کا پھر سے جائزہ لے رہے ہوں۔ ایک ساعت کے بعد وہ سراٹھاتے ہیں۔ ”ٹھیک ہو جائے گا۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبرائیے نہیں۔ ابھی شاک کا اثر نہیں گیا۔ میں کل پھر آؤں گا۔ خدا حافظ“

صرف تین کردار اس واقعہ سے متعلق اہم تھے۔ پاؤڈر سے تھپی ہوئی ایک معصوم گڑیا، ایک بے جان کلدار گڈا اور بالآخر ایک جیتا جاگتا نوکیل مونچھ والا میلا سا ڈرائیور۔

گڑیا بالکل ویسی ہی تھی جیسے مال روڈ پر چلتی پھرتی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ وہ پاؤڈر سے اس حد تک تھپی ہوئی تھی جیسے مال روڈ کی گڑیاں ہوتی ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر بھی سرخی کی ایک تہہ چڑھی رہتی تاکہ آتے جاتے لوگ انہیں نظر انداز نہ کر سکیں۔ اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ہونٹوں کو سرخ کرنے سے اس کا مقصد کیا ہے اور راہ چلتے لوگ کیوں اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہیں۔ وہ چاپ موٹر سے باہر نکلتی۔ ایک وقار بھرے انداز سے ادھر ادھر دیکھتی۔ راہ چلتوں کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے اس کی ناک نفرت سے سکڑتی اور پھر وہ چپ چاپ شاپنگ میں مصروف ہو جاتی۔ اسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ سفید چہرے کے پس منظر اس کے ہونٹ خطرے کا نشان بنے ہوئے ہیں اور راہ گیروں کو عورت اور خطرہ دونوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ سوچتی بھی کیوں۔ سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ شوہر صاحب جائیداد تھے، بنگلہ تھا۔ ساز و سامان تھا۔ موٹر تھی۔ میز پر کھانا خود بخود دگ جاتا تھا۔ پرس یوں روپے اگلتا جیسے الدین کا جن تابع فرمان ہو۔ اسے تو صرف ہی تکلیف تھی کہ راہ چلتے لوگ اور وہ بھی عام سے لوگ اس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ پاؤڈر تو وہ صرف اس لئے لگاتی تھی کہ جلد نرم رہے۔ کاجل کی دھار اس لئے کھینچتی تھی کہ بینائی تیز ہو۔ اور ہونٹوں پر سرخی۔۔۔۔۔۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہر بات کی وجہ بیان کی جائے۔ چاہے کسی وجہ سے لگاتی تھی، بس لگاتی تھی۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ جس میں دوسروں کو دخل دینے کا حق نہ تھا۔ مال روڈ کی اس گڑیا کے دل میں کسی کے خلاف بغض یا نفرت نہیں تھی۔ الٹا اسے تو ان پر ترس آتا تھا۔ اور بازاروں میں گھومنے والے عوام کی حالت پر اسے سچے دل سے افسوس ہوتا تھا کہ دیکھنے کے علاوہ انہیں بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں۔ کپڑے پہننے کا ڈھنگ نہیں اور چلنے پھرنے میں ان کی حرکات کس قدر بھدی ہوتی ہیں۔

سماجی گڑیا ہونے کے علاوہ فطری طور پر بھی ایک گڑیا تھی۔ سماجی زندگی نے تو اس پر صرف رنگ و روغن کیا تھا اور جیتے جاگتے میلے عوام سے محفوظ رکھا تھا۔ وہ خوبصورت تھی جیسے کہ فطری گڑیاں ہوتی ہیں۔ مگر وہ خوبصورتی صرف دیکھنے تک ہی محدود تھی۔ گڑیا خانے

نے اس کے جذبات منجمد کر رکھے تھے۔ اور اسے ایسی حسین ساکن جھیل بنادیا تھا جس میں سطحی لہروں کے علاوہ کوئی مدوجزر پیدا نہیں ہوتا۔

وہ ایک ایسے شریف گھرانے میں پیدا ہوئی تھی جہاں بہت سی گڑیاں محملی کیسوں میں رہتی تھیں۔ وہ سب مقررہ وقت پر چلتی پھرتیں۔ مقررہ وقت پر موزوں باتیں کرتیں۔ مقررہ وقت پر باہر جاتیں اور مقررہ وقت پر اپنے اپنے کیسوں میں پڑ کر سو جاتی تھیں۔ ان کی ہر بات مناسب طور پر عمل میں آتی تھی۔ مناسب اور موزوں فقرے انہیں از بر کر دیئے جاتے تھے اور مناسب اور موزوں حالت میں وہ انہیں دہرا دیتی تھیں۔

اس گڑیا سے چند قدموں کے فاصلے پر جیتے جاگتے انسان بھی رہتے تھے۔ مگر اصول کے مطابق ان کی طرف غور سے دیکھنا مناسب نہ تھا۔ بیرالوگ۔۔۔۔۔ چوکیدار لوگ اور خدمت گار کیا اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں غور سے دیکھا جائے۔ ان سے تو صرف خدمت کروائی جاسکتی ہے۔ نوکروں کو چھوڑیئے یہاں تو عزیز و اقارب کو بھی غور سے دیکھنا گناہ تھا۔ غور سے دیکھنا تو ایک غیر مہذبانہ فعل ہے جو دخل در معقولات کے مترادف ہے۔ گڑیا گھر میں تو دیکھنے کی بجائے دکھائی دینے کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اور وہ سب اس کی کوشش میں لگے رہتے تھے کہ اچھے اور پیارے نظر آئیں۔

بچپن ہی سے فوضیہ کو گڑیا گھر کے اصولوں کی پوری تعلیم دی گئی تھی۔ صبح سویرے اسے نہلا یا دھلایا جاتا تھا اور اس کے بال بنا کر ربن لگا کر منہ پر پاؤں سرخی جما کر تیار کر دیا جاتا۔ پھر وہ اپنے جیسی ایک گلابی گڑیا بغل میں دبا کر باغ میں جا بیٹھتی۔ زمین پر نہیں بچہ گاڑی میں۔ یا بید کی اس کرسی پر جو اس کے لئے بنائی گئی تھی۔ زمین پر تو خدمت گاروں کے بچے کھیلا کرتے تھے۔ پھر اس زمین پر وہ کیسے بیٹھ سکتی تھی۔ البتہ تیتری کی طرح وہ باغ میں ادھر ادھر دوڑ سکتی تھی۔ یا مہمانوں کے آنے پر ڈرائنگ روم میں مور کی طرح چل پھر سکتی تھی۔

ڈرائنگ روم کے لئے اسے چند ایک خوبصورت جملے سکھا دیئے گئے تھے۔ مزاج اچھے ہیں۔ تھینک یو۔ آپ کو نظم سناؤں۔ کیسے اچھے ہیں آپ۔ ڈیڈی، مُمی اور شب بخیر۔ جیسے خوبصورت جملے۔ ڈرائنگ روم پر ہی کیا موقوف تھا۔ ان کا تو سارا گھر ایک ڈرائنگ روم تھا۔ سارا دن وہ ڈرائنگ روم میں رہتی اور پھر رات پڑتی تو وہیں ایک کونے میں اسے ایک ریشمیں کیس میں احتیاط سے رکھ دیا جاتا۔ پھر وہ جوان ہو گئی۔ لیکن اس کی زندگی میں کچھ زیادہ فرق پیدا نہ ہوا۔ اگرچہ جسم میں عجیب و غریب قسم کے اضافے ہو گئے۔ سیدھے خطوط گھوم کر گولائیاں اختیار کر گئے۔ اعضاء پھول گئے۔ گندمی رنگ پر سفیدی نے پوش کر دی اور سفیدی میں سرخی کی جھلک

پیدا ہو گئی۔ بال بنانے کا اسٹائل بدل گیا۔ کپڑوں کی وضع قطع بالکل تبدیل ہو گئی۔ ان سکہ بند جملوں میں اضافہ ہو گیا جو گفتگو میں استعمال کئے جاتے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم بہت وسیع ہو گیا اور اس میں بہت سے اور گھرانے بھی شامل ہو گئے اور بہت سے نئے اچلے گدے اس کے حلقے میں داخل ہو گئے۔ اس کی مسکراہٹوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اس کی حرکات میں لے پیدا ہو گئی۔ لیکن ان تمام فروغی باتوں کے باوجود اس کی زندگی میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ خوش نمائندوں کے پھولوں کے علاوہ جو اس نیلی جھیل میں آگ آئے تھے اس کی زندگی وہی ساکن جھیل ہی رہی۔ گویا وہ کسی رنگ دار کیلنڈر پر چھپی ہوئی تصویر ہو۔

پھر جلد ہی ایک نیا کلدار گڈا ان کے ڈرائنگ روم میں آ پہنچا اور وہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہوں سے فوضیہ کو ڈر لگتا تھا لیکن ساتھ ہی عجیب سی لذت بھی محسوس ہوتی۔ پھر اس گڈے نے تنہائی میں اس سے عجیب باتیں کرنا شروع کیں۔ ایسے جملے فوضیہ نے ڈرائنگ روم میں کبھی نہ سنے تھے۔ اور اس نے محسوس کیا جیسے اس کلدار گڈے کے آنے سے ایک نئی انوکھی کھڑکی کھل گئی ہو جس سے ایک انوکھی دنیا کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں۔

اگر چند ماہ کے اندر اندر فوضیہ کی فرخ سے شادی نہ ہو جاتی اور اسے مزید کلدار گڈوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ نہ تو فرخ کی باتوں میں کوئی انوکھی خصوصیت تھی اور نہ اس کی نگاہوں میں کوئی انفرادیت۔ اس کے وہ جملے بظاہر نئے ہونے کے باوجود بے حد پرانے اور سکہ بند تھے اور اس کی نگاہیں بھی صرف دکھانے کی تھیں؛ دیکھنے کی نہیں جنہیں فرخ نے مسلسل عشق سے اپنا رکھا تھا۔ لیکن فوضیہ کو ان تفصیلات کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ انوکھے پن کا وہ سراب اور حقیقت اس لیے تھا کہ اس کی اپنی زندگی میں نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ لہروں کی سی وہ حرکت جو وہ محسوس کرنے لگی تھی، محض سطحی تھی۔ اگر فرخ کی جگہ کوئی اور گڈا دنوں اس سے آ ملتا تو بھی فوضیہ کے احساسات وہی ہوتے۔

شادی کے بعد بھی فوضیہ کی زندگی میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا کیونکہ وہ ایک گڑیا گھر سے نکل کر دوسرے میں چلی گئی۔ جہاں ویسے ہی ریشمیں پردے لٹک رہے تھے۔ ویسے ہی شوکیس رکھے ہوئے تھے۔ ویسا ہی باغیچہ تھا اور ویسے ہی لوگ تھے بلکہ شادی کے بعد تو وہ بالکل گڑیا بن کر رہ گئی۔ اس کے رکھوالوں میں فرخ کا اضافہ ہو گیا جو صبح شام اس کے لئے دروازے کھولتا۔ کرسیاں کھینچتا، جگہ بناتا، کوٹ پہناتا۔۔۔۔۔ اس کا پرس اٹھاتا اور مسکرا کر ڈرائنگ کہنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا۔ اس کے علاوہ اب یہ بیگم فوضیہ بن گئی تھی۔ گو فرخ اسے فزی کہا کرتا تھا اور وہ اپنی فزی کو یوں رکھتا جیسے وہ کانچ کی بنی ہوئی ہو اور اگر احتیاط نہ کی تو ٹوٹ جائے گی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ زیادہ احتیاط سے ٹوٹنے کی صلاحیت اور بڑھ جاتی ہے۔

فرخ کے گھر میں پہلی مرتبہ فوضیہ نے نوازش کو دیکھا۔ لیکن اس کے لئے تو وہ محض شو فر تھا، نوازش نہیں۔ اس نے کبھی اسے دیکھا ہی نہ تھا اور اسے اس بات کا علم نہ ہوا تھا کہ وہ جسم کا دبلا پتلا ہے۔ اس کا قد بے حد موزوں ہے۔ چھاتی چوڑی ہے اور اس کی نوکیلی مونچھیں اور متبسم آنکھیں بے حد شیریں ہیں۔

عام طور پر فوضیہ کو نوازش سے بات چیت کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔ کیونکہ ہر وقت فرخ خود وہاں موجود ہوتا تھا۔ البتہ جب کبھی اسے جائیداد کے انتظامات کے سلسلے میں کراچی جانا پڑتا اور فوضیہ سفید بنگلے میں اکیلی رہ جاتی تو اسے نوازش کو بلانا پڑتا تھا۔ باہر پورچ میں پنہوں کے بل کھڑے اسے چلاتے دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا جیسے کوئی پالتو کول "تو ہو تو ہو" کی رٹ لگا رہی ہے۔

نوازش اس کی آواز سن کر اطمینان سے سگریٹ کے چند آخری کش لگاتا اور پھر اوور کوٹ شانوں پر ڈال کر سیٹی بجاتا ہوا بیگم صاحبہ کی طرف دیکھے بغیر سیدھا گیراج کی طرف چل دیتا۔ اس نے کبھی بیگم سے پوچھنے کی تکلیف نہ کی تھی۔ "کیا حکم ہے حضور؟" نہ ہی کبھی اس نے اسے حضور کہا تھا۔ گیراج سے گاڑی نکال کر وہ پورچ میں لا کھڑا کرتا اور پھر چپ چاپ سگریٹ پیتے ہوئے انتظار کرتا۔ نوازش فطری طور پر موٹر ڈرائیور تھا۔ اس کے کردار میں استغنا کا عنصر حاوی تھا۔ چلتا یوں تھا جیسے بادلوں کا دیوتا زمین پر آ گیا ہو۔ یوں موٹر چلاتا تھا جیسے وہ اس کے ہاتھوں کا ایک کھلونا ہے۔ حرکت اور رفتار کے سلسلے میں اس کی ذہنیت خانہ بدوش کی سی تھی۔ اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ وہ بیگم یا صاحب کا ڈرائیور ہے۔ اس کے برعکس وہ سمجھتا تھا کہ وہ موٹر کا ڈرائیور ہے جو اس کے اشاروں پر چلتی ہے۔

جبھی تو نوازش کی شخصیت میں "جی حضور" کی جھلک تک نہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت چمک لہراتی۔ ہونٹوں پر ایک فلمی دھن کھیلتی اور گردن کے زاویے سے لا پرواہی نمایاں رہتی۔ اس نے کبھی بیگم کو غور سے نہ دیکھا تھا۔ اور نہ اسے اہمیت دی تھی۔ اس کے نزدیک وہ عورت نہیں بلکہ صرف صاحبہ تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کبھی وہ مسکراہٹ نہ چمکی تھی جو عورتوں کو دیکھ کر آپ ہی آپ اس کی آنکھوں میں جھلک آتی تھی۔

ممکن ہے فوضیہ نے دل میں شعوری طور پر اس کا اعتراف کئے بغیر نوازش کی بے پروائی کو محسوس کیا ہو مگر اس نے کبھی اس کا اظہار نہ کیا تھا۔ ایک نوکر کے متعلق سوچنا اس کے نزدیک مناسب نہ تھا۔ صرف ایک بار اس نے نوازش کے خلاف غصہ محسوس کیا تھا۔ اس روز اس کے احساسات مجروح ہو گئے تھے۔ جیسے اس کی توہین ہو گئی ہو اور وہ آدھ گھنٹے تک بل کھاتی رہی تھی۔

ان دنوں فوضیہ نے موٹر چلانے کی مشق شروع کر رکھی تھی۔ اس روز ایک ویران سڑک پر خود موٹر چلا رہی تھی۔ ساتھ والی سیٹ پر

نوازش بیٹھا اپنی ہی دھن میں مونچھ مروڑ رہا تھا۔ موڑ پر ایک تانگے کے آجانے سے دفعتاً فوضیہ کے ہاتھ کاپے۔ موڑ نے جھٹکا کھایا۔ فوراً دو بھدے بھدے بازو اس کے گرد حائل ہو گئے اور اس کے بازوؤں اور ہاتھوں پر نوازش کے بازوؤں کا بوجھ پڑ گیا اور اس کا جسم گرفت میں آ گیا۔ ”بیگم صاحبہ“ نوازش نے اسے ڈانٹا۔ اور دھکا دے کر فوضیہ کو پرے دروازے میں دھکیل دیا اور خود اس کی جگہ لے لی۔ اور بات کئے بغیر موڑ چلانا شروع کر دی۔ پھر یہی نہیں وہ یوں بے پروائی سے ایک فلمی دھن گنگنانے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو جیسے اس کے ساتھ والی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہی نہ ہو۔

وہ پہلا روزہ تھا جب فوضیہ نے محسوس کیا کہ وہ بیگم صاحبہ نہ تھی بلکہ گڑیا تھا جسے ایک بد تمیز نوکر نے زمین پر پھینک دیا۔ اس کے بعد فوضیہ نے پہلی مرتبہ غور سے نوازش کی طرف دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ وہ نوازش تھا شوفر نہیں۔ ”کتنا بد تہذیب ہے۔“ اس نے دل میں کہا تھا۔ اس کے بعد فوضیہ اس واقعہ کو بھولنے کی کوشش میں کھو گئی تھی۔

انہیں دنوں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ ہجوم جلوس کی صورت میں سڑکوں پر گشت لگاتا تھا اور ایک مخصوص فرقے کے خلاف نعرے لگائے جاتے تھے۔ رات کے وقت شور و غل بلند ہوتا۔ اشتعال انگیز نعروں کی آوازیں آتیں اور پھر پکڑ لو، پکڑ لو کا ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ اگرچہ نہ تو فرخ اس مخصوص فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور نہ فوضیہ اور انہیں اس سلسلے میں کوئی خدشہ نہ تھا۔ پھر بھی ان دونوں کو عوام کی اس بد تمیزی پر غصہ آتا تھا۔ فرخ شور و غل سن کر غصے سے بھوت بن جاتا۔ ”جنگلی“ وہ دانت بھیج کر کہتا ”انہیں گولی سے ختم کر دینا چاہیے۔ بد تمیز دیوانے۔۔۔۔۔!“ لیکن رات کے وقت جب کبھی آوازیں بہت قریب آ جاتیں تو وہ غصے کا اظہار کرنا بھول جاتا اور خوف سے کانپنے لگتا۔ ”یہ کیا حماقت ہے۔ فزی ادھر آ جاؤ۔ اور ادھر دیکھو۔ اگر یہ لوگ بنگلے کی طرف آ جائیں تو ہم ادھر سے نوکروں کے کوارٹرز کی طرف چلے جائیں گے۔ وہ جگہ محفوظ ہے سمجھیں بیگم۔ ان فساد یوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ ان کا مطلب تو لوٹنا ہے لوٹنا۔ مذہب تو محض دکھلاوا ہے“ کہیں۔ ”وہ زیر لب کہتا کہ کوئی سن نہ لے۔ فوضیہ حیران ہوتی تھی کہ صبح کے وقت تو فرخ اس قدر غصہ دکھاتا ہے لیکن رات کو چھپنے کے لئے کونے تلاش کرتا ہے۔ بہر حال وہ معمولی سی حیرانی محسوس کرتی اور اسے بھول جاتی۔ کیونکہ اسے خود فساد یوں کے خلاف غصہ آتا تھا۔ اس لئے کہ وہ ان اصولوں سے منحرف ہو رہے تھے جن کے تحت فوضیہ کو تربیت دی گئی تھی۔

پھر فرخ کو کراچی سے ایک ضروری بلاوا آ گیا۔ جانے سے پہلے اس نے فوضیہ کو ہدایات دیں۔ ”فزی ان شر پسندوں کی قطعی پرواہ نہ کرنا۔ یہ ذلیل لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ سمجھیں۔۔۔۔۔ اگر ضرورت پڑے تو پولیس کو فون کر دینا اور اگر وہ بنگلے میں آ داخل ہوں۔ اول تو ان کی جرات نہیں ہو سکتی، لیکن ایسا ہو ہی جائے تو تم نوکروں کے کوارٹروں میں چلی جانا۔ میں انہیں ہدایات دے

جاؤں گا اور چوکیدار اور شوفر یہیں بیٹھنے میں کوئے والے کمرے میں سوئیں گے۔ سمجھیں ڈارلنگ۔“

فرخ کے جانے کے بعد اسی رات ہجوم کا شور و غوغا سن کر فوضیہ جاگ پڑی۔ اور گھبرا کر اس نے چلانا شروع کر دیا۔ ”چوکیدار، چوکیدار“ ہجوم کا شور قریب آتا گیا۔ وہ گھبرا گئی۔ اس حد تک گھبرا گئی کہ وہ تمام اصول بھول گئی۔ ”نوازش۔۔۔۔۔ نوازش“ اس نے پہلی مرتبہ اس کا نام لے کر اسے پکارا۔

شانوں پر بے پروائی سے کوٹ ڈالے نوازش ایک شان استغنا سے اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ ”نوازش۔۔۔۔۔۔
نوازش“ وہ چلانے لگی۔ ”وہ۔۔۔۔۔۔ وہ آ رہے ہیں وہ۔۔۔۔۔۔“

”چلاؤ نہیں بیگم صاحبہ“ اس نے درشتی سے اسے ڈانٹا۔ ”اگر انہوں نے آواز سن لی تو۔۔۔۔۔“

اس کی ڈانٹ سے وہ بوکھلا گئی۔ لیکن ہجوم کا شور قریب تر آچکا تھا۔ اس لئے اس کا غصہ ڈر میں تبدیل ہو گیا۔ ”وہ آ رہے ہیں، وہ آ رہے ہیں۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ”میں پولیس کوفون کرتی ہوں۔“ وہ ٹیلیفون کی طرف بھاگی۔ نوازش اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ”کوئی ضرورت نہیں فون کرنے کی۔“ ”لیکن۔۔۔۔۔۔“ فوضیہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ ”چپ کرو بیگم صاحبہ وہ سن لیں گے۔“ وہ غرایا۔ اس ساکن نیلی جھیل میں پہلی مرتبہ ایک طوفان ابل آیا۔ گویا ایک بہت بڑی بلوئی ساکن نیلے پانی کو بلونے لگی تھی۔

غصے میں اس نے جھٹک کر اپنے ہاتھ چھڑا لئے۔ اور ساتھ والی کرسی پر جا بیٹھی۔ نوازش نے ایک شان استغنا سے سگریٹ سلگایا۔
اسے مٹھی میں تھام کر حقے کی طرح دوکش لگائے اور پھر کھلے دروازے میں جا کھڑا ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ہجوم سفید ہنگے میں داخل ہو گیا۔ ان کے نعروں سے خوابگاہ میں رکھی ہوئی چیزیں لرزنے لگیں۔ نوازش کو دروازے میں بے خبری سے کھڑے دیکھ کر بیگم نے ایک جست عقبی دروازے کی طرف بھری۔ ”میں نوکروں کے کوارٹروں میں۔۔۔۔۔“ ابھی اس کے منہ سے پورا جملہ نہ نکلا تھا کہ نوازش نے لپک کر اسے بچے کی طرح اٹھا لیا اور بستر پر دے مارا۔ ”چپکے سے پڑی رہو بیگم۔“ وہ غصے میں بولا ”کہا جو ہے کہ جب تک نوازش موجود ہے کسی کی جرات نہیں ہے کہ۔۔۔۔۔“

نوازش کی اس گرفت نے نہ جانے کیا کر دیا۔ کسی انجانے شعلے سے بھڑک کر انگارے اڑے اور پھر سمون کر کے پانی میں جا گرے۔ بستر پر گرتے ہی وہ نقاہت محسوس کرنے لگی جیسے صدیوں کی بیمار ہو۔ نیلی جھیل کا وہ طوفان ختم ہو چکا تھا اور گویا ایک لاش کنارے پر آ گئی تھی۔ اب اسے خوف و خطر کا کوئی احساس نہیں رہا تھا۔ باہر ہجوم چلا رہا تھا۔ لیکن وہ یوں نوازش کی طرف غور سے دیکھ

رہی تھی جیسے وہ ہجوم سینما کے پردے کا ہجوم ہو۔ نوازش اطمینان سے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ پھر دفعتاً وہ چلایا ”اے اودہ بنگلے سے باہر نکل جاؤ۔ میں کہتا ہوں، نکل جاؤ۔ کوئی نہیں ہے یہاں۔ جاؤ۔“

ہجوم باہر نکل گیا۔ بنگلے پر موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ نوازش نے ایک نیا سگریٹ سلگایا۔ اور پھر فوضیہ کی طرف دیکھے بغیر بولا ”تم سے جو کہا ہے نیگم کہ جب تک میں یہاں ہوں، کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ ضرورت ہو تو مجھے بلا لینا۔ کنڈی لگا لو۔“ اس کی آواز میں تحکم تھا۔ انداز میں استغنا تھا۔ فوضیہ اس کی بات سن کر یوں کنڈی لگانے کے لئے اٹھی جیسے دفعتاً نیگم سے باندی بن گئی ہو۔ پھر دیر تک وہ چارپائی پر پڑی رہی جیسے بتوار کے بغیر ناؤ سا کن سمندر پر بہے جا رہی ہو۔ بہے جا رہی ہو۔

صبح سویرے جب وہ بیدار ہوئی تو اس کے ارد گرد ایک عجیب لٹا پٹا جہان بکھرا پڑا تھا۔ نیلی جھیل میں ادھر ادھر گڑیا گھر کے ٹکڑے بہہ رہے تھے۔ اصولوں اور قاعدوں کے بت بے جان پڑے تھے۔ تہذیب و تمدن کے دیوتا اوندھے منہ پڑے تھے۔ دیر تک وہ اس ویرانی کو دیکھتی رہی، محسوس کرتی رہی۔ پھر دفعتاً اسے یاد آیا کہ وہ فوضیہ ہے۔ اور ایک تہذیب یافتہ سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے۔ خوف ناک عزم سے وہ اٹھ بیٹھی۔ ایک شدید کوشش سے اس نے اپنے ذہن سے اس ویرانے کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ اور اس شب کے واقعات کو اپنے ذہن کی گہرائیوں میں دفن کر کے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔ اور معاویہ گڑیا اس کے ارد گرد معلق ہو گیا۔ اصولوں کے بت پھر سے قائم ہو گئے۔ تہذیب و تمدن کے دیوتا مسکرانے لگے۔

فرخ کی واپسی پر فوضیہ کو یاد بھی نہ رہا تھا کہ اس شب کیا واقعہ ہوتا تھا۔ اس لئے فرخ کو بتانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ باقی رہا نوازش۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ کسی نوازش کو نہیں جانتی تھی۔ البتہ وہ شو فر۔۔۔۔۔۔ مگر اب اسے موٹر میں بیٹھنے سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ پھر شو فر کون۔۔۔۔۔۔ کیسا شو فر۔۔۔۔۔۔؟

چھ ماہ گزر گئے۔ اصول اور قاعدوں کے بت اپنی اپنی جگہوں پر براجمان رہے جیسے کبھی گرے ہی نہ ہوں۔ تمدن کے دیوتا کی روغنی مسکراہٹیں اور بھی دل آویز ہو گئیں۔ جیسے وہ کبھی دھندلی پڑی ہی نہ ہوں۔ کلدار گڈا دروازے کھولتا رہا، معصوم گڑیا خوبصورت اور ساکن نیلی جھیل میں رنگ دار مچھلی کی طرح تیرتی رہی۔ چھ ماہ گزر گئے۔

پھر ایک روز فرخ نے آ کر فوضیہ سے کہا ”ہم کراچی جا رہے ہیں۔ تم ساتھ چلو گی ڈارلنگ۔ ہم کل میل میں روانہ ہوں گے۔ شو فر کو ساتھ لے جائیں گے۔“ فرخ کا آخری جملہ فوضیہ نے سنا، وہ اسے سننا نہ چاہتی تھی۔

اگلے روز وہ اس میل میں سوار ہو گئے جسے ”ہمبیر“ پر اس تباہ کن حادثے سے دو چار ہونا تھا۔ سینڈ کلاس کے چھوٹے ڈبے میں سارا دن کلدار گڈے کی نگاہیں گڑیا کے گرد گھومتی رہیں اور روغنی گڑیا کا تبسم چلتا رہا۔ پھر وہ لیٹ گئے۔ سینڈ کلاس کے پرنک انہیں تھکنے لگے۔ دفعتاً ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ وہ جاگ پڑی۔ سامنے سرخ شعلے لپک رہے تھے۔ ان شعلوں نے فرخ کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کا چہرہ موت کی گرفت میں بھیا نک ہو رہا تھا۔ فوضیہ نے کوشش کی کہ وہ چیخ مار کر جاگ پڑے۔ وہ اسے خواب سمجھتی تھی۔ مگر اس کے حلق میں گویا آواز نہ تھی۔ شعلے تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر دفعتاً دھڑام سے گاڑی کا دروازہ کھل گیا اور نوازش اس کی طرف لپکا۔ ”نوازش۔۔۔۔۔۔“ اس نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔

چھ ماہ بعد وہ پہلا دن تھا جب اس نے نوازش کو دیکھا تھا۔ نوازش نے اسے اٹھالیا اور دیوانہ وار بھاگا۔ جب اسے ہوش آیا تو نوازش مونچھ مروڑتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔ ”تم فکر نہ کرو بیگم! جب تک میں تمہارے پاس ہوں۔۔۔۔۔۔“ وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ دوسری دفعہ جب اسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھی اور نوازش دروازے میں نرس کے پاس کھڑا مونچھ مروڑ رہا تھا۔

ماں بھائی بہن اور نرس کی موجودگی کے باوجود اب وہ اکیلی اس سفید بنگلے میں سارا دن بستر پر پڑی رہتی ہے۔ سارا دن وہ گڑیا گھر اس کے گرد قائم رہتا ہے۔ اصولوں اور قاعدوں کے بت بے بسی سے اس کی طرف یوں دیکھتے ہیں گویا منتیں کر رہے ہوں۔ تہذیب و تمدن کے دیوتا انگلیاں اٹھائے اسے خبردار کرتے رہتے ہیں۔ مگر جب رات پڑتی ہے تو وہ چیخ کر جاگ اٹھتی ہے۔ اس کی نگاہوں تلے ایک لٹا پٹا جہان بکھرا ہوتا ہے۔ گڑیا گھر کے ٹکڑے نیلی جھیل کے خوفناک طوفان میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجتے ہیں۔ اصولوں اور قاعدوں کے بت اوندھے پڑے ہوتے ہیں۔ اور تہذیب و تمدن کے دیوتا شرم سے منہ ڈھانپ لیتے ہیں اور وہ چیخ مار کر پکارتی ہے۔ ”نوازش۔۔۔۔۔۔“ اس کی پکار سن کر بڑی بیگم کا دل ڈوب جاتا ہے اور وہ محسوس کرتی ہے جیسے سفید بنگلہ محل کے محرابوں سے گر کر غلام گردش میں آ پڑا ہو اور آ سیہ گھبرا کر آنکھ بند کر لیتی ہے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے گڑیا گھر جوں کا توں قائم ہے۔



دودھیا سویرا

شہر سے دور گرینڈ ٹریک روڈ کے کنارے پر درختوں کے جھنڈ کے نیچے وہ ایک مختصر سا قبرستان تھا۔ اس میں صرف بیس پچیس قبریں تھیں۔ جن میں بیشتر کچی تھیں۔ پختہ قبروں میں صرف دو یا تین نئی معلوم ہوتی تھیں اور ان میں سے ایک سفید ٹائلوں کی بنی ہوئی تھیں۔ اس مختصر قبرستان کے غربی کنارے پر ایک مسجد تھی۔ جس کے باہر چوبترا سا بنا ہوا تھا۔ مشرقی کنارے کی سڑک کے پاس بس اسٹینڈ کا بورڈ آویزاں تھا۔ جس کے پاس ایک کچے کمرے میں چائے کا سال تھا۔

قبروں پر درختوں کے سوکھے پتے بکھرے پڑے تھے۔ آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔ اور قریب ہی پہاڑی نالہ جو جانی کے نام سے مشہور تھا شور مچاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ان ٹنڈ منڈ درختوں تلے قبرستان میں وہ چاروں اپنے اپنے خیال میں کھوئے ہوئے تھے۔

پتلا دبلا نوجوان منہ میں پائپ دبائے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونے اضطراب بھرے انداز سے سوکھے پتوں پر ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ رک جاتا اور ایک نظر غور سے قبروں کی طرف دیکھتا۔ اس کا ہونٹ ڈھلک جاتا۔ پائپ اور کوٹ کی اوپر والی جیب پر جا نکلتا۔ پھر وہ آنکھیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا اور ایک لمبی آہ بھر کر پھر سے اضطراب بھرے انداز میں ٹہلنے لگتا۔

موچھوں والا ادھیڑ عمر کا شخص درخت سے ٹیک لگائے آسمان پر تیرتے ہوئے بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی جاذب نظر آنکھیں ڈبڈباتی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹ یوں بند تھے جیسے ڈرتا ہو کہ انہیں کھولا تو اس کا راز فاش ہو جائے گا۔ اس کے ماتھے پر کرب بھری تیوری چڑھی ہوئی تھی جیسے بند ہونٹوں کی وجہ سے دل کا تمام تر دکھ سمٹ کر پیشانی پر آ گیا ہو۔ ہر چار پانچ منٹ کے بعد شدت جذبات سے جھرجھری سی لیتا اور پھر چونک کر مڑتا اور غور سے قبروں کی طرف حسرت سے دیکھتا اور اس کے گالوں پر ایک آنسو ڈھلک آتا جسے چھپانے کے لئے وہ پھر سے آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔

گٹھے ہوئے جسم کا نوجوان کھدر کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس تھا اور ایک بڑے سے پتھر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سرمٹا ہوا تھا۔ آنکھیں گویا انگاروں کی طرح روشن تھیں۔ چھاتی تنی ہوئی تھی جیسے اسے سانس لینے میں بھی لذت محسوس ہو رہی ہو۔ اس کے انداز میں ایک عجیب بے نیازی تھی۔ ایک بے نام سے انبساط۔ اور وہ چپ چاپ گویا بے تعلقی سے قبروں کی طرف دیکھ رہا

تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آ جاتی۔ اور اسکے چہرے پر دودھیا سویرا پھیل جاتا۔

مسجد کے چبوترے پر اچکن میں ملبوس ایک پاکیزہ صورت معمر آدمی دوزانو بیٹھازیر لب خشوع سے کچھ پڑھ رہا تھا۔

قبرستان کے پیچھے شمال میں دور ٹیلے پر ایک گاؤں کے چند مکانات شام کے دھندلکے میں لپٹے ہوئے تھے اور اس سے پرے شہر کے مینار اور فلک بوس عمارتوں کا ایک ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔

دفعتاً سارے آسمان پر بدلیاں چھا گئیں اور بوندیں پڑنے لگیں اور وہ چاروں قبرستان سے بس اسٹینڈ کے مختصر سے چائے خانے کی طرف بھاگے۔ چائے خانے کا کمرہ بہت چھوٹا تھا۔ جس میں صرف ایک لمبا، بچ، ایک کرسی اور ایک لمبی میز پڑی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ سب دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ مونچھ والے نے کوئی بات کرنے کی غرض سے پتلے دبے نوجوان سے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے آپ کو صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ کتنے مضطرب ہیں آپ بھائی صاحب۔“

”مضطرب“ پتلے دبے نوجوان نے دہرایا۔ ”نہیں نہیں“ وہ اضطراب بھرے انداز میں چلایا۔ ”میں مضطرب تو نہیں میری روئید اسن کر کیا کریں گے آپ؟“ وہ بولا ”اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اپنی کھانسانے لگا۔

”مجھے اس بات کا دکھ ضرور ہے کہ وہ جوانرگی کا شکار ہو گئی۔ اور آج اس قبرستان میں مٹی کے ڈھیر تلے بے بس پڑی ہے۔ مگر جہاں تک میرا تعلق ہے میں خوش ہوں۔ مجھے تو یہ خوشی ہے کہ میں اس سحر سے نکل آیا ہوں۔ اف کس قیامت کا سحر تھا۔ جیسے کسی نے جادو کر رکھا ہو۔ ہاں وہ جادوگرنی تھی۔“ وہ خاموش ہو گیا اور ان جانے میں بجھے ہوئے پائپ کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔

کھدر پوش نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور زیر لب بولا ”آپ کو اس سے محبت ہوگی؟“

”محبت“ پتلا دبلا نوجوان چلایا۔ مجھے معلوم نہیں لیکن محبت ایسی تو نہیں ہوتی۔ نہیں نہیں وہ تو ایک مثبت جذبہ ہے جو اطمینان اور تسکین کا باعث ہوتا ہے۔“ پھر وہ یوں بولنے لگا جیسے دیر سے منتظر تھا کہ کوئی اسے چھیڑے۔ ”اور یہ۔۔۔۔۔۔ تو ایک بیماری تھی۔ ہاں بیماری۔ ایک ایسی بیماری جس کے تحت مریض خود چاہتا ہے کہ وہ شفا یاب نہ ہو۔ اور ایسے حالات پیدا کر لیتا ہے کہ مرض بڑھتا جائے دوا کرنے کی باوجود بڑھتا جائے۔“

”عجیب بات ہے۔“ اچکن پوش بزرگ نے سراٹھا کر پہلی مرتبہ دبے پتلے مضطرب نوجوان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

بس اسٹینڈ کے اس مختصر سے چائے خانے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر ہوا درختوں کے اس جھنڈ میں کراہ رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔

”ہا“ وہ دبلا پتلا نوجوان لمبی آہ بھر کر آپ ہی آپ یوں بڑبڑانے لگا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو جیسے اسے دوسرے اصحاب کی

[illegible]

باہر درختوں کی ٹہنیوں میں گرتی ہوئی بوندیاں یوں سنائے دے رہی تھیں جیسے کوئی ہچکیاں لے رہا ہو۔ دور جاتی ندی میں بین کر رہی تھی۔ کمرے میں اچکن پوش سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کھدر پوش غور سے میز کی طرف گھور رہا تھا اور مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا شخص ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کمرے کی دیوار کے پار نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔

”ہاں جادو“ دہلا پتلا نوجوان بولا ”اس نے مجھ پر بچپن سے ہی جادو کر رکھا تھا۔ اور۔۔۔۔۔ اور جب میں نے ہوش سنبھالا“ میں اس کے پیچھے پیچھے گود کے کتے کی طرح پھرتا رہتا تھا۔ جہاں بھی وہ جاتی، میں اس کے پیچھے جاتا۔ وہ کسی سے ملنے کے لئے گھر کے اندر چلی جاتی تو میں دہلیز پر بیٹھ جاتا اور انتظار کیا کرتا کہ کب وہ باہر نکلے اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل سکوں۔ وہ چوبارے میں بیٹھ کر سویٹر بنتی تو میں اس کے سامنے چوکی یا پتھر پر بیٹھ رہتا۔ وہ ہنڈیا پکانے میں مصروف ہوتی تو میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو رہتا۔ وہ سکول جاتی تو میں سکول کے دروازے تک اس کے پیچھے پیچھے جاتا۔ پھر سکول میں داخل ہوتے وقت وہ مڑ کر میری طرف دیکھتی اور اس کی آنکھوں میں ایک شریر مسکراہٹ چمکتی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی شرارت میں، میں اس کے ساتھ شریک ہوں۔ سویٹر بنتے ہوئے، تاگا توڑتے وقت یا سلائی پر دھاگے سیٹے وقت مجھے وہاں بیٹھے دیکھ کر وہ مسکراتی۔ وہی مسکراہٹ جیسے ہم دونوں کسی پوشیدہ شرارت میں اکٹھے شریک ہوں۔ بس وہی مسکراہٹ مجھے اس بات پر اکساتی تھی کہ میں گود کے کتے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے پھروں۔

[illegible]

دبلے پتلے نوجوان نے ایک شدید جھرجھری لی۔ اور پھر جیبوں کو ٹٹول کر دیا سلامتی نکالی اور ماچس جلا کر پائپ کے لمبے لمبے کش لینے شروع کر دیے۔ اچکن پوش بزرگ اپنا درد بھول چکے تھے۔ اور منہ کھولے دبلے پتلے نوجوان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا مرد ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ کھدر پوش ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی رکھے گہری سوچ میں پڑا تھا۔ باہر ٹین کی چھت پر بوندیاں گویا یوں جلتی رنگ بجا رہی تھیں جیسے کوئی مغنی مزے میں آیا ہو۔

”اس مزے کی وجہ سے میں اپنی عمر سے پہلے ہی جوان ہو گیا۔“ پتلا دبلانو جوان بولا ”میرا مطلب ہے، بچپن ہی میں جوانی کی شرارت گویا مجھ پر مسلط ہو گئی۔ اسے بھی اس حقیقت کا احساس تھا اور وہ اس بات پر ہنسا کرتی تھی۔ اس کی ہنسی میں طنز نہیں ہوتی تھی۔ اذنبوں جیسے مصو را پنے نقش کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے تقریباً پانچ سال بڑی تھی۔ لیکن اس کی اس رازدارانہ مسکراہٹ نے گویا مجھ میں بلوغت کا خمیر پیدا کر دیا تھا اور میں اپنے آپ کو اس کا ہم عمر سمجھنے لگا تھا۔“

کچھ دیر خاموش رہن کے بعد وہ پھر بولا ”پھر اس کی مسکراہٹ کا وہ راز دارانہ رنگ گویا اس کی آنکھوں سے رس رس کر بہنے لگا۔ حتیٰ کہ اس کی ہر حرکت اسی رنگ میں شرابور ہو گئی اور۔۔۔۔۔ اور میری نظر میں اس کے جسم کے چچ و خم یوں عریاں دکھائی دینے لگے جیسے وہ ہولی کھیل کر آئی ہو اور ہر نگاہ کے ساتھ جو میں اس کے اوپر ڈالتا، میری آنکھوں میں اسی رنگ کی پھوار پڑتی اور میرے جسم میں اک ہوائی سی چل جاتی۔۔۔۔۔ تو بہ ہے۔“ اس نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے یوں بھیگے بھیگے انداز سے کہا، جیسے وہ رنگ میں شرابور ہو گیا ہو۔ پھر دفعتاً سر اٹھا کر بولا۔ ”پھر اس نے وہ شرارت سازش میں بدل دی اور۔۔۔۔۔ اور ایک معصوم لڑکے کو جس نے غفوان شباب کے عالم میں ابھی قدم رکھا ہی تھا، گناہ کے احساس سے شناسا کر دیا۔ تو بہ ہے۔“ وہ پھر چلایا ”جو گناہ سے آشنا نہ تھا۔ جس نے گناہ کی آرزو تک نہ کی تھی۔ اسے گناہ کے احساس سے شناسا کر دیا اور شناسا ہی نہیں بلکہ شرابور کر کے بھیگے کبوتر کی طرح

اس کی قوت پر واز ختم کر دی اور یہ سب ایک جملے ایک کنایہ سے۔۔۔۔۔ ”چپ کوئی آ رہا ہے۔“ کس قدر معصوم جملہ ہے۔ لیکن ایک خوب صورت میار کے منہ سے راز دارانہ انداز سے نکلے تو۔۔۔۔۔ توبہ ہے۔“ ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر آپ ہی آپ کہنے لگا ”ہم دونوں ایک دوسرے سے دور بیٹھے ہوتے۔ وہ اپنے کام کاج میں منہمک ہوتی اور میں چپ چاپ نگاہوں سے اس کے پاؤں کی انگلیوں سے کھیل رہا ہوتا۔ پاؤں کی چاپ سن کر دفعتاً وہ میری طرف دیکھتی اور خاموشی سے اشارہ کرتی۔ ”چپ‘ کوئی آ رہا ہے۔“ اور میرا دل اچھلتا اور میں اپنے آپ کو یوں سنبالتا جیسے کوئی پکڑا گیا ہو اور پھر میں محسوس کرتا، جیسے آنے والا ہمارے راز سے واقف ہے۔“ وہ ہنسنے لگا ”عجیب بات تھی، راز کی نوعیت جانے بغیر وہ اس کے کھل جانے سے ڈرتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ راز کے کھلنے کا ڈر پیدا کر کے دراصل وہ مجھے راز کی نوعیت کی عملی تحقیق کرنے پر اکسا رہی تھی۔

پھر ایک روز شام کے وقت جب ہم دونوں کمرے میں اکیلے اگرچہ دور دور بیٹھے تھے تو اس کے والد صاحب کی کھٹکھار سنائی دی۔ وہ دیوانہ وار اٹھی اور میرا بازو پکڑ کر گھسیٹ کر کمرے کے کونے میں لے گئی اور مجھے الماری کے پیچھے ٹھونس دیا۔ وہ پہلا دن تھا جب اس معصوم شرارت پر سازش کی مہر لگ گئی۔“ وہ خاموش ہو گیا اور دروازے کے باہر گرتی ہوئی بوندیوں کو غور سے دیکھنے میں کھو گیا۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ اچکن پوش بزرگ پھر سے سر جھکا کر ورد کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا مرد اضطراب بھرے انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیرنے میں مصروف ہو جاتا۔ آخر وہ بے اختیار ہو کر بولا ”پھر۔۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوا؟“

”پھر۔۔۔۔۔“ پتلا دبلا نوجوان چونکا۔ ”پھر۔۔۔۔۔“ اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ اپنا قصہ بیان کر رہا تھا۔ ”اوہ۔۔۔۔۔“ ہاں۔ ”وہ چلا یا۔“ پھر کیا ہونا تھا پھر وہی ہوتا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ اور کیا ہو سکتا تھا اور میں۔۔۔۔۔ میرا عزم تو یوں شمل ہو چکا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ پھر اسی روز اس نے مجھ سے کہہ دیا کہنے لگی۔ ”اب تم نہ آیا کرو میاں، جب تک میں خود نہ بلاؤں۔“ پھر دفعتاً نہ جانے کیا سمجھ کر اس نے میری جانب دیکھا۔ وہی سازشی نگاہ۔ وہی چپ کا سا انداز۔ ”میں بلا یا کروں گی۔“ وہ بولی ”ہاں“ اس ہاں نے وہ منفی احساس جو اس کے منع کرنے کی وجہ سے مجھ پر مسلط ہو گیا تھا، قطعی طور پر رفع کر دیا۔ اور میں نے پہلی مرتبہ اس کی ہاں کا مثبت اثر محسوس کیا۔ اس وقت گویا ساری کائنات سمٹ کر میری جھولی میں آگری۔ آتش دان پر شانت آسن میں بیٹھا ہوا دیوتا میری طرف دیکھ کر کرمسکرایا اور پھر اس نے میرے سامنے سر جھکا دیا اور آتش دان پر بجھے ہوئے کپڑے پر کاڑھے ہوئے پھولوں میں سے خوشبو کا ایک ریلا آیا اور سارا کمرہ خوشبو سے بھر گیا۔ ”وہ ہنسنے لگا“ عجیب عمر تھی وہ بھی۔ کاش کہ میں اس جادوگر نی کے سحر میں نہ

آتا۔“ اس کی ہنسی زہر خند میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور دروازے میں کھڑے ہو کر درختوں کے جھنڈ تلے بکھری ہوئی تھی قبروں کی طرف دیکھنے لگا۔

”عجیب واقعہ ہے۔“ اچکن پوش بزرگ نے زیر لب کہہ کر آہ بھری۔ ”تو کیا اس نے تمہیں بلایا؟“ مونچھوں والے ادھیڑ عمر کے مرد نے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ بولا ”کئی بار۔۔۔۔۔۔ لیکن بے کار۔ ہر بار جب بھی بلاتی تو کوئی نہ کوئی آ جاتا اور مجھے پردے یا الماری کے پیچھے چھپا دیا جاتا۔ جہاں میرا دل دھک دھک کرتا۔ میرے جسم کا بند بند سمتا پھیلتا۔ میرا حلق بند ہو جاتا اور چاروں طرف سے ایک انجانا بوجھ مجھ پر پڑ جاتا۔ تو بہ ہے۔“ وہ چلایا ”جیسے جیسے ڈر اور خوف مجھے اندے کی طرح پھینٹ کر رکھ دیتے۔ لیکن اس کے باوجود میں انتظار کرتا رہتا کہ کب وہ بلائے اور میں جاؤں۔۔۔۔۔۔ پھر“ وہ آہ بھر کر بولا۔ ”پھر اس کی شادی ہو گئی۔ اور۔۔۔۔۔۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ مجھے اس پر دکھ نہ ہوا کہ وہ کسی اور کی ہو رہی ہے بلکہ صرف اس بات پر کہ اس سے چوری چھپے ملنے کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا حالانکہ ہمارے ملنے کی صورت کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ عجیب بات ہے نا۔“ وہ پائپ کا کش لیتے ہوئے بولا۔ ”اور جب وہ رخصت ہونے لگی تو اکیلے میں مجھ سے کہنے لگی ”تم فکر نہ کرنا“ میں تمہیں بلاؤں گی۔ میں بلاؤں تو آنا ضرور۔ ضرور آنا۔“ اس کی اتنی سی بات پر مجھے اطمینان سا ہو گیا اور میری تمام شکایات یوں ختم ہو گئیں جیسے پیدا ہی نہ ہوئی ہو۔ اور ایک بار پھر میں انتظار کی لذت میں کھو گیا۔“

”چھ مہینے گزر گئے“ اس نے مختصر سے وقفے کے بعد کہا۔ ”لیکن مجھے اس کا بلاوا نہ آیا۔ اس کے رنگین وعدے کا سحر ٹوٹنے لگا اور۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔“ وہ زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”ایک روز میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر وہاں جا پہنچا جہاں وہ رہتی تھی۔ اور ایک رات جب اس کا خاوند گھر پر نہ تھا“ میں ناگہاں اس کے روبرو جا کھڑا ہوا۔

مجھے دیکھ کر پہلے وہ گھبرا گئی لیکن جلد ہی سنبھل کر بولی ”شکر ہے تم آ گئے“ آؤ آؤ لیکن ادھر اس کو نے میں۔ کوئی نوکر نہ دیکھ لے۔“ اس نے مجھے اسی نگاہ سے دیکھا۔ وہی سازش، وہی شوخی، وہی نیم مدہوشی۔ مجھے وہاں بٹھا کر وہ کام کاج میں مصروف ہو گئی اور رنگین قتل کی طرح ادھر ادھر گھومنے لگی۔ ہر چند منٹ کے بعد چپکے سے وہ اس کو نے میں آ جاتی، جہاں میں بیٹھا تھا اور پھر وہی نگاہ، وہی تبسم۔۔۔۔۔۔ کام کاج سے فارغ ہو کر جب ہم اکٹھے ہوئے تو وہی بات وقوع میں آئی جو ایسے موقع پر ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے آہٹ کی آواز سن کر وہ زیر لب چلائی۔ ”وہ۔۔۔۔۔۔ وہ آ گئے۔“ اور پھر اپنی بانہوں میں تھام کر گھسیٹے ہوئے وہ مجھے ساتھ والے چھوٹے کمرے میں لے گئی۔ اور مجھے وہاں بٹھا دیا۔ ”چپ“ وہ بولی اور دروازے کے پٹ بند کر کے خود باہر نکل گئی۔ اور میں اس

”خوف کا ایک آرا تھا جو مجھے کاٹ رہا تھا۔ وہی بوجھ، وہی گھٹن، وہی تناؤ۔۔۔۔۔۔ تو یہ ہے۔“

[illegible]

”وہ اکیلی چار پائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ ایک بازو سرتلے دبایا ہوا تھا۔ اور اس کے چہرے پر اتنی مسرت اور شگفتگی چھائی ہوئی تھی جیسے خوشی سے سرشار اور سارے گھر میں اس کے اور اس کی نوکرانی کے سوا کوئی نہ تھا۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ اس کی تمام تر خوشی اس بات پر موقوف تھی کہ کسی کو الماری یا پردے کے پیچھے چھپا دے۔ جہاں وہ تڑپ تڑپ کر اپنا آپ اس کے لئے ہلکان کرتا رہے اور خود اطمینان سے سو جائے۔ غصے سے میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور پھر پیشتر اس کے کہ وہ مجھے پکڑ لیتی، میں ہمیشہ کے لئے اس کے سحرے نکل آیا۔ بھاگ آیا۔

گھر آتے ہی میں نے اماں سے کہا۔ اماں میری شادی کر دو۔ چاہے کسی سے کر دو۔ اماں کر دو۔۔۔۔۔ اور جب میری شادی ہو گئی اور میری حسین و جمیل بیوی پاس آ گئی تو۔۔۔۔۔ ”وہ زک گیا۔“ ”تو بہ ہے۔“ وہ بولا ”حد ہو گئی حد۔۔۔۔۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“ مونچھوں والے نے بے تابی سے پوچھا۔

”جب میں اپنی نئی نوپلی دلہن کے پاس بیٹھا تھا تو دفعتاً میرا جی چاہنے لگا کہ کوئی آ جائے اور میری بیوی مجھے گھسیٹ کر لے جائے اور کہیں چھپاتے ہوئے۔۔۔۔۔ وہ آگئے‘ چپ۔۔۔۔۔ کہے۔ میری بیوی“ وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا۔ ”اور آج تک‘ آج تک میری یہی حالت ہے۔“ وہ بولا ”مگر کوئی نہیں آتا اور اگر کوئی آ بھی جائے تو وہ ایسا نہیں کرتی۔ یہ نہیں کہتی‘ وہ آگئے۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ تو بہ ہے۔ تو بہ ہے۔۔۔۔۔“ وہ چلا یا۔ ”میں کتنا کمینہ ہوں۔ کتنا کمینہ ہوں۔۔۔۔۔ مگر یہ سب کچھ اس کے سحر کا نتیجہ ہے۔ ہاں اسی کا۔ اور آج ابھی جب میں اس کی قبر کے پاس بیٹھا تھا تو خدا کی قسم میں منتظر تھا کہ وہ باہر نکل کر کہے‘ وہ آگئے۔۔۔۔۔ وہ۔“ وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا۔

باہر ہوا درختوں کی ٹہنیوں جانی ندی بین کر رہی تھی۔ بوندیاں چھم چھم کر رہی تھیں۔ اور اس کی دیوانگی بھری ہنسی کس قدر خوفناک تھی۔ پھر دفعتاً اس کی ہنسی ایک کراہ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر میز پر کہنیاں ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اور کمرے میں

کر بناک خاموشی چھا گئی۔

”چائے بابو جی۔“ چھوٹا لڑکا ٹرے پر چائے کے چار پیالے رکھے ہوئے داخل ہوا اور ایک ایک پیالہ ان کے سامنے رکھ کر باہر نکل گیا۔

چائے آ جانے سے کمرے کے ماحول میں کچھ تبدیلی سی پیدا ہو گئی۔ ”زندگی کس قدر عجیب ہے۔“ کھدر پوش نے کہا۔ ”ان دکھوں اور غموں کے باوجود جو ہمیں برداشت کرنے پڑتے ہیں۔“ اچکن پوش نے لمبی آہ بھری۔ ”بجائے۔“ وہ بولے ”لیکن صاحب انجام کار سب نے یہیں آ جانا ہے۔“ کھدر پوش نے مونچھوں والے ادھیڑ عمر کی طرف دیکھا۔ ”معلوم ہوتا ہے آپ بڑے دکھی ہیں۔“ وہ بولا ”کوئی عزیز داغ مفارقت دے گئے ہیں کیا؟“

”میرے عزیز“ مونچھوں والے نے سراٹھایا۔ ”نہیں عزیز تو نہیں۔ اس کی مجھ سے رشتہ داری نہ تھی۔“

”تو۔۔۔۔۔؟“ کھدر پوش مسکرایا۔ ”محبت؟“ وہ فقرہ مکمل کئے بغیر چپ ہو گیا۔

”محبت۔۔۔۔۔؟“ مونچھوں والے نے آہ بھر کر دہرایا۔ ”کاش میں اس کی محبت کی قدر کرتا۔ میں نے قدر نہ کی۔“ اس کی

آواز بھرا گئی۔ ”وہ میری محسن تھی۔ صاحب۔۔۔۔۔ محسن۔“

”محسن تھی؟“ اچکن والے بزرگ نے ”تھی“ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں“ مونچھوں والا بولا ”وہ بھی عورت تھی۔ اب تم سے کیا چھپانا ہے بھائی صاحب“ اس نے کہا ”اس بات کو تو سب ہی جانتے ہیں۔ ہمارے گھر میں اللہ کا فضل رہا ہمیشہ۔ اپنا کاروبار ہے۔ کام کرنے کے لئے کارندے ہیں۔ مجھے صرف دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے اور باقی سارا وقت اپنے شغلوں میں صرف ہو جاتا ہے۔ بے فکری ہے۔ پیسہ عام ہے۔ ساری عمر اپنی کھانے پینے اور عیش کرنے میں صرف ہوئی ہے۔ جو چاہا مل گیا۔ جس کی آرزو کی وہ حاصل ہو گئی۔ محبت کرنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ کبھی کبھار کسی پر طبیعت آگئی اور طبیعت اپنی ایسی کم بخت ہے کہ جب کسی پر آ جائے تو۔۔۔۔۔۔“ وہ ہنسنے لگا ”میں اندھا ہو جاتا ہوں۔ تمہاری قسم پھر کچھ نہیں سوچتا۔ جی چاہتا ہے چاہے ساری دولت ہی کیوں نہ لٹانی پڑے اسے حاصل کر لوں۔ اور پھر جب حاصل ہو جائے تو چند ایک روز میں چاؤ اتر جاتا ہے اور پھر اپنی توجہ کسی اور طرف لگ جاتی ہے۔ اللہ کا فضل ہے۔ آج تک کبھی ناکامی نہیں ہوئی۔ جو چاہا ملا۔ جسے چاہا حاصل کر کے چھوڑا۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”کوئی پانچ سال ہوئے ہوں گے۔ جب اتفاق سے اپنی نظر ایک کالج کی لڑکی پر پڑ گئی تھی۔ اور کیا بتاؤں تمہیں ایسی بری طرح

مچل گئی طبیعت کہ میں پاگل ہو گیا۔ بس بھائی صاحب ہر جتن کر کے دیکھ لیا، اس کی منتیں کیں، لالچ دیا۔ کھلوا بھیجا میں دولت لندھا دوں گا۔ صرف ایک بار مجھ سے مل جا۔ بیسیوں کٹنیوں اور دلالوں کو بیچ میں ڈالا مگر اس اللہ کی بندی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر اٹھالے جانے کی دھمکیاں دیں۔ سب بے کار۔ اور جوں جوں مجھ میں ناکامی کا احساس بڑھتا، توں توں میرا جنون اور بڑھتا۔ حتیٰ کہ یہ حالت ہو گئی کہ مجھے وہ عیش و عشرت کھٹکنے لگا جس کا میں عادی تھا۔

ان دنوں اس محلہ میں جہاں وہ رہتی تھی، عین اس کے گھر کے سامنے ایک مکان جو خالی ہوا تو میں نے جھٹ اسے سرے سے خرید ہی لیا۔ اور اس مکان کو اپنی بیشک بنا لیا کہ دیکھو۔۔۔۔۔ شاید داؤ چل جائے۔ لیکن میری کوئی پیش نہ گئی۔ وہ لڑکی نہ جانے کیا نام تھا اس کا، عجیب سا نام تھا لیکن ہم چار یاری میں اسے شہزادی کہا کرتے تھے۔ وہ بالکل قابو میں نہ آئی۔ اسی محلے میں ہمارے ساتھ والے مکان میں یہ عورت رہا کرتی تھی جس کی قبر پر میں آج یہاں آیا ہوں۔

اس نے دو چار بار اپنی نوکرانی کے ہاتھ بلوا بھیجا۔ عجیب عجیب بہانوں سے بلایا کرتی تھی۔ پہلی مرتبہ نوکرانی نے کہا ”ذرا ادھر آؤ تو بی بی بلارہی ہیں۔ ان سے بات کر لیجئے۔ ڈیوڑھی کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہیں۔“ دوسری بار تھوڑی سی برانڈی منگوا بھیجی۔ اسی طرح چار پانچ مرتبہ مجھے ملنے پر اکسایا گیا۔ لیکن اپنی طبیعت تو ان دنوں شہزادی پر مائل تھی۔ اور سچ پوچھو تو بیاہی عورت سے اپنے کو کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ طبیعت ہی ایسی ہے۔

پھر ایک روز جب رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے تو اس کی نوکرانی پرچی لے کر آ گئی۔ لکھا تھا۔ ”شہزادی سے ملنا ہو تو رات کے ایک بجے آؤ۔“ میں اسے دیکھ کر بھونچا رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ ڈرتا تھا کہ انتقام لینے کے لئے چال نہ چل گئی ہو۔ جس عورت کو آپ دھتکاریں۔۔۔۔۔ وہ کھدر پوش سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”وہ انتقام لینے پر آمادہ ہو جایا کرتی ہے۔ بہر صورت چار یاری میں آپس میں مشورہ کرنے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو، ہمیں آزمانا ضرور چاہیے۔ تو بھائی صاحب نے حفاظتی تدابیر سوچ لیں اور میرے چاروں یار گھر کے چاروں طرف چوکنے بیٹھے رہے کہ کوئی چال ہو تو مکان پر دھاوا بول دیں اور میں مکان کے اندر چلا گیا۔ اس رات پہلی مرتبہ میں نے اسے دیکھا۔ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ شہزادی سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ لیکن خوبصورتی کیا چیز ہے بھائی صاحب۔ سارا کھیل تو طبیعت کا ہے۔ وہ صرف دو ایک منٹ میرے پاس ٹھہری اور پھر شہزادی کو میرے حوالے کر کے آپ چلی گئی۔ اور بھائی صاحب اس عورت نے کیا جادو کر دیا تھا اس لڑکی پر۔ وہ تو بالکل رام ہو چکی تھی رام۔ پھر ہم اکثر وہاں ملنے لگے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں ملانے کے بعد وہ اپنا تھا ضا شروع کر دے گی۔ لیکن میرے شک بالکل ختم ہو گئے۔ اس کی نگاہوں

اور انداز میں بلا کی آن تھی۔ آن اور بے تعلقی۔ وہ میرے پاس صرف دو ایک منٹ کے لئے ٹھہرتی تھی، لیکن جب میں وہاں جاتا اور جب وہاں سے لوٹتا تو وہ آتی ضرور اور ہنس کر مجھ سے کہتی۔ تم آگئے۔۔۔۔۔ تم جا رہے ہو۔ پھر کب آؤ گے؟ وہ ہمیشہ مجھ سے ”تم“ کہا کرتی تھی۔ عجیب عورت تھی وہ۔ ہاں بھائی صاحب۔۔۔۔۔!“ وہ آہ بھر کر بولا ”چار ایک ماہ تک ہم ملتے رہے۔ لیکن پھر طبیعت اکٹائی۔ جیسے ہمیشہ اپنا طریقہ ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”اور پھر وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔“

کوئی چھ ماہ کے بعد ایک روز جب اپنی اسی بیٹھک میں، میں ایک نئی لڑکی پھنسا کر لایا ہوا تھا تو نہ جانے کس نے مرا بھید فاش کر دیا۔ اور لڑکی کے رشتہ دار پولیس لے کر وہاں آ گئے۔ اب وہ آدھی رات کے وقت نیچے میرا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں اور اوپر میں سخت گھبرایا ہوا ہوں۔ بدنامی اور رسوائی کے ڈر سے لڑکی کو ادھر ادھر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سارے محلے دار دشمن تھے۔ کرتا کیا۔۔۔۔۔ عجیب مصیبت میں گرفتار تھا کہ دھم سے وہ کوٹھا پھاند کر میرے گھر میں اتر آئی اور آتے ہی بولی۔ تم چلے جاؤ جی، وہاں اس کمرے میں۔ میں سنبھال لوں گی۔ اس وقت اس نے عجیب سی پوشاک پہن رکھی تھی۔ ساڑھی اور بنڈی اور نہ جانے کیا کیا۔ حالانکہ وہ ساڑھی نہیں باندھتی تھی۔ بال بھی عجیب سے بنا رکھے تھے۔ پہچانی ہی نہیں جاتی تھی۔ غالباً وہ جان بوجھ کر بھیس بدل کر آئی تھی۔ ”اف۔۔۔۔۔“ اس نے آہ بھری۔ بڑی دلیر عورت تھی وہ۔ دلیری سے اس نے باہر کا صدر دروازہ کھولا اور سب کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ”کیا ہے؟“ وہ بولی۔ میرے میاں خود گھر پر نہیں ہیں۔ میں ان کی بیگم ہوں۔“ اسے یوں کھڑا دیکھ کر پولیس والے اور ان کے ساتھی چوہوں کی طرح دبک کر چلے گئے اور میں صاف بچ گیا۔۔۔۔۔ صاف۔

اسی روز جب وہ مجھ سے اکیلے میں ملی تو اس کے لئے میرے دل میں شدید جذبہ تھا۔ میں نے اس سے کہا، اگر تمہارے خاوند کو معلوم ہو گیا تو۔۔۔۔۔ بڑی دلیری کی ہے تم نے۔ ”تم میری فکر نہ کرو۔“ وہ بڑی آن سے بولی ”اپنی بات کرو تم۔“ اس وقت مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ میرے دل سے اس کے لئے محبت کا ایک طوفان سا چل رہا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ لپک کر اسے بازوؤں سے تھام لیا۔ لیکن وہ تڑپ کر باہر نکل گئی۔ ”میرا احسان اتار رہے ہو؟“ وہ بولی ”اونہوں۔۔۔۔۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ وہ ہماری ملاقات تھی۔“

پھر میں نے اس بیٹھک میں اپنا قیام چھوڑ دیا اور پھر جب میں نے کل ناگاہ سنا کہ وہ انتقال کر گئی ہے تو میں غم سے پاگل ہو گیا۔ اور آج اس کی قبر پر بیٹھے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ میری واحد محبوب تھی۔ اور جیسے وہ قبر سے نکل کر کہے گی ”تم۔۔۔۔۔ تم میرا فکر نہ کرو جاؤ گھر جاؤ۔“ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور اپنی آنکھیں پونچھنے لگا۔

دیر تک کمرے میں طویل خاموشی چھائی رہی۔ دبلا پتلانو جوان ویسے ہی ٹھوڑی ہاتھوں میں رکھ کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کھدر پوش میز کو انگلی سے بجا رہا تھا اور اچکن پوش معمر آدمی زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ ”اور۔۔۔۔۔ اور آپ؟“ دبلا پتلانو جوان چونک کر بولا۔ ”آپ کیسے آئے ہیں؟“ یہاں آپ کا کون عزیز فوت ہو گیا ہے؟“ وہ اچکن پوش اور کھدر پوش دونوں اصحاب میں سے نہ جانے کس سے مخاطب تھا۔

کھدر پوش مسکرایا۔ ”میرا گرو۔“ وہ بولا ”میرا پیر سمجھ لو۔ میرا سبھی کچھ۔ وہ اس قبرستان میں دفن ہے۔ اس نے مجھے وہ دولت بخشی ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اگر میں اس سے نہ ملتا تو آج بھی عام نو جوانوں کی طرح سرخ ہونٹوں، سیاہ بالوں، متبسم آنکھوں اور سنہرے بدن کی ان بوتلوں میں کھویا ہوتا جو آج کل سڑکوں اور بازاروں میں آزادی سے گھومتی پھرتی ہیں۔ شاید آپ نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ عورت کا وجود کتنا دبیز پردہ ہے جو ہماری عقل پر پڑا ہے اور آج کی تہذیب اسے اور رنگین اور دبیز بنانے میں شدت سے مصروف کار ہے۔ اس جیتے جاگتے رنگین بھنور کا صرف ایک مقصد ہے کہ وہ مرد کو لے ڈوبے اور اس کی کائناتی نگاہ کو ناکارہ کر دے۔ اسے زندگی سے بے گانہ کر دے۔ اف کتنا عظیم پردہ ہے۔“ وہ شانے ہلاتے ہوئے بولا ”ایسا پردہ جسے ہم بخوشی اپنی عقل پر ڈالنے کی مشتاق ہیں۔ کتنی بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر میری اس سے ملاقات نہ ہوتی تو آج میری حیات پر بھی وہی پردہ پڑا ہوتا۔ میرے بھی پر کٹے ہوتے تمہاری طرح۔“

اچکن پوش معمر نے سر اٹھا کر غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر مرد حیرانی سے منہ کھولے بیٹھا تھا اور دبے پتلے نو جوان پر مایوسی سی چھائے جا رہی تھی۔

”ہاں“ کھدر پوش بولا ”یقین کیجئے“ یہ سب اسی کی دین ہے۔۔۔۔۔ اسی کی۔ حالانکہ مجھے صرف ایک مرتبہ ملی تھی، صرف ایک مرتبہ۔“

”ملی تھی۔“ اچکن پوش کی دونوں آنکھوں گویا باہر نکل گئیں۔ مونچھوں والے کے کھلے ہونٹوں پر تبسم ڈر گیا۔ دبے پتلے نو جوان نے دفعتاً اضطراب سے پائپ کے کش لینے شروع کر دیئے۔

کھدر پوش مسکرایا۔ ”ہاں“ وہ بولا ”میری گرو بھی ایک عورت تھی بلکہ حسین عورت۔ ایک رنگین ترین بھنور۔ ایک ایسی ناگن جس کے کانٹے کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے پر گہری خاموشی چھا گئی۔ باہر درختوں میں گویا بھوتنیاں ناچ رہی تھیں۔ دور جانی ندی سر فک فک کر رہی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ اور چو لہے پر رکھی ہوئی چائے کی کیتلی

ایک غم ناک دھن بجا رہی تھی۔

”میں ایک زمیندار کا بیٹا ہوں۔“ کھدر پوش بولا ”ہمارا گاؤں پہاڑ پر واقع ہے۔ سمجھ لو کوئی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر۔ بچپن سے ہی ہم پہاڑوں پر چڑھنے کے شوقین تھے اور اکثر بہت دور اونچے نکل جایا کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں سے اوپر کوئی چار ہزار فٹ اوپر یا شاید زیادہ ایک غار ہے جسے قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اس کا منہ تنگ ہے مگر اندر سے کافی وسیع و عریض ہے۔ اس کی چھت بہت اونچی ہے اور فرش بہت صاف۔ جس کے ایک طرف سے چشمہ نکلتا ہے اور وہیں تالاب سا بن جاتا ہے اور پھر نہ جانے اس کا پانی کدھر کو بہہ نکلتا ہے۔ گویا نیچے ہی نیچے غائب ہو جاتا ہے اور اس غار سے منظر اس قدر خوب صورت دکھائی دیتا ہے کہ ہم دیکھ کر دم بخود رہ جاتے تھے۔ پھر موسم سرما میں جب چاروں طرف برف پڑ جاتی تو اس غار سے ایک عجیب نظارہ دکھائی دیتا۔ عجیب۔۔۔۔۔ اس نے جھر جھری لیتے ہوئے کہا۔“ لیکن موسم سرما میں راستے بند ہو جایا کرتے تھے اور وہاں پہنچنا محال ہو جاتا۔ پھر بھی پہلی بار برف پڑتی تو ہم وہاں ضرور پہنچتے اور وہاں سے عجیب نظارہ نظر آتا جیسے وہ کوئی اور ہی دنیا ہو اور ہی جہان ہو۔

جب میں جوان ہوا تو نہ جانے کیوں میرے دل میں صرف ایک ہی خواہش تھی کہ کوئی نئے فیشن کی حسین عورت ہو اور ہم دونوں موسم سرما میں اکیلے اس غار میں رہیں اکیلے۔ نہ جانے یہ خواہش میرے دل میں کیسے پیدا ہوئی۔۔۔۔۔ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن وہ بڑھتے بڑھتے جنون کی صورت اختیار کر گئی۔ ویسے پہاڑ کی عورتیں تھیں۔ مگر مجھے ان سے نفرت تھی۔ میری نگاہ میں وہ عورتیں ہی نہیں تھیں۔

پھر والد کے انتقال کے بعد میں نے اسے عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ بات بڑی مشکل تھی۔ ایسی عورت کو ڈھونڈنا بے حد مشکل تھا۔ تو قصہ مختصر میں اکثر شہر جانے لگا۔ کیونکہ شہر میں بہت سے لوگ میدانوں سے آتے تھے اور ان کے ساتھ وہ بیربھوٹیاں ہوتی تھیں جن کے ساتھ غار میں رہنے کا مجھے خط تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے شہر کے دلالوں سے راہ و رسم بڑھائی لیکن میری بات سن کر وہ ہنس دیئے۔ ”جی ایک دو دن کی بات کرو اکٹھا ایک ہفتہ اور وہ بھی برف کے دنوں میں اور پھر جناب۔۔۔۔۔ اتنی دور غار میں جانے کی کون تیار ہوگی۔“

پھر ایک دن جب میں شہر ہی میں تھا اور ابھی پہلی ہی برف پڑی تھی تو ایک دلالہ بھاگی بھاگی آئی۔ ”کام بن گیا۔“ وہ بولی ”لیکن پیسہ بہت خرچ ہوگا“ نہ جانے کون ہے وہ۔ یہاں اکیلی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ برف دیکھنے آئی ہے۔ ساتھ نوکرانی ہے۔ کوئی ایسی ویسی نہیں بڑے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کی نوکرانی کی جھولی بھر دو تو وہ کہتی ہے کہ میں منالوں گی اسے۔“

اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔ روپے کی تو مجھے پرواہ ہی نہیں تھی۔ میں نے کہا 'غار میں جائے گی؟' "ہاں" وہ بولی۔ "اس کی نوکرائی کہتی ہے میں لے چلوں گی۔ پر یہی دو تین دن کے لئے زیادہ نہیں۔" تو خیر صاحب بات پکی ہو گئی اور ہم وہاں پہنچ گئے۔ غار میں پہنچ کر جب اس نے برقعہ اتارا تو میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کی بھنوس چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹ بے نیازی سے بھیگے ہوئے تھے جیسے اسے جسم سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ جیسے وہ زمین سے نہیں آگاش سے اتری ہوئی ہو۔" وہ خاموش ہو گیا۔ پتلا دبلا نوجوان منہ کھولے بیٹھا تھا۔ اچکن پوش کی آنکھیں ابلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور مونچھوں والے کا چہرہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس پر ایک سفید لمبی داڑھی اگ آئی ہو۔ ہوٹل کا لڑکا جو برتن اٹھانے آیا تھا، چپ چاپ دروازے کے پٹ کے ساتھ چپکا کھڑا تھا۔ جیسے کھو گیا ہو۔

"تین دن ہم وہاں اکٹھے رہے، تین دن۔" کھدر پوش نے بات شروع کی۔ "وہ غار نہیں رہا تھا، اس کی آمد کے بعد گویا وہ ایک مندر میں بدل چکا تھا۔ وہ عورت نہیں تھی۔ وہ ایک دیوی تھی اور میں ہوس کا نہیں تھا۔ وہ مجھے بہت قریب۔۔۔۔۔ بہت قریب۔۔۔۔۔ لیکن نہیں وہ مجھ سے قریب نہیں تھی۔ دور۔۔۔۔۔ بہت دور۔ میں اس کے پاؤں پر سر رکھے پڑا تھا۔ میرے ہاتھ اس کی پنڈلیوں سے چھو رہے تھے۔ لیکن وہ گوشت پوش کی پنڈلیاں نہیں تھیں، وہ نور کی پنڈلیاں نہیں تھیں۔ اسی نور کی جو غار سے باہر چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ چاروں طرف اور پھر نیچے سے اوپر تک چوٹیوں سے اوپر۔ بادلوں سے اوپر۔ نیلے بادلوں سے اوپر۔ نیلے آسمان سے اوپر۔" ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر بولا "ان تین دنوں میں" میں نے اس کے جسم کے ایک ایک حصے پر سجدے کئے۔ اس کے بند بند پر آنکھیں ملیں۔ اس کے رو برو بیٹھ کر بھجن گائے۔ سب کچھ کیا۔ لیکن نہ جانے کیوں میری خواہشات میں ہوس کا عنصر نہیں تھا۔ ہمارے جسم گویا فنا ہو چکے تھے۔ ہماری آرزو میں اس پھیلی ہوئی سفیدی میں گویا دھل چکی تھیں۔ اس لطیف فضا میں محبت اور تحیر کے سوا کچھ نہ تھا۔ بے غرض محبت، بے نام تحیر۔ لیکن آپ نہیں جانتے، آپ نہیں سمجھ سکتے۔" وہ بولا "آپ کبھی دس ہزار فٹ سے اوپر نہیں گئے ہوں گے۔ آپ نہیں جانتے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ کیسے جان سکتے ہیں آپ؟" ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو گیا۔

"تیسرے دن جدائی کے خیال سے میری گھاگھی بندھ گئی۔ میں اس کی محبت میں دیوانہ ہو چکا تھا۔ میں ہمیشہ کے لئے اسے دیوی بنا کر اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے منتیں کیں، ہاتھ جوڑے، سبھی جتن کئے۔ لیکن جواب میں وہ خاموش رہی۔ بالکل خاموش جیسے گوئی ہو۔

”عمر بھر کے لئے ہونا منظور نہیں۔“ میں نے کہا ”تو صرف ایک بار پھر صرف ایک بار ایک مہینہ ایک ہفتہ ایک دن۔“

آخر میری مسلسل منتوں کا یہ اثر ہوا کہ اس نے ایک بار پھر ملنے کا وعدہ کر لیا۔ ہم نے ایک تاریخ مقرر کر لی۔ اور پھر وہ چلی گئی۔

اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وہ ایک سال میں نے کیسے گزارا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ مقررہ دن میرے نزدیک اتنا اہم تھا جتنا کہ قتل کے ملزم کے لئے فیصلہ کا دن ہوتا ہے۔ میرے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ آئے گی۔ ضرور آئے گی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ چاہے وہ ایک دن کے لئے آئے یا ایک ہفتہ کے لئے میں اسے واپس نہیں جانے دوں گا۔ اور ہم موسم سرما وہیں گزاریں گے۔ اسی خیال کے تحت میں نے چار مہینے کی جملہ ضروریات کی چیزیں اس غار میں پہلے ہی سے پہنچا دی تھیں۔ اور بال آخر وہاں اپنی دیوی کے انتظار میں بیٹھ گیا تھا۔

موچھوں والے نے ڈھیلے ہونٹوں سے کہا ”پھر؟“

”لیکن وہ نہ آئی۔“ وہ بولا ”نہ آئی حتیٰ کہ راستے مسدود ہو گئے اور میں نے محسوس کیا کہ میں اتنے مہینوں کے لئے اس برف خانے میں دفن کر دیا گیا ہوں۔ پہلے دو تین دن تو میں غار کے اندر اس خیالی مجسمے کے سامنے کتے کی طرح پڑا رہتا رہا۔ پھر جب دیوانگی دور ہوئی تو میں نے سراٹھا کر دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی جہاں وہ پچھلے سال کھڑی ہوا کرتی تھی۔ اس کی بھنویں اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں باہر اوپر کی طرف دیکھ رہی تھیں اور وہ یوں مسکرا رہی تھی جیسے مجھے بھی باہر اوپر کی طرف دیکھنے کی ترغیب دے رہی ہو۔ میں نے پہلی مرتبہ اطمینان اور سکون سے باہر دیکھا۔ لیکن آپ۔۔۔۔۔“ وہ بولا ”آپ اس منظر کو ذہن میں نہیں لا سکتے۔ آپ دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر نہیں گئے کبھی۔“

دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر۔۔۔۔۔“ اس نے پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”فضا اس قدر لطیف ہوتی ہے اور عالم اس قدر نورانی ہوتا ہے جیسے صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے یہاں دودھیا سویرا پھیلا ہوتا ہے۔ اس بلندی پر یہاں صبح صادق کے دودھیا سویرے کو قیام اور دوام مل جاتا ہے۔ اس دودھیا سویرے میں نگاہیں ہمیشہ اوپر کو اٹھتی ہیں۔ اور انسان محسوس کرتا ہے جیسے وہ اڑ رہا ہو۔ انسانی کثافت کا بوجھ گویا اس کے پیٹ سے اتر گیا ہو۔ اس کی آرزوؤں میں شدت کی وہ دھار نہیں رہتی۔ اس کے دکھوں اور حسرتوں میں تکلیف کا عنصر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بغض، دشمنیاں، نفرتیں یوں اپنی کثافت کھو بیٹھتی ہیں جیسے مشین سے دبی ہوئی روئی کی گٹھڑی کو دھنک کر صاف کر دیا گیا ہو۔ وہاں روح سے بوجھ اتر جاتا ہے۔ وہاں کوئی ہوس کاری کا شکار نہیں ہو سکتا۔ وہاں کوئی جرم سرزد نہیں ہو سکتا۔ وہاں کوئی گناہ سے آلودہ نہیں ہو سکتا۔ جیسے یہاں صبح صادق کے وقت کوئی جرم نہیں کر سکتا۔ عیش و نشاط کی

محفلیں چار بجے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ اس وقت محبوبہ کے لئے برہا کا راگ بھی گایا نہیں جاسکتا۔ صرف حمد و ثناء، صرف کائناتی جذبہ ہی اس وقت قیام حاصل کر سکتا ہے۔ اس دودھیا سویرے میں وہاں عشق جسم کے بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اپنی اپنی ذات سے نکل کر کائنات کے ذرے ذرے پر بکھری جاتی ہے۔ وہ بلندی اور پھر وہ پاکیزہ نورانی برف، وہ چاروں طرف پھیلا ہوا نور۔ اور وہ سکوت۔ گہرا بے اتھاہ سکوت۔ ”وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے پر گویا دودھیا سویرا چھا گیا۔

”تین مہینے کی اس نور سے بھیگی ہوئی تنہائی نے مجھے اپنی انا سے نکال کر ساری کائنات پر مسلط کر دیا۔“ اس نے سلسلہ کلام از سر نو جاری کیا۔ ”اور وہ وجدان جو مجھ پر طاری رہا، اس کی وجہ سے تین مہینے میں میری کایا پلٹ گئی۔ پھر جب میں نیچے اتر تو ایک مرتبہ پھر مجھ پر وہی جنون طاری ہوا۔ اس کا جنون۔ میں نے جگہ جگہ خاک چھانی کہ اسے ڈھونڈ نکالوں۔ لیکن بے سود وہ نہ ملی۔ اس کا پتہ بھی نہ مل سکا۔

پھر جب موسم سرما آیا تو مجھ پر ایک نئی وحشت سوار ہو گئی۔ وہ نورانی غار مجھے اپنی طرف بلانے لگا۔ مجھے ہر وقت اسی منظر کا خیال رہنے لگا۔ وہی نور کی چادر۔ وہی اطمینان، وہی گہری خاموشی۔ یہ وحشت اس حد تک میرے سر پر سوار ہو گئی کہ میں پھر موسم سرما کا ٹٹے وہاں جا پہنچا۔ اور اب میں ہر سال موسم سرما وہیں گزارتا ہوں۔“

”اور وہ؟“ دہلا پتلانہ جوان چلایا۔ ”وہ پھر نہ ملی؟“

”وہ۔۔۔۔۔۔“ کھدر پوش ہنسنے لگا۔ ”اس نورانی سویرے نے مجھے نکھار نکھار کر بذات خود دیوتا بنا دیا اور دیوی کے نقش میرے دل سے دھو ڈالے۔ اور چھ سال میں میں نے اس راز کو پالیا کہ عورت مرد کی راہ میں محض ایک رکاوٹ ہے۔ ایک پردہ ہے۔ ایک ایسا پردہ ہے جسے ہٹائے بغیر ہم کہیں پہنچ نہیں سکتے۔ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ زندگی رکاوٹوں کو عبور کرنے کا نام ہے۔ آرزوؤں کا غلام بننے کا نہیں۔ میری دیکھئے۔“ وہ چلایا ”سردی ہو یا گرمی۔ میں صرف اس کھدر کے کرتے میں رہتا ہوں اور یقیناً جانو میرے بدن میں اس قدر قوت دفاع پیدا ہو چکی ہے کہ میں سانس لیتا ہوں تو مجھے لذت محسوس ہوتی ہے۔ ایسی لذت جو عورت کے رنگین قرب سے بھی میسر نہیں ہو سکتی۔“

”لیکن وہ۔۔۔۔۔۔؟“ پتلے دہلے جوان نے پھر اس کی توجہ اپنی طرف منتہف کرنے کی کوشش کی۔

وہ مسکرایا ”جب میں اس کے سحر سے آزاد ہو چکا تھا تو ایک روز شہر میں اتفاقاً وہ مجھے مل گئی۔ اس کے ساتھ وہی نوکرانی تھی۔“

”مل گئی؟“ مونچھوں والے نے بیٹھے ہوئے گلے سے دہرایا۔ ”واقعی۔۔۔۔۔۔؟“

”ہاں“ وہ بولا ”اس نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ دیوی تم پھر نہ آئیں۔ اس نے جھر جھری لی اور بولی اس مندر میں دیوی کی جگہ نہیں ہے۔ میں نے ازراہ شرارت کہا کہ پھر پجاری کو بلا لیا ہوتا۔ وہ پھر ہنسی لیکن جلد ہی گویا کسی اثر سے بھیگ کر کہنے لگی۔ اس مندر کا پجاری کسی کو بلائے سے نہیں آتا۔ میں خود ابھی تک اسی مندر کی پجارن ہوں۔ اس کی آنکھیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں اور ان میں اس وقت وہی دودھیا اجالا چمک رہا تھا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد آپ ہی آپ کہنے لگا ”ہاں وہ میری گرو تھی۔ میرا پیر تھی۔ میرا سبھی کچھ تھی۔ اور جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ وفات پا گئی ہے تو میں یہاں آئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن۔۔۔۔۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”اب کی سردیوں میں وہ وہاں ضرور آئے گی۔ اب وہ پردہ نہیں رہا۔ پردے سے نکل چکی ہے۔ وہ یقیناً ابھی تک اس مندر کی پجارن ہے۔ ابھی تک۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

دفعۃً ہوٹل کا لڑکا چلایا۔ ”بابو جی بادل چھٹ گئے ہیں اور بس آنے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔“
 ”اور۔۔۔۔۔“ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے مونچھوں والے نے اچکن پوش بزرگ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اور صاحب آپ کا کون عزیز فوت ہوا ہے؟“ اور سب کی نگاہیں اچکن پوش کی طرف اٹھ گئیں۔
 وہ گھبرا گیا۔ پھر اچکن جھاڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تو کسی عورت کے لئے یہاں نہیں آیا۔ میں تو تقریباً ہر روز ہی آتا ہوں یہاں۔ جب سے میری بیوی فوت ہوئی ہے۔ روز فاتحہ کے لئے آتا ہوں۔“
 ”بیوی؟“ دبلے پتلے نوجوان نے دہرایا۔

”اتنی وفادار اور خدمت گزار بیوی شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔“ وہ بولا ”حالانکہ میں بوڑھا تھا اور وہ نوجوان تھی۔ لیکن سبحان اللہ۔ وہ گویا صرف میری خدمت کے لئے جیتی تھی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ”جنتی روح تھی۔۔۔۔۔ جنتی۔“ بھرائی ہوئی آواز میں اس نے کہا اور خاموش ہو گیا اور وہ چاروں طرف ملحقہ قبرستان کی طرف چل پڑے۔
 بادل واقعی چھٹ گئے تھے۔ سورج مغرب میں تانبے کی تھال کی طرح مڑگا ہوا تھا۔ اس کی سنہری شعاعوں میں بدلیاں انگاروں کی طرح دکھ رہی تھیں۔

”وقت بہت کم ہے۔“ کھدر پوش بولا ”شہر کے لئے یہ آخری بس ہے۔“
 ”پتلے دبلے نوجوان نے کہا“ لیکن قبر پر دیا تو جلانا چاہیے کم از کم۔“
 ”ہاں ہاں“ مونچھ والا بولا ”اور وہ تینوں سفید قبر کے طرف لپکے اور جب تینوں نے بیک وقت ایک ہی تربت کے طاق کی طرف

باتھ بڑھائے تو تینوں کے سر آپس میں ٹکرا گئے۔

”ہائیں۔۔۔۔۔“ وہ تینوں بیک وقت چلائے اور انہوں نے ایک نئے مفہوم سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتے۔ اچکن پوش بزرگ کی آواز سنائی دی۔ ”میاں تم کدھر آ نکلے ہو؟“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے اپنی بیوی کے مزار کا دیا تو جلا لینے دو۔“

وہ سب تعجب سے بوڑھے کی طرف دیکھنے لگے۔ پتلے دبے اضطرابی نوجوان نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کدھر پوش نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر زیر لب کہا۔ ”اونہوں۔۔۔۔۔ دوسروں کو ننگا نہ کرو۔ ہمیں پردہ اپنی عقل سے اٹھانا ہے۔ اپنی عقل سے۔“

”کتنارنگین پردہ ہے۔“ مونچھوں والے نے آہ بھری۔

”کتنی بڑی رکاوٹ ہے۔“ کدھر پوش نے کہا۔

اچکن پوش انہماک سے دیا جلانے میں مصروف تھا۔ اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔ سورج کی آخری شعاعوں نے بادلوں سے چھن کر فضا میں نور کی دھاریاں سی بنا دی تھیں۔ جیسے نور کا ایک مینار کھڑا ہو اور چاروں طرف دودھیا سویرا پھیلا تھا۔



سندرتا کارا کشش

شام دے پیاؤں ریگ رہی تھی۔

میلے پر درختوں کے سائے پھیلتے جا رہے تھے لیکن چوٹی کی جھولی سورج کی ٹھکی مامدی کرنوں سے ابھی تک بھری ہوئی تھی۔
سوامی جی کی کتیا کا دروازہ صبح سے بند تھا۔ بالکا اور داس دونوں درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔
ہر چند ساعت بعد وہ سر اٹھا کر سوامی جی کی کتیا کے دروازے کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھتے کہ کب دروازہ کھلے اور درشن کے
بھاگ جاگیں لیکن دروازہ نہیں کھلتا تھا۔

صبح داس نے تھالی میں بھوجن پر دس کرسوامی جی کے دروازے پر رکھ دیا لیکن اب تک تھالی جوں کی توں دھری تھی۔ نہ دروازہ کھلا نہ سوامی جی نے بھوجن اٹھایا۔ اب وہ رات کے بھوجن کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ پاس ہی بالکا منجھ کے بنے ہوئے جوتے کی مرمت کر رہا تھا۔

دور ٹیلے کے مغربی کونے کے پرے شہر کے مکانات صاف دکھائی دے رہے تھے جیسے ماچس کی روغنی ڈبیاں نیچے اوپر دھری ہوں۔ شہر کے لو بھی بھنورے کے مدھم بھی بھن صاف سنائی دے رہے تھے۔ دفعتاً اس کے منہ سے ایک چیخ سی نکلی۔ ”ہے رام“ اور چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

”باتھ کٹ گیا کیا؟“ بالکے نے سراٹھا کر پوچھا۔

”ناہیں مہاراج، وہ دیکھو۔۔۔۔۔۔ ادھر۔“

بالکے نے ادھر دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ٹیلے کے مغربی کنارے پر دو لڑکیاں ان کی طرف آ رہی تھیں۔ چست لباس پہنے بال پھلائے، مکھ سجائے، پرس جھلاتی ہوئی۔ یوں جیسے وہ سوامی جی کا آشرم نہیں بلکہ پنک سپاٹ ہو۔ ”یہ تو کالج کی دکھتی ہیں مہاراج۔“ داس نے کہا۔

”آج کل تو سبھی کالج کی دھکتی ہیں۔“ بالکے نے جواب دیا۔ ”کیا ماما کیا پتري۔۔۔۔۔“ بالکا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور گھبراہٹ میں شہلے لگا۔

داس چھلے ہوئے آلوؤں کی کوپھر سے چھیلنے میں لگ گیا۔ ٹیلے پر گھبراہٹ بھری خاموشی کے ڈھیر لگ گئے۔ وقت تھم گیا۔

پھر ایک لوچدار آواز نے تلی کی طرح پر پھڑ پھڑائے۔ ”ہمیں سوامی جی سے ملنا ہے۔“ بالکے نے سراٹھایا۔

شیلا اور بھلا کی کٹور اسی آنکھیں دیکھ کر بالکے نے گھبرا کر سر جھکا لیا اور بولا ”سوامی جی کی کنیا کے دوار کے پٹ کل سے بند ہیں

دیوی۔ انہوں نے صبح کو بھوجن بھی نہیں اٹھایا۔“

”تو دوار کے پٹ کھول دو۔“ شیلا بولی۔

”ہمیں اس کی آگیا نہیں دیوی۔“

”سوامی جی کو بھی تو دوار بند کرنے کی آگیا نہیں۔“ بھلا غصے سے چلائی۔ ”اگر پر ماتما کا دوار بھی بند ہو گیا تو مسئلوں کا کیا ہوگا؟“

”یہ سن کر بالکے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سدھ بدھ ماری گئی۔ اب کیا جواب دے۔ کوئی ہو تو دے۔ ٹیلے پر خاموشی طاری

ہو گئی۔ پھر داس اٹھا۔ اس نے لپک کر چٹائی اٹھائی اور کنیاؤں کے سامنے بچھا کر نیچی نگاہوں سے بولا ”بیٹھو شرمیتی بیٹھو۔

”ہمارے پاس بیٹھنے کا ناٹم نہیں۔“ شیلا نے کہا۔

”سوامی جی سے کوئی مانگ کرنا ہے یا پوچھنا ہے۔“ داس نے پوچھا۔

”مانگ بھی پوچھنا بھی۔“ شیلا نے کہا۔

”ہم تمہارا سندیس پہنچا دیں گے دیوی۔“ بالکا بولا۔

”اوہوں“ شیلا نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ”ہم خود سوامی جی سے بات کریں گے۔“

”پر دیوی جی سوامی جی استریوں سے نہیں ملتے۔“ بالکے نے کہا۔

”کیا کہا؟“ شیلا اور بھلا دونوں چلائیں۔

”کیا وہ پرش اور استری کو برابر نہیں جانتے؟“ شیلا نے تلخی سے پوچھا۔

بالکے نے سر لٹکا لیا اور چپ سا دھ لی۔ اب وہ کہنے کیا جواب دے۔

ٹیلے پر خاموشی چھا گئی۔ گہری لمبی خاموشی۔

آخر شیلا زیر لب بولی۔ جیسے خود سے کہہ رہی ہو۔ اس کی آواز میں مایوسی کی جھلک تھی۔ ”بے کار ہے بھلا، استری کے لئے پر ماتما

کا کا دوار بھی بند ہے۔ یہاں بھی اندھیر نگری ہے۔ یہ ویش بھی پریش کا ویش نکلا۔“

تھا۔“ یہ کہہ کر بالکا چپ ہو گیا۔

”وہ بے وقتی کون تھے بالکے جی؟“ بملا نے پوچھا۔

”تمہیں نہیں پتہ کیا؟“ بالکا بولا ”آج بھی راج گڑھی کی ڈھیری میں آدھی رات کے وقت رانی وہ بے وقتی کی آواہیں سنائی دیتی

ہیں۔“

”آج بھی۔۔۔۔۔؟“ بملا نے پوچھا۔

”ہاں آج بھی۔ اس کی ڈھونڈ آج بھی جاری ہے۔“

یہ سن کر شیلہ بملا کو چپ لگ گئی۔ سائے اور بھی لمبے ہو گئے۔

درختوں کی شہنیاں ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگیں۔ سورج کے لہو نے رس کر بادلوں کو رنگ دیا۔ وقت رک گیا۔

پھر شیلہ کی مدھم آواز آئی۔ ”بالکا جی، وہ بے وقتی کون تھی؟“

اور پھر بالکے نے وہ بے وقتی کی کہانی سنانا شروع کی۔ بالکا بولا۔۔۔۔۔

”وہ بے وقتی راج گڑھی کے مہاراج ماتری راج کی رانی تھی۔ مہاراج کا سنگھاسن اس کے چرنوں میں دھرا تھا۔ مہاراج اسے

آنکھوں پر بٹھاتے۔ وارے نیارے جاتے۔۔۔۔۔ اس کی کوئی بات نہ ٹالتے۔ الٹا پلے باندھ لیتے۔ انہیں وہ سب رانیوں

سے پیاری تھی۔ کیسے نہ ہوتی۔ سندر تا میں وہ سب سے اتم تھی۔ صرف ناک نقشہ ہی نہیں، اس کی چال ڈھال، رنگ روپ سب کچھ

سندر تا میں بھیگا ہوا تھا۔ پلکیں اٹھاتی تو دیئے جل جاتے۔ ہونٹ کھلتی تو پھول کھل اٹھتے۔ بانہہ ہلاتی تو ناگ جھولتے۔ بھرپور نجر سے

دیکھتی تو رنگ پچکاری بھگو کر رکھ دیتی۔ مہاراج راج بھون میں بڑے آنند سے جیون گجار رہی تھی۔“

بالکا رک گیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد بولا ”پھر ایک روز آدھی رات کے سہ مہارانی کا دوار بجا۔ وہ سمجھی، مہاراج آئے ہیں۔ اٹھ کر

دروازہ کھولا تو کیا دیکھتی ہے کہ مہاراج نہیں بلکہ ایک بوڑھی کھوسٹ استری کھڑی ہے۔

”کون ہے تو؟“ وہ غصے سے چلائی۔

اس کی آواز سن کر مہارانی کی باندی شوشی جاگ اٹھی اور دوڑ کر دروازے پر آ گئی۔ اس کی اتنی جان کہ آدھی رات کو مہارانی کا

دروازہ کھٹکھٹائے۔ رانی نے بڑھیا سے کہا۔ ”کون ہے تو؟“ شوشی بڑھیا کی طرف جھپٹی۔

”میں شو بالا ہوں۔“ بڑھیا نے جواب دیا۔ ”میرا دارو کھتم ہو گیا ہے۔ دارو بنا میری رات نہیں کٹے گی۔ میں نے سوچا کہ رانی

کے آگے جھولی پھیلاؤں۔ جو کرپا کریں تو میری رات کٹ جائے۔“

”تو استری ہو کے دارو پیتی ہے۔“ رانی نے گھن کھا کر جھر جھری لی۔

”نہ مہارانی، جو میں استری ہوتی تو دارو پینے کی کیا جرورت تھی۔ جب میں استری تھی تو دارو نہیں پیتی تھی۔ پلایا کرتی تھی۔ لیکن

اب۔۔۔۔۔ اب میں وہ دن بھولنے کے لئے دارو پیتی ہوں۔“

”یہ کیا بول رہی ہے شوشی؟“ وجے نے کہا۔ ”کہتی ہے، میں استری نہیں۔“

شوبالا بولی ”استری ایک سوگند ہوتی جو کچھ دنناں رہتی ہے پھر اڈ جاتی اور پھر پھول کی جگہوں ڈنٹھل رہ جاتا ہے۔“

”تو راج بھون کی باندی ہے کیا؟“ شوشی نے پوچھا۔

”نہیں“ شوبالا نے کہا۔ ”میں باندی نہیں ہوں۔ آج سے تیس ورش پہلے میں بھی اسی رنگ بھون میں رہتی تھی۔ اسی دالان میں

جس میں تو رہتی ہے۔ اسی بیج پر سوتی تھی۔ جب مہاراج ماتری راج کے پتاراج سنگھاسن پر براجمان تھے۔ مہاراج مجھے آنکھوں پر

بٹھاتے تھے جیسے تجھے آج بٹھاتے ہیں۔ بات منہ سے نکلتی تو پورن ہو جاتی۔ یہ سب چو نچلے سندر تا کے کارن تھے۔ جیسے آج تیرے

چاؤ چو نچلے ہیں۔ پھر ایک دن آئے گا جب تو بھی ان دنوں کو بھولنے کے لئے دارو کا سہارا لے گی۔“

یہ سن کر وجے کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”تو کیا یہ ساری چاننی روپ کی ہے؟ میں کچھ بھی نہیں؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ شوبالا نے جواب دیا۔ ”جب تک دکان سچی ہے گا بکوں کی بھیڑ ہے جب دکان لٹ جائے تو استری کو کون

جانے ہے مہارانی۔“

”تو بکتی ہے، سب جھوٹ ہے۔“ وجے نے چیخ کر کہا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔“

بالکارک گیا۔ داس نے چونک کر دیکھا۔ تو بے پروا ہوا پھلکا جل کر کالا ہو گیا تھا۔ بملا سر جھکائے چٹائی کو کرید رہی تھی۔ شیلہ کی

نگاہیں جلتے بادلوں پر تکی ہوئی تھیں۔

”پھر کیا ہوا بالک مہاراج؟“ داس کی آواز سن کر وہ سب چونک پڑے۔ بالک نے بات چلا دی۔ بولا۔۔۔۔۔

”شوبالا کے جانے کے بعد وجے رانی بیکل ہو گئی۔ کیا یہ سچ ہے کہ سندر تا ہی سبھی کچھ ہے؟ استری کسی گنتی میں نہیں؟۔۔۔۔۔

نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ جھوٹ ہے۔ شوشی نے اسے بہت سمجھایا۔ مہارانی سچ کے کھوج کی لگن نہ لگا۔ سچ کوئی میٹھا پھل نہیں۔ وہ جھوٹ

جو شانت کر دے، اس سچ سے اچھا ہے جو اندر بھٹی سگا وے ہے۔ پرنتو مہارانی کو سچ کی ڈھونڈ کا تاپ چڑھا تھا۔ بولی ”منش کی رتھ

میں دو پہیے لگے ہیں۔ پرش اور استری۔ رتھ کیسے چل سکتی ہے جد توڑی دونوں پہیے برابر نہ ہوں۔“

”نہیں رانی“ شوشی نے کہا ”یہ پہیے برابر نہیں کارن یہ کہ پرش کا پہیہ چلے ہے۔ استری کھالی سجاوٹ کے لئے ہے۔ چلتا نہیں۔“

باندی نے وجے کو بہت سمجھایا پروہ نہ مانی۔ ”بالکارک گیا۔ پھر اس نے سراٹھا کر بملا شیلہ کی طرف دیکھا۔ بولا ”کنیاؤ! جس کے من میں سچ کی ڈھونڈ کا کیڑا لگ جائے پھر جیون بھرا سے نہ سکھ ملتا ہے نہ شانتی۔“

”یہ کیا کہہ دیا بالک مہاراج؟“ داس بولا۔

دوار کا داس بالک نے کہا۔ ”سچ بولو سچ کو اپناؤ سچ جیو پرنتو سچ کی ڈھونڈ میں نہ ٹکنا۔ سدا چلتے رہو گے۔ چلنے کے پھیر میں آ جاؤ گے۔ نہ رستہ ہوگا۔ نہ ڈنڈی نہ اور۔۔۔۔۔ اور نہ کہیں پہنچو گے۔ صرف چلنا چلتے رہنا۔“ بالک نے آہ بھری اور کہانی سنانے لگا۔

بولا۔۔۔۔۔ ”لاکھ سمجھانے پر بھی وجے رانی سچ کی ڈھونڈ میں چل نکلی۔ سب سے پہلے اس نے مہاراج کو پرکھنے کی ٹھانی کہ وہ مجھے برابر کا جانے ہیں کہ نہیں۔ اس کے من میں چنتا کا کاٹا لگ گیا۔ جوں جوں اس کی چنتا بڑھتی گئی۔ توں توں مہاراج اسے اپنے دھیان کی گود میں جھلاتے گئے۔ اس کے سامنے یوں سیس نواتے گئے جیسے وہ سچ مچی کی دیوی ہو۔ جوں جوں وہ دیوی کو مناتے گئے توں توں رانی کی کلپنا بڑھتی گئی۔ مہاراج مجھے مورتی نہ بنائیے۔ مندر میں نہ بٹھائیے۔ اپنے پاس بٹھائیے۔ اپنے برابر جانیے۔

مہاراج کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ برابر کیسے جانیں۔ جسے دھیان دیا جائے۔ مان دیا جائے۔ اونچا بٹھایا جائے۔ وہ برابری کیوں چاہے۔ جسے سارا دیا جائے وہ آدھا کیوں مانگے؟

وجے رانی کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ مہاراج اسے دیوی کے سامان بنا سکتے ہیں، مہارانی بنا سکتے ہیں، جیتی سمجھ سکتے ہیں، ساتھی نہیں بنا سکتے۔

یہ جان کر وجے نے ٹھان لی کہ وہ راج بھون کو چھوڑ دے گی۔ رانی نہیں بلکہ استری بنکر جئے گی۔ سندر تا کے جور پر نہیں، جیو کے جور پر۔ بھسوت مل کر سندر تا چھپائے رکھے گی اور کسی کے ساتھ بیاہ نہ کرے گی جب تک وہ اسے برابر کی نہ سمجھے، ساتھی نہ جانے۔

پھر ایک رات جب گرج چمک جوروں پر تھی اور راج بھون کے چوکیدار کونوں میں سہمے بیٹھے تھے تو وجے نے بھیس بدلا اور شوشی کو ساتھ لے کر چور دروازے سے باہر نکل گئی۔ چلتے چلتے وہ راج نگری سے دور ایک شہر میں رکیں۔ وجے گجارجے کے لئے پھلکاریاں بناتی۔ شوشی انہیں باجارجا کر بیچ دیتی۔

کچھ دنوں میں وجے کی پھلکاریاں کی مانگ بڑھ گئی۔ ”اتنی صاف ستھری پھلکاریاں کون بناوے ہے؟“ منڈی میں باتیں

ہونے لگیں۔ پھر بدیش سے ایک گھبرو بیوپاری آند آ نکلا۔ پھلکاریاں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اس نے شوشی کو ڈھونڈ نکالا۔ بولا ”یہ پھلکاریاں کون کاڑھتی ہے؟ مجھے اس کے پاس لے چل۔“ شوشی اسے گھر لے آئی۔ وجے کو دیکھ کر وہ پھلکاریاں بھول گیا۔ وجے پھلکاریاں دکھاتی رہی۔ آند وجے کو دیکھت رہا۔ وجے سمجھتی تھی کہ بھبھوت سندرتا کو ڈھانپ لیتی ہے۔ آند سوچتا رہا کہ جس گن کو استری اچھالتی ہے، یہ شریمتی اسے چھپا رہی ہے۔ اوش کوئی بھید ہے۔

آنند بہت سیانا تھا۔ اس نے شہر شہر کا پانی پی رکھا تھا۔ اس نے سوچا، پاؤں دھیرے دھیرے دھرو۔ بڑی پھسلن ہے اور جو گراتو یہاں سہارا دے کر اٹھانے والا کوئی نہیں۔ پہلے تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ پھر پاؤں دھرنا۔ تو وہ تیل کی دھار جانچنے کے لئے پھلکاریوں کے بہانے وجہ کے گھر آنے جانے لگا۔

دو چار پھیروں میں اسے پہچل گیا کہ سدرتا کی بات نہیں چلے گی۔ پریم کی بات نہیں چلے گی۔ ملائم بات نہیں چلے گی۔ لگاؤ کی بات نہیں بے لاگ، کھردری، گنوار۔

وہ بولا ”بی کاڑھن“ تو تو چوٹی کی چال چلے ہے۔ پر مجھے تو بہت سی پھلکاریاں چاہئیں تاکہ انہیں بیچ کر اپنا پیٹ پال سکوں۔“

پھر چار ایک دن کے بعد آئندہ جے سے بہت بگڑا۔ سب جھوٹ موٹ۔ بولا ”تو کام چور ہے ری۔ میں تیرے سر پر بیٹھ کر کام کراؤں گا۔“ اس بہانے وہ سارا سارا دن وجے کے گھر رہنے لگا۔ جوں جوں وہ اس کے نیڑے ہوتا گیا۔ اس کا من ہاتھوں سے نکلتا گیا۔

پھر ایک دن آنند نے اس کی بانبہ پکڑ لی۔ بولا ”بی کاڑھن میرا وہندا نہیں چلتا۔ اتنی کمائی بھی نہیں ہوتی کہ سوکھا گجارہ کر سکوں۔ جو تو مجھ سے بیاہ کر لے تو جیون سکھی ہو جائے۔ تو پھلکاریاں کاڑھے میں انہیں پیچوں۔ کام تیرا دوڑ دھوپ میری۔“

وجہ اس چال میں آگئی۔ اس کی مستاجاگ اٹھی۔ بولی ”میں تو اس سے بیاہ کروں گی جو پتی کو برابر کا سمجھے۔ نہ اسے دیوی بنائے نہ باندی۔ اپنا ساتھی جانے۔ دکھ کا ساتھی۔“

”ٹھیک ہے۔“ آئند بولا ”تو میری ساتھن ہے، ساتھن رہے گی۔“

جب وجہ دلہن بنی تو بھبھوت کا پردہ بھی اٹھ گیا۔ اندر سے رانی نکل آئی۔ آئندہ دک سے رہ گیا۔ پر بھوایسی مورتی۔۔۔۔۔“

مالکارک گیا۔

داس منہ کھولے بیٹھا تھا۔ چوہا ہل رہا تھا۔ تو اوجو کھالی پڑا تھا تپ تپ کر گلا ہو گیا تھا۔ پیڑا ہاتھ میں یوں دھرا تھا جیسے بالک کے

باتھ کا کھدو ہو۔

شیلہ کی نگاہیں گھاس پر بچھی ہوئی تھیں جیسے ڈھونڈ میں لگی ہوں۔ بھلا کی آنکھیں ڈبڈبا رہی ہوں۔ اب روئی کہ اب روئی۔

ٹیلے پر سائے منڈلا رہے تھے۔ بادلوں میں آگ جل رہی تھی۔ شام دبے پاؤں جا رہی تھی۔ رات اپنے پھڑپھڑا رہی تھی۔ ”پھر کیا ہوا بالک جی؟“ داس نے جیسے پچکی لی۔

بالک بولا ”آنند بہت بڑا سوداگر تھا۔ حویلیاں تھیں۔ نوکر چاکر تھے۔ دھن دولت تھی۔ کس بات کی کمی تھی اسے۔ وہ تو وجے کو رام کرنے کے لئے اس نے نرودھن کا سوانگ رچایا تھا۔ بس ایک بات سچ تھی۔ وہ تن من دھن سے وجے کا ہو چکا تھا۔

اس کا باہر ج انے کو جی نہیں چاہتا پر کیا کرتا۔ اتنا بڑا بیو پار تھا۔ اس کی دیکھ بھال تو کرنی ہی تھی۔ اسے جانا ہی پڑتا۔ پھلکاریاں بیچنے کے بہانے چلا جاتا۔ دونوں باہر رہتا۔ چلا جاتا تو جیسے گھر کا دھیان ہی نہ ہو۔ آ جاتا تو جیسے جانے سے ہول کھاتا ہو۔

پھر یہ بھی تھا کہ اس نے وجے کو پھلکاریاں کاڑھنے سے روک دیا تھا۔ بولا ”تجنی تو سال میں ایک ٹھاٹھ کی پھلکاری بنا دیا کر۔ ایسی جو راجارانی جوگی ہو۔ ایسی جو ایک بیچ لی تو گھر میں لہر بہر ہوگئی۔

اس پر وجے سوچ میں پڑ گئی۔ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ جب وہ آیا تو اسے کہنے لگی۔ ”رے تو مجھ سے اپنے بیو پار کی بات کیوں نہیں کرتا؟“

آنند نے جواب دیا ”ساتھن بیو پار میں اونچ نیچ ہوتی ہے۔ پھن پھریب ہوتا ہے۔ چھل بٹے ہوتے ہیں۔ بیو پار کی بات سن کر کیا کرے گی؟“

وجے بولی ”دیکھ میں تیری ساتھن ہوں۔ برابر کی ساتھن۔ اور ساتھی کھالی سکھ کا نہیں ہوتا۔ دکھ کا بھی ہوتا ہے۔ اونچ کا نہیں نیچ کا بھی ہوتا ہے۔ تو مجھے اپنے بیو پار کی ساری بات بتا۔ اپنے دکھ گنوا۔“

اس پر آنند نے اسے ایک لمبی چوڑی عطا طوطا مینا کہانی سنائی کہ کس طرح نگر نگر پھرا۔ راجاؤں رانیوں سے ملا۔ انہیں پھلکاری دکھائی اور انت میں اک راج نرنگی پھلکاری کو دیکھ کر اس پر لٹو ہوگئی۔ بولی ”بول بیو پاری منہ مانگے دام دوں گی۔“

اس رات وجے کو یوں لگا جیسے آنند اس کا جی بہلانے کے لئے کہانی سنارہا ہو۔ سلانے کے لئے لوری دے رہا ہو۔ اس پر وہ سوچ میں کھوگئی۔ من میں گھنڈی پڑ گئی۔ بولی ”شوشیہ تو وہ نہیں جو یہ کہے ہے۔ جو بھید ہی نہ دے وہ ساتھی کیا بنے گا۔“

”دیکھ رانی“ شوشی بولی ”وہ اوش بھید رکھے ہے پر اس کے من میں دوج نہیں، کھوٹ نہیں۔ پرش تجنی کو اپنے بیو پار کا بھید کبھی نہیں

دیتا۔ وہ اسے ساری بات کبھی نہیں بتاتا۔ جرور ڈنڈی مارے ہے۔ یہی جگ کی ریت ہے۔“

”تو کیا وہ استری کو اس جوگا نہیں جانتا کہ ساری بات جانے۔ یہ تو ساتھ نہ ہوا۔ برابری نہ ہوئی۔ جاشوشی منڈی میں جا کر پوچھ گچھ کر۔ اس کے بھید کا پتہ لگا۔“

شوشی نے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ آئندہ تو ایک راج بیو پارے ہے۔ اس نے بیجا نگری کی مہارانی کے لئے شیش بھون بنوانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔

جب وجے نے یہ سنا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ ”تو پھلکاریاں بیچ کر گیارہ کرنے کی بات ایک بہانہ تھی۔ کیوں شوشی۔۔۔۔۔۔ تو کیا کہتی ہے؟“

شوشی نے وجے کو بہت سمجھایا بھجایا کہ دیکھ دنیا اس سے اچھا جیون ساتھی تجھے نہیں ملے گا۔ اس سے جیادہ برابری کوئی نہ دے گا لیکن وجے نہ مانی۔ شوشا تنے پردے اوپر کچھ۔ بھتیر کچھ۔ نہ شوشی جہاں پردے ہوں، جھوٹ ہو، دکھاوا ہو، برابری کیسی۔ چل شوشی کسی ایسی جگہوں چلیں جہاں پردہ نہ ہو، جھوٹ نہ ہو۔ اب یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔“ بالاکارک گیا۔

”تو کیا وجے آئندہ کو چھوڑ کر چلی گئی؟“ شیشا نے پوچھا۔

”ہاں، چلی گئی۔“ بالاکا بولا

بھلا نے ایک لمبی آہ بھری۔

”پھر وجے کہاں گئی؟“ داس نے پوچھا۔

”پہلے وہ ایک پجاری کے چھندے میں پھنس گئی۔ پجاری نے اسے داسی بنالیا۔ پر بھوکی داسی۔ پھر آپ پر پھو بن بیٹھا۔“

وہاں سے بھاگی تو ایک زنگی کے جال میں جھا پھنسی۔ اس نے اسے اپنے چو بارے میں سجالیا۔ چو بارے سے اسے ایک راج گائیک لے اڑا۔ وہاں سے بھی اسے برابری نہ ملی۔ گائیک سارا دن ستار سینے سے لگائے رکھتا۔ پھر تھک کر ماندگی اتارنے کے لئے وہ وجے سے دل بہلاتا۔

”چل شوشی“ ایک دن وجے نے کہا ”یہاں تو راگ ودھیا کا راج ہے۔“

شوشی بولی ”دنیا جو چاہے ہے، وہ ادھر نہیں ملے گا جہاں دھنوان بستے ہیں۔ وہ ادھر ملے گا جہاں زردھن بستے ہیں۔ کامی بستے ہیں۔ جہاں پرش پتی کے سہارا لئے بغیر کچھ کر نہیں سکتا۔ جہاں پتی نہ موہ ہوتی ہے نہ مایا۔ بس ایک باجو ہوتی ہے۔ پہلے سہارا ہوتی ہے، پھر

کچھ اور۔ جہاں دو بچے کے بنا گیارہ نہیں ہوتا۔ وہاں استری کو برابری مل جائے تو مل جائے۔“
”وہ کون سی جگہوں ہے؟ کہاں سے شوشی؟“ وچے نے پوچھا۔

”وہ جگہ وہاں ہے جہاں دھن کا جور نہیں ہوتا۔ کام کا کا ہوتا ہے۔ دیکھو دنیا تو مان نہ مان۔ پرنتو استری جیو کی دھرتی ہے۔ جس کے دم سے جیو کو نیل ہری رہتی ہے۔ استری کی ساروہی جانے ہے جو دھرتی کی سار جانے ہے۔ جو بونا لگانا جانے ہے جو کھیتی اگائے ہے۔ جس کا گیارہ دھرتی کی پیدا پر ہے۔ بس وہی استری کو باجو سمجھے ہے۔ اپنے سا جانے ہے۔“

وچے کے دل میں بات اتر گئی۔ ایک بار پھر وہ گھر چھوڑ کر نکل گئیں۔ شہر سے دور گاؤں کی او۔ شوشی نے وچے کو موٹے کپڑے پہنا دیئے۔ منہ پر ہلدی کا لک کا اٹن مل دیا۔ بولی ”یہاں استری استری ہوتی ہے۔ گن کے جور پر نہیں۔ جیو کے جور پر۔ یہاں سندر تا شو بھانہیں رستے کی روک ہے۔ تو اپنی سندر تا کو چھپا رکھنا۔ جو نجر آگئی تو گڑ بڑ ہوگی۔“

”شوشی“ وچے بولی ”میں اس سندر تا کے کارن بڑا دکھی ہوں۔ کوئی بس بھری بوٹی ڈھونڈ لاکہ میں مکھ پر مل لوں جو سندر تا کی کاٹ کر دے۔“

شوشی ہنسی بولی۔ ”بھولی رانی“ سندر تا مکھ پر نہیں ہوتی۔ سارے پنڈے میں ہوتی ہے۔ انگ انگ سے پھوٹتی ہے۔ بات ہلانے میں ہوتی ہے۔ پگ دھرنے میں ہوتی ہے۔ آنکھ اٹھانے میں ہوتی ہے۔ ہونٹ کھلنے میں ہوتی ہے۔ تو اسے اپنے سجاوے سے کیسے نچوڑ پھینکے گی؟“

گاؤں میں پہنچ کر انہوں نے ایک جھگی میں ڈیرا کر لیا اور کھیت میں کپاہ کے پھول چننے لگیں۔

ایک دن لاکھا کسان نے وچے سے کہا تو کیسی جتانی ہے ری۔ تیری انگلیاں تو قینچی سے چلتی ہیں۔“ اس نے وچے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انگلیاں دیکھیں تو شپٹا گیا۔ ”ری یہ کیسی انگلیاں ہیں؟ انگلیاں ہیں کہ رس بھری پھلیاں۔ اتنی لمبی اتنی پتلی۔“

پھر وہ روز اس کی چلتی چنتی انگلیاں دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے ایک دن انگلیاں پکڑ کر بولا ”ری تو میرے گھر کیوں نہیں بیٹھ جاتی۔ میں اکیلا ہوں۔ پتا جی پر ماتما کو پیارے ہو گئے۔ ماتا بہت بوڑھی ہے۔ میرا ہاتھ نہیں بنا سکتی۔ بھائی بہن ہیں نہیں۔ اکیلا ہوں۔ تو میرا باجو بن جاری۔ میں ہل چلاؤں گا تو بیج ڈال۔ میں پانی دوں تو کھیت کی بوٹی چن۔ میں گیہوں کاٹوں تو دانے نکال۔ پھر ہم کسی سے پیٹے نہیں رہیں گے۔ میں جو آدھا ہوں پورن ہو جاؤں گا۔“ اس کی بات میں نہ موہ تھی نہ کامنا۔ نہ لوبھ۔

وچے کو اپنی شرط بھی بھول گئی۔ اس نے ہاں کر دی۔ پھر وہ دونوں کھیت پر کام میں جت گئے۔ لاکھا نہ اسے نزل سمجھتا نہ ماڑی۔ نہ سندر نہ دیوی۔ وہ تو اس کا باجو تھی۔ پھر کوئی بات اس سے چھپاتا بھی تو نہ تھا۔ کیسے چھپاتا۔ ہر سے وہ دونوں اکٹھے رہتے۔ کھیت میں۔

گھر میں۔ ہر بات میں اس کی مرضی پوچھتا۔ کام میں اسے ذرا چھوٹ نہ دیتا۔

و بے نہال ہو گئی۔ سمجھی جیسے جل نکڑی جو ہڑ میں آ گئی ہو۔ لاکھ کسان کو وہ کی ایک بات پر بڑی چڑھتی۔ کہتا ”ری تو گندی کوئیں رہتی ہے۔ نہ بات دھوتی کیوں نہیں؟ منہ پر جردی چھائے رہتی ہے۔ الیاں بلیاں لگی رہتی ہیں۔ بال چکٹ۔ آنکھوں میں کچھ۔“ وہ بے سن کر گردن لٹکا لیتی۔

ایک دن جب وہ دونوں ندی کے کنارے کھڑے تھے تو لاکھانے تاؤ کھا کر بالٹی اٹھائی اور وجے پر انڈیل دی۔ پھر بالٹی پر بالٹی گرانے لگا۔ وجے بھاگی تو اس نے اسے پکڑ کر ندی میں چھلانگ لگا دی اور اسے یوں دھونے اور مانجنے لگا جیسے وہ رسوئی کی گڈوی ہو۔

پھر جب وہ اسے کھینچ کر پانی سے باہر لایا تو اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ سنہرے لانے بال۔ موری گردن۔ کٹورہ سی آنکھیں۔ دھاری ناک۔ پھول سے ہونٹ۔ چھوٹی موٹی سا بدن۔۔۔۔۔۔ ”تو کون ہے ری؟“ وہ گھگھیا کر بولا ”تو استری تو نہیں۔ تو تو پری ہے ری پری۔“

بالکا کچھ دیر کے لئے چپ رہا۔ پھر بولا ”بس اس دن سے لا کھے کے من میں جھجک بیٹھ گئی اور وہ وجے سے دور ہوتا گیا۔ وجے نے بار بار اسے سمجھایا۔ ”دیکھ لا کھے میں پری نہیں، استری ہوں، استری۔“ پر اس کی جھجک نہ گئی۔ بولا ”تو پری نہیں تو استری بھی نہیں۔ تو مور ہے میں کاگ ہوں۔ تیرا میرا کیا سمبندھ؟ کارن یہ کہ تو کامیوں میں سے ناہیں۔“

کچھ دنوں کے بعد اس کا منہ بکھلتی رہی۔ پھر نراش ہو گئی۔ پھر ایک دن وہ شوشی سے بولی ”چل شوشی یہاں ہمارا دانا پانی کھتم ہو گیا۔“ شوشی نے سر جھکا لیا اور جوں کی توں بیٹھی رہی۔ جیسے بات سنی ہی نہ ہو۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتے رہی۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ شوشی اب لاکھ کی ہو چکی تھی۔ وہ بے کادل دھک سے رہ گیا۔ اور وہ چپ چاپ اکیلی باہر نکل گئی۔“

بالکا چپ ہو گیا۔ سبھی چپ ہو گئے تھے۔ کسی کو ”پھر کیا ہوا؟“ پوچھنے کا دھیان نہ رہا تھا۔ پھر بالکے نے کہا۔ ”پھر پتہ نہیں۔۔۔۔۔ کہتے ہیں وہ آج تک برابری کی ڈھونڈ میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ آج بھی رات کے سسے راج گڑھی سے آوا جیں آتی ہیں۔۔۔۔۔ پھر بھوباہر کی سندرتاکو بھستیر میں رچا دے کہ استری، استری بن جائے۔۔۔۔۔ پرش کی کامنا کے ہاتھ کا کھلونا نہ رہے۔

[illegible]

انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ سوامی جی دوار کے باہر کھڑے تھے۔



باجوؤں کی ڈھونڈ

پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ نجر دھند لا گئی ہے۔ جاگتے ماں اپنے دکھیں ہیں۔ دل کو دھڑکن لگ گئی ہے۔ ڈاکدار کہے ہے، دل ماں کا ثنا لگ گیا ہے۔ لو اس عمر ماں بھلا کیسے لگے گا کا ثنا اور پھر اس گھر ماں، یہاں تو آرام ہی آرام ہے۔ یوں پڑا ہوں جیسے سونے کی مٹھی کی

ڈلی ماں پڑے ہووے ہے۔

یہ کمرہ جہاں رہتا ہوں، ماں انڈے کی طرحیوں چمکے ہے۔ نیچے گلچہ بچھا ہے۔ اتنی صفائی ہے کہ کھلتی ہے ایمان سے۔ کھانا ماں
وخت پر روٹی لاوے ہے۔ وخت پر نشہ، وخت پر چاہ، وخت پر دودھ۔ نہ ڈینگ رم ماں جانا نہیں پڑے ہے۔

شیدے نے پہلے روج ہی کھانا ماں سے بول دیا تھا۔ دیکھو کھانا ماں بڑے چودھری صیب کا نشہ لُج ادھر لگے گا۔ بڑے صیب کے کمرے ماں اور ڈینگ روم میں لگنے سے ادھ گھنٹہ پہلے لگے گا۔ بعد ماں نہیں۔ ساتھ نہیں۔ پہلے۔۔۔۔۔ سمجھے؟

شیدا بڑا کھیال رکھے ہے۔ روج آوے ہے اک وار اس کمرے ماں۔ چٹھن کے لئے۔ بہووی کدی کدی آ جاوے ہے نجر آتے جاتے۔ بڑی اچھی ہے۔ سلام کرے ہے۔ کچھے ہے بابا اچھے ہیں۔ آپ مسکا کے بات کرے ہے پر چلتے چلتے۔

آج کل رواج ہی ایسا ہے۔ بہویں رکتی نہیں! پجاری کیا کریں۔ رکنے کا ٹیم نہیں ہوتا۔ اندر اتنی جان ہوتی ہے کہ رکنے نہیں دیتی۔ ہمارے جمانے ماں بھی جان ہوا کرے تھی۔ گھر والی ماں بڑی بڑی جان ہوتی تھی۔ پر وہ ٹھنڈی جان ہووے تھی۔ اب تو تھی ہووے ہے۔ بڑی تھی۔ اتنی تھی کہ بھڑاس نکلے ہے۔ پہلے بھی بھڑاس ہووے تھی۔ پردے نکلے نہیں تھی۔ جلی پاتھی کی طرحیوں اوپر سے کالی سوا۔ نیچے لال انگارہ۔ اب تو لال انگارہ اوپر ہووے ہے۔ وخت وخت کی بات ہے بھائی۔ کدی مال بھتیر چھپا کر رکھیں ہیں۔ کدی باہر سجا کر رکھیں ہیں۔

سارا دن ماں اپنے بنے سچے کمرے میں ماں ارام سے پڑا رہوں ہوں۔ بس ایک تخلیف ہے، اسان نہیں دکھتا۔ بچنے سے ایک عادت پڑی وی ہے کہ اسان دکھتا رہے۔ جو اسان دکھتا رہے تو حوصلہ رہے ہے۔ پتہ نہیں کیوں؟ ایک تو دل تنگ نہیں ہووے ہے۔ دو بے جندگانی بند بند نہیں لگے ہے۔ پھر یہ بھی کہ اسان دکھے ہے تو اسان والا بھی دور نہیں لگے ہے۔ جیسے نیڑے نیڑے ہو۔ پاس ہو ساتھ ہو۔ اک تسلی سی رہے ہے۔ جندگی میں کیا چاہیے، بس اک تسلی اور کیا۔

اس کمرے میں ماں اسمان نہیں دکھے ہے۔ بس یہی اک تحلیف ہے۔ بڑی تحلیف ہے پھر درو جے ہیں۔ ساری عمر کھلے درو جوں ماں بتائی۔ پر اس کمرے کے درو جے بند ہی رہے ہیں۔ کھلتے تو ہیں پر کھل کے نہ ہی دیتے۔ پھٹ سے بند ہو جاویں ہیں آپ ہی آپ۔ پھر درو جوں پر پردے پڑے رہیں ہیں۔ یہ سیسے کا ہے۔ یہ جالی کا، یہ گرل کا، یہ کپڑے کا۔ پردے ہی پردے پر دے ہی پردے۔ بھلا اسمان کیسے نجر آئے۔ بس جمین ہی جمین دکھے ہے۔ وہ بھی سچی کھچے والی۔ مٹی والی دھرتی نہیں دکھتی۔ بولے نہیں دکھتے۔ ویسے بولے تو بہت ہیں بنگلے ماں۔ وہ بھی طرحاں طرحاں کے۔ پر سبھی بناوٹی، گملوں والے دھرتی والے نہیں۔

چلو اسمان نہیں دکھتا تو سہی۔ اتنی سی بات سے کانٹا تو نہیں لگتا نادل ماں۔ پھر ڈاکدار کیوں کہے ہے کانٹا لگ گیا ہے۔ بھیا، کانٹا تو دکھ میں لگے ہے سکھ ماں تو نہیں لگے۔ ماں تو یہاں سکھ میں پڑا ہوں۔ سمجھ کر لو جس طرحیوں گری بادام میں پڑی ہووے ہے پھر کانٹا کیسا؟

ہاں ایک بات جرور ہے، نجر دھندلا گئی ہے۔ منے یہ بات ڈاکدار کو نہیں بتائی جو بتا دیتا تو وہ کچھتا۔۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کیا کچھتا۔ ویسے بھی ماں باجوؤں کی بات تو بتا بھی دیتا تو کیا وہ سمجھ لیتا۔ ماں تو کھد نہیں سمجھ پایا باجوؤں کی بات کو۔ پھر بھلا وہ سے کیسے سمجھتا۔ منے تو اپنے پتر شیدے سے نہیں کری بات۔ بھلا یہ بتاؤ جس بات کا نہ سر ہونہ پیر، وہ سے کون سمجھائے، کون سمجھے۔

اور کوئی سمجھے بھی کیسے باجوؤں کی بات۔ باجوؤں کا تو جمانہ ہی نہ رہا۔ وہ تو کد سے کھتم ہو گیا۔ اب تو باجوؤں نے روپ ہی بدل لیا ہے۔ وہ تو گلے کا ہار بنے دے ہیں۔ اب وہ پرانے جمانے کے باجو کہاں۔ اب تو کھالی جسم رہ گیا ہے۔ تیکھا، قزدا۔ یوں جیسے تیر کمان پہ چڑھا ہو۔ اب چھوٹا کہ اب چھوٹا۔

یہ جب اور اب کا جھگڑا سدا کا ہے بھائی۔ ہمیش جب جب رہا اور اب اب۔ نہ کدی جب اب ہوا نہ اب جب۔ دونوں ماں پھا صلا ای رہا۔ اب تو یہ پھا صلا روج بروج بڑھتا ہی جاوے ہے۔ دناں ماں صدیاں کا پھرق پڑتا جاوے ہے۔

ہاں تو نجر کی بات کر ریا ماں۔ اپنی نجر دھندلائے کچھ زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی۔ یہی چار ایک سمجھتے ہوئے ہوں گے۔ نہیں بھی دیکھنے ماں میں تو پھرق نہیں آیا۔ سب کچھ دکھے ہے۔ ٹھیک ٹھاک دکھے ہے۔ کمرے کی تاکیاں دکھیں ہیں۔ درو جے دکھے ہیں۔ پردے دکھیں ہیں۔ کوچ دکھے ہیں۔ میج دکھے ہے۔ سب چیمیں دکھیں ہیں۔ صاف دکھیں ہیں، کوئی چیچ نہیں دھندلائی۔ صر پھ نظر دھندلائی ہے۔ یوں کہ کھا کھواہ کی چیمیں دکھنے لگی ہیں۔ وہ بھی بہتی نہیں، صر پھ دو باجو۔

دو باجو میرے کمرے ماں گھس آئے ہیں۔ وہ میرے آسے پائے یوں گھو میں پھریں ہیں جیسے سریت کی بوتل کے گرد کھیاں۔

پہلے دناجد میں نے باجوؤں کو دیکھا تو ماں گھبرا گیا۔ ایمان سے رت کا وخت تھا۔ بشیر اکھانساں آیا۔ وئے روٹی میج پر رکھ دی۔ اس وخت کھانے کو جی نہیں چاہے تھا۔ منے سوچا، چلو کھا لو۔ چودھری فضلے دو برکیاں۔ پھر ارام سے حقہ پیوں گا۔

حقہ مجھے بہت پیارا ہے۔ سمجھ کر لو یہی اک ساتھی رہ گیا ہے پرانے دناں کا۔ میرے پاس بیٹھ کر رات گے توڑی مجھ سے باتاں کرتا رہے ہے۔ اپنی کہے ہے۔ میری سنے ہے۔ گھر ماں کسی کو میرا حقہ پسند نہیں۔ کھاناں اسے ہاتھ نہیں لگائے ہے۔ ماں کھدی تاجا کروں ہوں۔ کھدی چلم پھروں ہوں۔ بہو تو کہے ہے۔ ہئے، بو، بو، بو لے جاؤ اسے یہاں سے، مجھے نخرنے آئے۔ شیدے نے منہ کھول کر کدی نہیں کہا کچھ۔ آنے بہانے بہت کچھ کہا۔ کہنے لگا، بابا سگریٹ کا بڑا ڈبہ منگوادوں، کدی حقہ نہ بھرا، سگریٹ پی لیا۔ اک روج وہ لے بھی آیا بڑا ڈبہ جس ماں ڈبیاں تھیں۔ میرے کمرے میں میں چھوڑ گیا وئے۔ مہینہ بھر پڑا رہا یہاں جوں کا توں بند کا بند۔ منے منہ نہ لگا یا۔ کیسے لگا یا؟ بھائی کہاں گونگا چرٹ کہاں باتاں کرنے والا حقہ۔ ماں اپنے اپنے دکھ سکھ کے ساتھ کو کیسے چھوڑ دیتا بھلا۔ ایک ہی تو ساتھی ہے اپنا اس بھرے گھر میں۔

ہاں تو میں اس روج کی بات کر رہا تھا، منے سوچا، چودھری فضلے کھالے دو برکیاں۔ پھر ارام سے بیٹھ کر حقہ پیئیں گے۔ لوجی ماں میج پر جا بیٹھا۔ روٹی والا رومال کھولیا۔ پتہ نہیں دو باجو کہاں سے تیرتے وئے آئے۔ اک باجو کا ہتھ کھلا اور وں نے پلپلیاں سے روٹی اٹھا کر میرے ہتھ تھادی۔ ماں تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ حریان۔ پھر دو باجو میرے آسے پاس ہی رہے۔ بوٹی کھانے لگا تو دو انگلیوں نے پکڑ کر سامنے رکھ دی۔ پانی پینے لگا تو گلاس ہتھ ماں پکڑا دیا۔ ماں تو حریان۔ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

بس اس روج سے آج توڑی یہی ہو رہا ہے۔ دن رات اندھیرے سویرے سر بھارا بھارا ہو تو انگلیاں پڑ پڑیاں سہلاویں ہیں۔ تھکاوٹ ہو تو ہاتھ پنڈلیاں دباویں ہیں۔ اٹھتا ہوں تو باجو سہارا دیویں ہیں۔ کھاٹ سے اٹھوں تو جو تا سامنے رکھ دیویں ہیں۔ دروجہ کھولیں ہیں۔ قدم قدم پر سنبھالا دیویں ہیں۔

پہلے تو ماں سمجھا سٹھیا گیا ہوں۔ بہن گڈمڈ ہو گیا ہے۔ نخر تما سے کھیل رہی ہے۔ پھر سوچ سوچ کر ماں نے کہا۔ چودھری فضلے یو بات نہیں، نہ تو جہن دھندلایا ہے نہ نخر۔ یہ کچھ اور ہی بات ہے۔ سوچتا ریا، دیکھتا ریا۔ باجو چنے نہیں، گورے نہیں، بدامی ہیں۔ بھرے بھرے سوکھے نہیں۔ بنے سبے نہیں جیسے آج کل ہوویں ہیں، نہ رنگدار نہ ریسیمیں نہ ملیم۔ پر ہیں صاف ستھرے۔ درستی نہیں کامی ہیں۔ انگلیاں یہ موٹی موٹی ہیں، بھنڈیوں کی طرحیوں نہیں، نہ کولیاں نہ تکی پتنگ۔ نخون بڑھے وئے نہیں چھریوں کی طرحیوں۔ کٹے وئے ہیں۔ رنگ دار نہیں ساد مرادے ہیں۔ یو باجو آج کل کے باجو نہیں۔ چھیڑتے نہیں، سنبھالتے ہیں۔ ڈولتے نہیں، سہارا دیویں

ہیں۔ دکھنے والے نہیں کامی ہیں۔ تو بھائی ماں دیکھتا رہا دیکھتا رہا۔

کدی کدی لگتا جیسے جانے پہچانے ہوں۔ دیکھن ماں نئے پرورتن ماں جانے پہچانے۔ میرے آسے پاسے ہوا ماں تیریں ہیں تو ان جانے دکھے ہیں۔ سرد باویں ہیں۔ سہارا دیویں ہیں تو جانے لگیں ہیں۔ پھر اک دن بھید کھل گیا۔

میری نجر باجو کی کنی پر جا پڑی۔ پھوڑے کا اتنا انسان۔ ارے یو تو سگو کے باجو ہیں۔ پھر ماں سوچن لگا۔ چودھری فضلے یہ جو تجھے دن رات سگو کے باجو دکھنے لگے ہیں۔ کیا تجھے وس سے موحوت تو نہیں ہو گئی۔۔۔۔۔۔ پھر ماں کھدی ہنس پڑا۔ یہ موحوت کی بات بھی ایک رہی۔ چودھری فضلے جندگی کے تہہ ورے تو نے سگو کے ساتھ گجا دیئے۔ تہہ ورے۔ پر تجھے وس سے موحوت نہ ہوئی اور اب جدا سے مرے وے پنچ ورے ہو گئے ہیں اب کیا تجھ وس سے موحوت ہو گئی ہے۔ اس پر ماں اتنا ہنسا اتنا ہنسا کہ آنکھوں ماں آنسو آ گئے۔

اور پھر سگو سے موحوت۔ سگو سے کیسے موحوت ہو سکے ہے بھلا۔ سگو تو باجو ہی باجو تھی۔ خالی باجوؤں سے کون موحوت کر سکے ہے بھلا۔ اس اللہ کی بندی نے نہ کدی منہ کی کٹڑی سجائی نہ لٹکائی نہ ہی سامنے دھری۔ منے بھی کدی منہ کی طرح پھو دھیان نہ دیا۔ ویسے سگو کا منہ بھی تھا اور جو بنا تو بڑے جور کا تھا۔ تیکھا۔ کانٹے کی طرحیوں چھیننے والا۔ چھیل دیوے تھا۔ پروسنے اسے موٹی چدر ماں ہی لپیٹے رکھا۔ ہمیش یوں جیسے چوری چوری کی چیچ ہو۔ وسنے تو سب کچھ ہی لپیٹے رکھا سب کچھ۔ بس ایک باجو ہی کھلے چھوڑ رکھے تھے۔

سارا دن وسکے باجوؤں سے بھرا رہتا تھا۔ ادھر وہ کپڑے دھو رہے ہیں۔ ادھر بھانڈے مانج رہے ہیں۔ پھر دیکھو تو جلتے تنور میں لٹکے وے ہیں۔ چائی کے گرد گھوم رہے ہیں۔ آنا گوندھ رہے ہیں۔ بلوہنی سے چھنے وے ہیں۔ مجھ دوہ رہے ہیں۔ گتاوا کر رہے ہیں کچی بنا رہے ہیں۔ ماں کھیت ماں بیٹھا روٹی کھا رہا ہوں۔ وے پنکھا کر رہے ہیں۔ ماں حقہ پی رہا ہوں وے ٹوپی ماں تاجہ انکارے رکھ رہے ہیں۔ ماں تھک گیا ہوں وے مٹھیاں بھر رہے ہیں۔

تہہ ورے میرا گھران باجوؤں سے بھرا رہا۔ اور صر پھ گھر ہی نہیں میرے کھیت ماں بھی وہ بوٹوں کی طرحیوں لہلہاتے رہے۔ سگو ماں جنانی بھی تھی یونہی کہ کھالی باہاں ای باہاں تھیں۔ یوں سمجھ کر لو کہ وہ آلوکا بوٹا تھی۔

جنانی بھتیہ تھی۔ باہر باہیں لہلہا میں تھیں۔ آج کل کی جنانی تو دھنیا ہو وے ہے۔ سب باہر ہی باہر اور پھر دور دور تک مشک

مارے ہے۔ وخت وخت کی بات ہے بھائی۔ کدی مشک لکونے کا جمانہ کدی مشک مارنے کا۔

کدی کدی سگو کی جنانی بولا بھی کرے تھی۔ اکھ سے اکھ ملا کر نہیں جھکی نجر سے چلتے چلتے۔ کہتی رے بہت بھارا ہو گیا ہے میرا پنڈا۔ اسے ہولا کر دے۔

کدی کدی کہے تھے یو بات۔ دو چار مہینوں ماں اک ادھ واری۔ کدی ماں کہہ دیتا ہنس کر رری تو بھاری ہو رہی دکھے ہے اور وہ مسکا کر نجر پیچی کر لیتی۔

ہمارے وہ پہلے پہل کے دن کٹھن تھے۔ ماں بھی لٹا پٹا کیلا پلاں والے پہنچا تھا۔ وہ بھی روئی روئی رلی وی بے سہارا پتہ نہیں کہاں سے آئی تھی۔ تقدیر نے جوڑ ملا دیا۔ گاؤں کے چودھری نے تھوڑی سے جمین دے دی۔ اک ٹوٹا پھوٹا گھر دے دیا۔ پھر ماں مل پر جت گیا۔ وس نے باجو نکال لئے۔ جتنی ویڑے کی دھریک نے ٹہنیاں نکالیں، تنی سگونے باہیں نکالیں۔ دھریک نے ویڑے پر چھاؤں کر دی۔ گھر میں سگو کے باجوؤں نے لہر بہر کر دی۔ کھیت ماں پیدا بڑھی تو مجھ لے لی۔ گھر ماں دودھ دہی کی دھاراں چلنے لگیں۔ وسنے صر پھ ایک پتر دیا شیدا۔ وہ بھی اتنا لیق فیت کہ جس مدر سے ماں گیا، وجیفہ لیا۔ ماسٹر نے کہا، چودھری تیرا پتر بڑا صیب بنے گا۔ سو بن گیا۔

پھر بھی وہ پہلے پہل کے دن بڑے کٹھن تھے۔ جو سگو کے باجو پتو ار نہ بنتے تو ناؤ ڈولتی رہی رہتی پار نہ لگتی۔ بڑی اونچ نیچ دیکھی ان دنوں۔ بڑی جورا جوری کرنی پڑی۔ پر اب ماں سوچوں ہوں کہ مشکل کے دن آرام کی دنوں سے اچھے ہو ویں ہیں۔ اونچ نیچ کی لہریں چلتی رہیں تو جندگی ماں حرکت برکت رہے ہے۔ کھالی آرام تو لوہے کو بھی جنگ لگاوے ہے۔

ان دنوں جد ماں سام کے وخت اسماں تلے بیٹھ کر حقہ پیتے وے کھیت کو دیکھتا تو جی کھش ہو جاتا۔ گھر کو تو سگو کے باجوؤں نے میرے لئے تخت بنا رکھا تھا۔ اور میری پگڑی پر طرہ لہرا رکھا تھا۔ اتنی عبت تھی گاؤں ماں۔

کدی کدی اسماں تلے بیٹھے وے اوپر سے اک اواج سی آتی۔ چودھری فضلے کچھ اور چپے تو مانگ لے اور ماں ہنستا۔ کیوں کھول کرے ہے رے۔ باجوؤں کے تخت پر بٹھا دیا۔ پگ پر طرہ طہر ادا دیا۔ پتر کو بڑا صیب بنا دیا۔ اب اور کیا مانگوں۔

پھر اک دن بیٹھے بٹھائے سگو پھوت ہو گئی۔ کیلجے ماں پیڑ اٹھی۔ باہیں اٹھا کر بولی۔ رے پکڑ لے رے مجھے۔ پہلی بار دونوں باجو میرے گلے میں ڈال دیئے کھلے بندوں۔ پھر اک ہچکی لی اور ٹھنڈی ہو گئی۔ پھر شیدا گاؤں آیا۔ ماں کو وہیں پلاں والے ماں دفنا دیا اور مجھے جبر دستی ادھر لے آیا۔ اپنے بنگلے ماں۔

کھل بندھنا

مندر کے احاطے سے گزرتے ہوئے سیوا کارن، بانورے کو بڑکے درخت تلے بیٹھا دیکھ کر رک گئی۔ بولی ”ارے تجھے کیا ہوا جو یوں بانپ رہا ہے تو؟“

بانورے نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ بولا ”سیواکارن سامان اٹھاتے اٹھاتے ہار گیا۔“

”کیسا سامان رے؟“ سیواکارن نے پوچھا۔

”اب کی پورن مشی میں اتنی ساری چاتریاں آئی ہیں کہ حد نہیں۔“

”چالیس سے اوپر ہوں گی۔ ان کا سامان۔۔۔۔۔“

”چالیس سے اوپر۔۔۔۔۔؟“ سیواکارن نے حیرانی سے دہرایا۔

”ہاں دیوی“ وہ بولا ”سب کچی عمر کی ہیں۔ لڑکیاں ہی لڑکیاں۔ کچی عمر کی بس چار ایک ہوں گی۔ پر وہ بھی لڑکیاں سامان دکھتی ہے۔ مجھے تو یوں لگے ہے جیسے سارا کالج ہی ادھر آ گیا ہو۔“

یہ سن کر سیوا کارن سوچ میں پڑ گئی۔ جیسے چپ لگ گئی ہو۔ پھر بولی ”تپسنی مہامان کا کہنا سچ ہو رہا ہے۔ وہ کہتا کرتی تھی، سیوا کارن کلجگ میں نہ استری رہے گی نہ ناری۔ صرف لڑکیاں رہ جائیں گی، ابلائیں۔ پھر متا کا دھارا سوکھ جائے گا۔ ناتے ٹوٹ جائیں گے۔ یرش اور ناری کا فرق مٹ جائے گا۔ ایک کو دوسرے سے یرکھنا مشکل ہو جائے گا۔“

”ہاں یہ تو ہورہا ہے۔“ بانورے نے دلی زبان سے کہا۔ ”پراپک بات میری سمجھ میں نہیں آوے ہے۔“

”وہ کیا؟“ سیواکارن نے پوچھا۔

”وہ یہ کہ ایک دم سے دیوی کھل بندھنا کی لگن کیسے لگ گئی۔ یہ کالج والیوں کو کیا ہوا کہ دیوی کے چرن چھونے آ گئیں۔ انہیں نہ تو دیوی پر وشواش ہے نہ دیوتا پر۔ پورن ماشی پر بس پانچ چھ آ جایا کرتی تھیں۔ اب کے چالیس کیسے آ گئیں؟ ہے بھگوان یہ کیا بھید ہے“

سیواکارن مسکرائی۔ بولی ”بھگوان کے بھیدوں کو کس نے جانا ہے بانورے۔“

چکی کراہ کراہ کرتا دل دے رہی تھی۔ عین اس سے مندر سے کھڑکھڑہنی کی آواز سنائی دی۔

وہ سب چونک اٹھے۔ ”ہائیں یہ کیا؟“

”یہ کیسی آواز ہے؟“ سیواکارن نے پوچھا۔

”یہ چاتری ہیں۔“ دیوی بھاگی بولی۔ ”دیوی کھل بندھنا کے چرنوں میں بیٹھ کر گیان دھیان کی بجائے ہنس بول رہی ہیں۔“

بانورہ ہنسا کہنے لگا۔ ”ان آج کل کی چھو کریوں کو کیا پتہ کہ دیوی کیا ہووے ہے۔ بندھن کیا ہووے ہے۔ جیون کیا ہووے ہے۔“

مندر سے ہنسی کا ایک اور ریلا اٹھا۔

کانتا کا منہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ بولی ”یہ ہنسنے کی بات نہیں رونی کی ہے۔ یہ سارے شہد دیوی رانی، استری، شریمتی۔“ عورت، دومن سب جھوٹے ہیں۔“

”تو پھر سچا لفظ کون سا ہے؟“ کوشلیا نے پوچھا۔

کانتا بولی ”میری طرف دیکھو۔ میں نہ دیوی ہوں نہ شریمتی ہوں نہ دومن ہوں۔ میں اک بانندی ہوں بانندی۔ اے سلیو صرف میں ہی نہیں تم ہم سب۔ وی آر آل سلیوز۔۔۔۔۔۔ سلیوز۔“

”سچ کہتی ہے۔“ کنول بولی ”ہم سب اپنے ماسٹر کا دل خوش کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ ہم اپنے مالکوں کو خوش وقتی دیتی ہیں۔ اے مومنٹ آف جائے۔ اے مومنٹ آف اکسائٹ منٹ۔ ایک لذت کا لمحہ وقتی چنچارہ اور بس۔“

”نہ ابلا ایسا نہ کہو۔“ دیہاتن بولی ”ناری داسی نہیں مالکن ہوتی ہے۔“

”کھی کھی کھی“ کنول تمسخر سے ہنسی۔

”مجھے بتا تو وہ کون عورت ہے جو داسی نہیں بلکہ مالکن ہے؟“ کانتا نے پوچھا۔

”میں ہوں۔۔۔۔۔۔ میں۔“ دیہاتن نے فخر سے سراٹھا کر کہا۔ ”میں اپنے پتی کے من پر راج کرتی ہوں۔ مسکا کر دیکھو تو وہ لہلہا اٹھے ہے۔ گھوری دکھاؤں تو مرجھا کر پڑے ہے۔ سوکھے جائے ہے۔“

”جو ایسا ہے۔۔۔۔۔۔“ کانتا نے غصے سے کہا۔ ”تو تو کھل بندھنا دیوی کی پوری ماشی میں جھک مارنے آئی ہے کیا؟“

”یہاں تو بندھن کھلوانے آتے ہیں۔“ کوشلیا نے وضاحت کی۔ ”تو کون سا بندھن کھلوانے آئے ہے۔“

”سچ کہو ابلا سچ کہو ہو۔“ دیہاتن نے جواب دیا۔ ”میرے بھاگیہ کی گانٹھ پتی کے من میں نہیں پڑی۔ ساس کے من میں پڑی ہے۔ وہ ہمیں دیکھ نہیں سکھاوے ہے۔ جتنا پتی چاہے ہے اتنا ہی ساس چلے ہے۔ بس گھولے ہے۔ اپنے پتر کو مجھے راسن کر کے دیوے ہے۔ ادھر وہ تڑپے ہے ادھر میں تڑپوں ہوں۔ سچ میں ساس دیوار بن کر کھڑی رہے۔ بس یہی میرے نصیبے کا بندھن ہے۔ کیا پتہ اس پورن ماشی میں دیوی کھل بندھنا میرا یہ بندھن کھول دے۔“ وہ ہاتھ باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”جے ہو دیوی کھل بندھنا کی۔“

”کھی کھی کھی۔“ کنول ہنسی۔ ”بھولی عورت یہ جو ساس نند ہیں یہ تو پتی کے ویڑے کے چاند ہیں۔ ان کی اپنی روشنی نہیں۔ مانگے کی ہے۔ پتی مہاراج کی دین ہے۔ سارا چٹکار سورج مہاراج کا ہے۔ چاہے تو ساس کا چاند چمکا کر بہو کے سر پر لٹکا دے۔ چاہے تو نندا کا بانڈا جلا کر بھالو کی آنکھیں چندھیادے۔“

”سچ کہتی ہو۔“ سندری بولی ”سب کھیل مداری کا ہے۔ چاہے تو بندر یا نچادے۔ چاہے تو مینا سے ٹیس ٹیس کرادے۔“

کانتا سنجیدہ ہو کر بولی ”پگلی ساس نندا تو پتلیاں ہیں۔ پتی دیو کے ہاتھ میں ڈوری ہے جسے چاہے نچادے۔ بچارے مات پتا کا کیا دوش۔“

”مات پتا۔۔۔۔۔۔“ سیتے کے ماتھے پر گھوری تن گئی۔ ”سکھیو عورت کا کوئی بھی اپنا نہیں۔ نہ بھائی بہن نہ مات پتا۔ یہ وہ ناؤ ہے جس کا کوئی پتو اور نہیں۔ بس ڈولن ہی ڈولن ہے۔ جیون بھر کا ڈولن۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر ایک ہلکی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تیری پتا کیا ہے ری؟“ سندری نے پوچھا۔

”مت پوچھ۔“ شکلتے چیخی ”دکھیا کو نہ چھیڑ پھوڑے کو ہاتھ نہ لگا۔“

”میری پتا۔“ سیتے گنگنائی۔ ”میں اک بکاؤ مال ہوں۔ مات پتا مجھے دو بار بیچ چکے۔ اب تہی بار کے داؤ میں بیٹھے ہیں۔ پہلے بیچتے ہیں پھر بنے نہیں دیتے کہ پھر سے بیچ سکیں۔“

سیتے اٹھ بیٹھی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر مورتی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بولی ”ہے کھل بندھنا دیوی بتا۔ کیا میرے بھاگیہ میں بکنا ہی لکھا ہے۔ بول جو ایسا ہی ہے تو بتا کہ میں خود اپنے کو بیچوں۔ روج کے روج بیچوں۔ مجھے یہ دکھ تو نہ رہے کہ مات پتا اپنی پیٹ جانی کو بکاؤ مال بنائے بیٹھے ہیں۔“

کنول اٹھی اس نے سیتے کو کلاوے میں بھر لیا۔ بولی ”جی برانہ کر بہنا“ اک تو ہی نہیں ہم سب بکاؤ مال ہیں۔ کوئی خود کو اک ہی مرد

کے ہاتھ روز کے روز بچتی ہے کوئی رنگ رنگ کے پرش کے ہاتھ بکتی ہے۔“

”کیا فرق پڑتا ہے؟“ کانٹا نے کہا۔ ”ایک کے ہاتھ بار بار بکویا ہر رات نئے گا ہک کے ہاتھ بکو۔ بکنا ہمارا بھاگیہ ہے۔ کتنا بڑا بندھن ہے۔“

”صرف ایک نہیں بندھن ہی بندھن ہیں۔“ کنول غصے سے چلائی۔

”اٹھو بہنا سب بندھن توڑ دو۔ اپنی ہمت سے توڑ دو۔“ شکستے چلائی۔

”ایک بھی باقی نہ رہے۔ یہ پتھر کی دیو کھل بندھنا بے چاری کیا کرے گی۔“

”ہوش کرو لڑکیو! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“ مائی بھاگی بات کئے بغیر نہ رہ سکی۔

”مندرمیں کھل بندھنا کے چرنوں میں بیٹھ کر تم پورن ماشی سے ایک رات پہلے دیوی کے کھلاف اپنے من میں بس گھول رہی ہو۔“

”کیوں نہ بس گھولیں۔“ کانٹا بولی ”ہم تو دیوی کے پاس صرف اس لئے آئی ہیں کہ پروٹسٹ کریں۔ کیا دیوی کو نظر نہیں آتا کہ

بندھنوں نے عورت کا بند بند لہو لہان کر رکھا ہے۔ کیا عورت سارے بندھنوں سے کبھی آزاد نہ ہوگی۔“

”نہ نہ نہ نہ“ بھاگی کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلیں۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔ خوف کے مارے آنکھیں باہر نکل

آئیں۔ ”نہ نہ نہ نہ“ وہ بولی۔ ”دیوی سے ایک بندھن کھولنے کی منت کرو۔ کوئی ایک بندھن۔ پرنتو وہ باہر کا بندھن ہو، بھیتیر کا نہیں۔ جو

تم نے سارے بندھن کھولنے کی پرا رتھنا کی تو۔۔۔۔۔ نہ نہ نہ ایسا نہ کرو۔ جو دیوی نے تمہاری سن لی تو۔۔۔۔۔ تو کیا ہوگا؟“

ایک ساعت کے لئے سب ڈر گئیں۔

”کیا مطلب؟“ کنول نے ہمت کر کے پوچھا۔

”جو باہر بھیتیر کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تو۔۔۔۔۔“ بھاگی نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

”ٹوٹ گئے تو۔۔۔۔۔؟“ سبھی بوکھلا سی گئیں۔ ”تو کیا؟“

”تو تم بھی مہمان کے سامان ہو جاؤ گی۔“ بھاگی رک گئی جیسے اس کے گلے میں آواز نہ رہی ہو۔

”مہمان کے سامان۔“ سب نے دہرایا

عین اس وقت سیوا کارن کی آواز سنائی دی۔ ”بھاگی۔۔۔۔۔“

آواز سن کر بھاگی جیسے جاگ اٹھی۔ طلسم ٹوٹ گیا۔ شرمندہ سی ہو گئی۔ دانتوں میں زبان دیئے بھاگی۔ اس کے جانے کے بعد کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر کنول بولی ”یہ کون تھی؟“

”کوئی مندر کی ہے۔“

”کیا کہہ رہی تھی؟“

”پتہ نہیں کیا کہہ رہی تھی۔“

”بے جوڑ باتیں کر رہی تھی۔“

دیہاتن بولی ”کہہ رہی تھی اگر دیوی نے تمہاری مانگ پوری کر دی۔ سارے بندھن کھول دیئے تو پھر کیا کرو گی۔“

”نان سنس“ کانتا نے ناک چڑھائی۔

”مجھے یہ مندر وندر دیوی ویوی۔ سب پاکھنڈ معلوم ہوتا ہے۔“ پیلی ساڑھی والی پہلی مرتبہ بولی۔

”جو ایسا ہے تو یہاں کیوں آئی ہو؟“ کنول نے پوچھا۔

”چاندی کے رے کو کھلتے دیکھنے آئی ہوں۔“ پیلی ساڑھی والی نے کہا۔

”کیا واقعی رسہ کھلتا ہے؟“

”کہتے ہیں یوں تار تار ہو جاتا ہے جیسے دھو کر سوکھنے کے بال بال کھلتے ہیں۔“

پیلی ساڑھی والی اٹھی بولی۔ ”سب پاکھنڈ ہے نہ پرارتھنا سے کچھ ہوگا نہ ماتھا ٹیکنے سے۔ نہ منتوں سے۔ اگر اس سدا کی غلامی سے

نجات پانا ہے تو اٹھو جدوجہد کرو۔ جان لڑا دو ورنہ اس مرد کی دنیا میں عورت کا کوئی مقام نہیں۔“

”بالکل بالکل“ چاروں طرف سے شور مچ گیا۔

شہر سے دور شاہراہ سے دور شوالک پہاڑیوں میں بھی ہوئی پگڈنڈیوں کے بیچ درختوں سے گھرا ہوا ایک گاؤں ہے۔ ان پورنا

۔۔۔۔۔ اس گاؤں سے ایک میل جنوب کی طرف ایک کھلا میدان ہے جس کے درمیان میں ایک بہت پرانا مندر ہے جسے کھل

بندھنا کا مندر کہتے ہیں۔ یہ مندر اتنا پرانا ہے کہ کسی کو پتہ نہیں کہ کب تعمیر ہوا۔ اس کی بناوٹ بھی مندر کی سی نہیں۔ نہ مندر کا مخروطی گنبد نہ کلس۔

صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک بہت بڑا ہال کمرہ ہے جس کی چھت نیچی ہے۔ ہال کمرے کے درمیان میں ایک

چبوترے پر پتھر سے بنا ہوا قد آدم دیوی کا مجسمہ ہے جس کے خدوخال وقت کی خرد برد کی وجہ سے گھسے پٹے ہوئے ہیں۔ صرف آنکھیں واضح ہیں جو لمبی اور تر چھی ہونے کی وجہ سے یوں ڈولتی محسوس ہوتی ہے جیسے کشتیاں ہوں۔ دیوی کے قریب ہی ایک موٹا سا چاندی کا رسہ چھت سے لٹک رہا ہے جو چاندی کی پتلی پتلی تاروں کو بات کر بنایا گیا ہے۔

ہال کمرے کے ارد گرد تینوں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ جن کے ارد گرد ایک چھوٹا سا برآمدہ چاروں طرف گھومتا ہے۔ دیکھنے میں ایسا لگتا ہے جسے وہ مندر نہیں بدھ مت کے پجاریوں کا پاٹ شالہ ہو۔

پرانے زمانے سے یہ پتھر کی بنی ہوئی عمارات دیوی کھل بندھنا کے مندر کے نام سے مشہور ہے۔ کسی کو علم نہیں کہ دیوی کا اصل نام کیا ہے۔ سارے علاقے میں مشہور ہے کہ وہ بندھن کھول دیتی ہے۔

ہر سال میسا کھ کی پورن ماشی کے دن ارد گرد کے علاقے سے عورتیں دیوی کی آگے سیس نوانے کے لئے آتی ہیں۔ کوئی پتی کے من میں پڑی ہوئی گرہ کھولنے کے لئے پرارتھنا کرتی ہے۔ کوئی بیٹے کے دل میں پریم بندھن کے خلاف ہابا کار مچاتی ہے۔ کوئی ساس بہو کے کروڑھ کھولنے کی ہنسی کرتی ہے۔ کوئی اولاد کی روک کار ونا روتی ہے۔

پورن ماشی کی رات شام ہی سے دیوی کا بھجن شروع ہو جاتا ہے۔ جوں جوں رات بھگتی ہے، مجھے پر ایک کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ پھر آدھی رات کے قریب بارہ مارتی درت لے شروع ہوتی ہے۔

”دیوی۔۔۔۔۔ کھل بندھنا۔“

اس پر سارے یا تری اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان پر وجدان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ دل پر وجدان طاری ہو جائے تو سارے اعضاء رقص کرنے لگتے ہیں۔ کوئی برملا، کوئی گپت۔ جب یہ رقص اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو مندر میں ایک عجیب سی آواز پیدا ہوتی ہے یوں جیسے آکاش سے گھنگھر و گرے ہوں۔

اس پر پجاری ساکت ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ٹھک ٹھک گھنگھر و بندھے پاؤں قدم قدم قریب آتے ہیں اور دیوی کے پاس آ کر رک جاتے ہیں۔

عین اس وقت مندر کا مہانتری سکھ بجاتا ہے۔ سکھ کی آواز سن کر پھر سے کھل بندھنا کا بھجن شروع ہو جاتا ہے۔ سکھ روتا ہے۔ ڈھولک سرچینتی ہے اور لوگ بھجن کے پردے میں آہ و زاری کرتے ہیں۔

عین اس وقت سیوا کارن جو گیا دھوتی میں ملبوس موتیے کے ہار لپیٹے دیوی کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ تیز، تیز، تیز۔۔۔۔۔ اور تیز۔

ساتھ ہی چھت سے لٹکا ہوا چاندی کا رسہ جھومنے لگتا ہے۔ اس جھولن جھومن میں رسے کے بل کھلنے لگتے ہیں۔ کھلتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ چاندی کی تاریں یوں ایک ایک ہو کر لٹکنے لگتی ہیں جیسے کسی میار نے سکھانے کے لئے بال کھول رکھے ہوں۔

یہی دیوی کا معجزہ ہے۔ اسی لئے دیوی کا نام کھل بندھنا مشہور ہے۔

ساری چاتریاں ایک ایک کر کے مندر سے جا چکی تھیں۔ صرف کانتا، کنول اور سیٹے عورت کے بندھنوں کی شکایت کی زنجیر میں بندھی بیٹھی تھیں کہ مندر کی گھنٹی بجی۔ وہ تینوں چونکیں۔ ان کے سامنے سیوا کارن کھڑی تھی۔ بولی۔ ”مندر کے دیوار بند کرنے کا سہ ہو گیا۔ اب تم اپنا ٹھکانہ کرلو۔“

”کہاں ہے ہمارا ٹھکانہ؟“ کنول نے پوچھا۔

”جس کوٹھڑی میں بھی جگہ ملے۔“

”اور جو کوٹھڑیوں کے دروازے بند ہوئے تو۔۔۔۔۔؟“ کانتا نے پوچھا۔

”تو کھٹکناؤ۔ مندر میں کوئی رات بھر نہیں رہ سکتا۔ دیوی کی یہی آگیا ہے۔“

جب وہ مندر سے باہر نکلیں اور ایک نظر لمبے برآمدے پر ڈالی تو سیٹے بولی۔ ”سب کوٹھڑیوں کے کواڑ بند ہیں۔ کسے کھٹکناؤ؟“

”باری باری سب کو بجا دو۔“ کنول نے پوچھا۔

عین اس وقت برآمدے کے درمیان کی کوٹھڑی کا دروازہ چوں کر کے آپ ہی آپ کھل گیا۔ اندر سے دیئے کی مدھم روشنی باہر آنے لگی۔ انہوں نے کھلے کواڑ سے اندر جھانکا۔ کوٹھڑی خالی پڑی تھی۔ فرش پر سوکھی گھاس بچھی ہوئی تھی۔ دیوار کے آلے میں اک دیا ٹمٹما رہا تھا۔

جب وہ لیٹنے لگیں تو سیٹے نے ڈر سے چیخ سی ماری۔ ”وہ دیکھو وہ۔۔۔۔۔۔“

محراب کے پیچھے کوٹھڑی کے پچھلے حصے میں ایک کھاٹ بچھی ہوئی تھی جس پر کوئی کالی چادر لپیٹے سو رہا تھا۔

”کون ہے یہ؟“ سیٹے نے پوچھا۔

”کوئی ہوگی۔“ کانتا نے بے پرواہی سے کہا۔

”کنول۔۔۔۔۔۔“ کانتا نے کہا ”یہ مہمان کون تھی جس کا ذکر مندر والے کر رہے تھے۔“

”وہی جس کے سارے بندھن کھل گئے تھے۔“

”یہ طوطا میں نے کہا کہ تم مان گئیں کیا؟“ سیتے نے کہا۔ سب جھوٹ ہے۔۔۔۔۔ جھوٹ۔“

”اوں ہوں‘ جھوٹ نہیں۔“ کوٹھڑی کے پچھلے حصے سے بھاری بھر کم آواز آئی۔ وہ تینوں چونک اٹھیں۔

”تو کون ہے؟“ سیتے نے بلند آواز سے پوچھا۔

”میں ہی ہوں۔“

”اس کی آواز کو کیا ہے؟“ کنول نے زیر لب پوچھا۔ ”عورت کی سی نہیں۔“
 ”رورو کے میرا گلا رندھ گیا ہے۔“ کالی چادر والی نے کہا۔
 ”تو مہمان کو جانتی ہے کیا؟“ کانتے نے پوچھا۔
 ”جانتی ہوں۔ میں اس کی بالکی ہوں۔“ کالی چادر والی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن وہ کوٹھڑی کی طرف پیٹھ کئے ہوئے تھی۔
 ”مہمان کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے کیا؟“
 ”مہمان کون تھی؟“

”اس پر کیا جیتی؟“

کوئی کچھ نہ کچھ کہہ رہی تھی۔

پھر کوٹھڑی میں خاموشی چھا گئی۔

دفعۃً کالی چادر والی بولی۔ ”مہمان کے مات پتاند رکوٹ کی ریاست میں رہتے تھے۔ گھر کھانے کو سوکھی روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب مہمان ان کے گھر پیدا ہوئی تو ماں باپ کے دل میں امید کا دیا ٹمٹمایا کہ پتری بڑی ہوگی تو ریاست کے مہاراجہ کی بھیٹ کریں گے۔ چھوٹی موٹی جاگیر مل جائے گی۔ جیون سکھی ہو جائے گا۔“

”مہاراجہ کی بھیٹ۔۔۔۔۔؟“ کنول نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں مہاراجہ کی بھینٹ۔ ان دنوں یہ رواج تھا۔ ماں باپ سندر پتریاں مہاراجہ کی بھینٹ کر دیتے تھے۔ مہاراج چار ایک روپ کھلی کارس چوستے۔ پھر اسے پرانے محل میں پھینک دیتے جہاں مہاراج کے نوکر چاکر پھول کی پٹکھڑیاں نوچتے اور پھر جب وہ ڈنٹھل بن جاتی تو کال کوٹھڑی میں دھکیل دیتے۔ یہی ان دنوں کی ریت تھی۔“

”پتری سندرتھی۔ مات پتانے اس کا نام شوبھارکھ دیا۔“ کالی چادر والی نے آہ بھر کر کہا۔

”شو بھا کون؟“ سیتے گنگنائی۔

”وہی۔۔۔۔۔“ کالی چادر والی نے آہ بھر کر کہا۔ ”جو مندر میں آ کر تپا کرتے کرتے مہامان بن گئی۔“ وہ تینوں چپ چاپ بت بنے بیٹھی تھیں۔

”مات پتا نے شو بھا کے پیٹ اور گالوں پر حلوہ باندھ باندھ کر پتری کو بڑا کیا کہ پیٹ ملائم رہے، گال چکنے ہو جائیں۔ سینے پر سمندر جھاگ ملی کہ ابل کرا بھرے۔ منہ پر دودھ کے چھینٹے دیئے کہ رس بھر جائے۔ رانوں پر گھی کی مالشیں کیں کہ لچک بڑھے۔ کمر پر کمر بند کس دیا کہ ربٹ کے گیند کی طرحیوں ابھرا بھر کر جھٹکے۔“

”توبہ ہے۔“ سیتے نے آہ بھری۔

”جب شو بھا بڑی ہوئی تو اس میں وہ سب کچھ تھا جو مات پتا نے چاہا تھا۔ جسم تیار تھا پر من میں اڑن تھی۔“

”اڑن کیوں؟“ کنول نے پوچھا۔

”جب شو بھا کو پتہ چلا کہ اسے بھینٹ چڑھا دیا جا رہا ہے تو اس کے من نے کہا۔ میں سب کچھ بنوں گی پر بھینٹ نہ چڑھوں گی۔ مجھے تھالی میں پروں کر دو جے کے سامنے نہ دھرا جائے۔ میں کنیا ہوں، کھا جائیں ہوں۔

جب وہ اسے راجہ کے محل میں لے کر گئے تو حواریوں نے اسے اچھی طرح دیکھا کہ راجہ کے لائق ہے بھی یا نہیں۔ پھر وہ اسے مہاراج کی بیج پر بٹھا کر چلے گئے کہ مہاراج ابھی آتے ہیں۔

وہ وہاں سے اٹھ بھاگی۔ کھڑکی سے باہر نکلی۔ پر نصیب کا لکھا کون مٹا سکے ہے۔ باہر کے کواڑ کی بجائے بھیر کے کواڑ میں سے ہو کر پرانے محل میں جا پہنچی جہاں مہاراج کے نوکرتا کی بیٹھی تھی۔ پتہ نہیں بھیڑیئے اسے بھنبھوڑتے رہے۔ پر ایک دن وہ وہاں سے بھی نکل بھاگی۔

پریم کا گریا جگہ جگہ سے تڑخ چکی تھی۔ اب اس میں دودھ بھرنے کی بات نہ رہی تھی۔ اس لئے وہ سیدھی شار جانا نیکہ کے پاس پہنچی۔ بولی، لے نا نیکہ مجھے بیچ اور کھا۔ اپنی جھولی بھر۔ اب میں کسی اور کام کی نہیں رہی۔“ کالی چادر والی خاموش ہو گئی۔

دیر تک کوٹھڑی میں گرم صم رہی جیسے اوپر چپ کا تنبوتا ہو۔ صرف دل دھک دھک کر رہے تھے۔ گردنیں باہر نکل گئی ہوئی تھیں۔ سینوں کی نوکیں ابھر کا کانٹے بن گئی تھیں۔

پھر کالی چادر والی نے ایک لمبی آہ بھری۔ بولی ”پھر شو بھا کا وہ چر چا ہوا، وہ چر چا ہوا کہ مہاراج کے درباری بھی اس کے دوڑ پر

کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اک دن مہاراج خود چو بارے پر آ پہنچے۔

شو بھا کے پاس کیا نہ تھا۔ پوشاکیں، جیور، ہیرے جواہرات اور دھن۔ دھن ہی دھن۔ اوپر سے وہ پھول سان کھلی کھلی تھی پر بھتیر میں ایک کانٹا لگا تھا۔ سوچتی کتنی اپرا دھن ہوں میں کہ جگہ جگہ بوٹیاں تڑواکیں۔ بکی پر مات پتا کو جاگیر نہ لینے دی۔ ان کا سودا کھونا کر دیا۔ پتہ نہیں اب کس حال میں ہیں۔ اس کانٹے نے اس کے بھتیر کو لولہ بان کر دیا۔ خود کو اپرا دھن جاننے لگی تو پھر رہا نہ گیا۔ گہنے پاتے کی گٹھڑی باندھی اور چوری چوری چو بارے سے نکل گئی۔

مات پتا کو اپنی قیمت چکانے کے لئے گاؤں پہنچی تو پتہ چلا کہ وہ بھوک کے مارے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔ “کالی چادر والی پھر رک گئی۔

تینوں چھوکر یاں یوں بیٹھی تھیں جیسے مایا اتر گئی ہو۔ استری ٹوٹ گئی ہو۔ جیسے پا پر سے کڑا کا نکل گیا ہو۔ “شو بھا کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ “کالی چادر والی یوں بولی جیسے آواز بھیگ گئی ہو۔ “دوسریں اور گر گئی ہو۔ “کالی چادر والی پھر رک گئی۔

”پھر۔۔۔۔۔؟“ سیٹے گھلیائی۔

”پھر۔۔۔۔۔“ کالی چادر والی نے دہرایا۔ “پھر شو بھا کی نظر میں جیسے سب کچھ کچھ بھی نہیں ہو گیا۔ دھن دولت بانٹ دی اور کھل بندھنا کے دوار پر آ بیٹھی۔ دیوی باہر کے بندھن تو ٹوٹ گئے۔ بھتیر کے بھی کھول دے۔ “کالی چادر والی آہ بھر کر بولی۔ “بھتیر کے دو بندھن اسے جکڑے ہوئے تھے۔ اک یہ کہ اس نے مات پت کا اپمان کیا تھا۔

”اور دو جا۔۔۔۔۔؟“ کانٹا کے ہونٹ ہلے پر کالی چادر والی چپ رہی۔

”پھر۔۔۔۔۔؟“ کنول کی آواز سنائی دی۔ پروہ بت بنی بیٹھی رہی۔ بیٹھی رہی۔

پھر دور کوئی بالک رویا تو کالی چادر والی چوکی۔ بولی “سنو سنو دو جا بندھن آپ ہی بول پڑا۔ اس کے من میں ایک بالک روتا تھا۔ متا سر بیٹتی تھی۔ چھاتیاں سراٹھا کر بین کرتی تھیں۔ وہ تھیلی تڑپتی تھی جہاں بالک آنا چاہے تھا۔ من لہو کے آنسو روتا تھا۔ جوں جوں بالک روتا تو شو بھا دیوی کے چرنوں میں تڑپ تڑپ کر بنی کرتی۔ آدھی آدھی رات کے سے دیوی کے بھجن گاتا۔ دیوی۔۔۔۔۔ کھل بندھنا۔

اس نے اتنی تپسیا کی اتنی تپسیا کی کہ مہمان بن گئی۔

پھر ایک رات وہ دیوی کے چرنوں میں سیس نوانے بیٹھی تھی تو مندر میں اک ہلکی آواز ابھری۔ ”چپ“ اس نے سراٹھا کر دیکھا تو دیوی نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھی ہوئی تھی اور سارا مندر ”چپ“ ”چپ“ گنگنا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے الٹا اپنی مانگ کو دہرا کر شروع کر دیا۔ پھر ایک کرودھ بھری آواز ابھری۔ اندھی مغلّتی اپنی مانگ کو جان۔ اس پر بھی وہ نہ سمجھی۔ تو دیوی بولی ”استری بندھن ہی بندھن ہوتی ہے۔ جو بھتیر کے بندھن بھی کھل گئے تو استری استری نہ رہے گی۔“ یہ سن کر وہ ڈر گئی پر سمجھی پھر بھی نہیں۔

دیوی بولی ”استری لیروں کے کھدو سماں ہوتی ہے۔ لیریں نکال دو تو کھدو کہاں رہے گا؟“ وہ پھر بھی نہ سمجھی الٹی پھر سے بھجن رننے لگی۔۔۔۔۔۔ ”دیوی کھل بندھنا“ ناچ ناچ کر دیوی کو منانے لگی۔ پھر دیوی جیسے کرودھ میں بولی ”جاتیرے بھتیر کے بندھن کھل گئے۔“ اس پر مندر ڈولنے لگا جیسے بھونچال آ گیا ہوا اور مہامان گر پڑی۔

کالی چادر والی نے چادر لپیٹی اور اٹھ بیٹھی اور قدم قدم ان کی طرف چل پڑی۔ جب وہ محراب کے نیچے پہنچی تو سیتے بولی ”پھر کیا ہوا؟“

وہ رک گئی۔ ”پھر کیا ہوا۔۔۔۔۔۔!“

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوا؟“

”پھر۔۔۔۔۔۔“ کالی چادر والی نے اپنے منہ سے چادر اٹھا دی۔۔۔۔۔۔ ”پھر یہ ہوا۔۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔۔“

انہوں نے سراٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ دہشت سے ان کی چیخیں نکل گئیں۔ ان کے سامنے پتہ نہیں کون سی مخلوق کھڑی تھی۔ نہ وہ عورت نہ مرد۔ تینوں لڑکیوں نے خوفزدہ ہو کر منہ چھپا لئے۔

بھاگی نے سیوا کارن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ”سن رہی ہو سیوا کارن سن رہی ہو؟ وہ دیوی کے چرنوں میں بھجن بھینٹ کر رہی ہے۔“ سیوا کارن بھاگی بھاگی باہر نکلی۔ دونوں مندر کے بڑے دروازے کی طرف دوڑیں۔ مہامان کی کوشٹری کی کنڈی کھل گئی۔ ”مجھے پتہ تھا کہ اک دن ابھاگنی کا چکر ٹوٹ جائے گا۔ سیوا کارن سن تو سہی۔“ بھاگی چلائی۔ وہ سب سننے لگیں۔

”کھل بندھنا۔۔۔۔۔۔ بندھ دے۔“

”ساتونے۔“ بھاگی چیخی۔ ”مہامان نے بول بدل دیئے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ا“ سیواکارن بولی۔ ”مہاجوگی کہتے تھے ایک دن آئے گا جد چاندی کا رسہ نہیں کھلے گا۔“

”اے دیوی تیری جے ہو۔“

سیواکارن نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لے۔ اندر کوئی گائے جا رہی تھی۔

”کھل بندھنا۔۔۔۔۔بندھ دے۔ کھل بندھنا۔۔۔۔۔“



روغنی پتلے

شہر کا ایٹ شاپنگ سنٹر۔۔۔۔۔ جس کی دیواریں 'شلف' الماریاں بلور کی بنی ہوئی ہیں۔ جس کا بنا سجا فیکید جلتے بجھتے رنگ دار سائز سے مزین ہے۔ جس کے کاؤنٹرز سامان سے لدے ہیں جس کے کاؤنٹروں پر سمارٹ متبسم لڑکیاں اور لڑکے یوں استادہ ہیں جیسے وہ بھی پلاسٹک کے پتلے ہوں۔ جوان کی ارد گرد یہاں وہاں سارے ہال میں جگہ جگہ رنگ رنگ لباس پہنے کھڑے ہیں۔ ہاں فیشن آرکیڈ سے کون واقف نہیں۔

چاہے انہیں کچھ نہ خریدنا ہو، لوگ کسی نہ کسی بہانے فیشن آرکیڈ کا پھیرا ضرور لگاتے ہیں۔ وہاں گھومتے پھرتے نظر آنا ایک حیثیت پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ پاش چیزوں اور نئے ڈیزائنوں کو دیکھنے آتے ہیں تاکہ محفلوں میں Latest فیشن کی بات کر کے اپ ٹو ڈیٹ ہونے کا رعب جما سکیں۔ نو جوان آرکیڈ میں گھومنے پھرنے والیوں کو نگاہوں سے ٹٹولنے آتے ہیں۔ غنڈے سیل گرلز سے اٹا سٹا لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑکیاں اپنی نمائش کے لئے آتی ہیں۔ بوڑھے خالی آنکھیں سینکتے ہیں۔ گھاگ بیگمات گرین یوتھ کی ٹوہ میں آتی ہیں۔ وہ صرف فیشن آرکیڈ ہی نہیں، رومان آرکیڈ بھی ہے کیوں نہ ہو۔ آج محبت بھی تو فیشن ہی ہے۔

کون سی چیز ہے جو فیشن آرکیڈ مہیا نہیں کرتا۔ زربفت سے گاڑھے تک۔ موسٹ ماڈرن کپھٹس سے سوئی سلائی تک سی تھرو سے رنگین مالاؤں تک۔ سب کچھ وہاں موجود ہے۔ لوگ گھوم گھام کر تھک جاتے ہیں تو آرکیڈ کے ریستوران میں کافی کا پیالہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔

فیشن آرکیڈ کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ فارن ڈکنٹریز نے خرید و فروخت کرنی ہو تو انہیں خاص انتظام کے تحت آرکیڈ میں لایا جاتا ہے۔

آرکیڈ ہال میں جگہ جگہ روغنی پتلے طرح طرح کے لباس پہنے کھڑے ہیں۔ چہروں پر جوانی کی سرخی جھللا رہی ہے۔ آنکھوں میں دعوت بھری چمک ہے۔ ہونٹوں پر رضامندی بھرا اہم کھدا ہے۔ جسم کے پیچ و خم ہر لحظہ یوں ابھرتے سمیٹے محسوس ہوتے ہیں جیسے سپردگی کے لئے بے تاب ہوں۔

اگرچہ ڈمی پتلے پلاسٹک کے جمود میں مقید ہیں مگر صنائع نے انہیں ایسی کارگیری سے بنایا ہے کہ ان کے بند بند میں حرکت کی

ایوژن لہر میں لے رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ رواں دواں ہوں۔

سر تھرولباس والی پتلی کو دیکھو تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ ابھی اپنی برہنہ ٹانگ اٹھا کر کہے گی ”ہے مجھے سنبھالو میں گری جا رہی ہوں۔“ اور جیکٹ والا اپنی عینک اتار کر مونچھوں کو لٹکاتے ہوئے چل پڑے گا۔ ”ہولڈ آن ڈارلنگ“ میری گود میں گرنا۔“

آرکیڈ میں بہت سی پتلیاں پوز بنائے کھڑی ہیں۔ منی سکرٹ والی، سکرٹ والی، ساڑھی والی، بیدنگ کا شیوم والی، میکسی والی، سی تھرولباس والی، لٹکتے بالوں والی، پتلون والی، ننگے پاؤں والی، مین ”ٹوکر بالوں والی“ انگلی سے لگے بچے والی۔

ان کے ساتھ ساتھ پتلے کھڑے ہیں۔ شکاری جیکٹ والا، دانشور، موٹر سائیکل والا، بلیک سوٹ، اچکن، پی کرتے پاجامے والا، سٹوڈنٹ، ڈینڈی، مصور۔

آرکیڈ ہال کے اوپر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک گیلری چلی گئی ہے۔ جہاں نظروں سے اوجھل دکان کا کاٹھ کباڑ پڑا ہے۔ پرانی میزیں کرسیاں، شلف اور پتلے جن کا رنگ و روغن اکھڑ چکا ہے۔

رات کا وقت ہے۔ آرکیڈ بند ہو چکا ہے۔ ہال میں سات آٹھ بتیاں روشن ہیں۔ شیشے کی دیواروں کی وجہ سے ہال جگمگ کر رہا ہے۔ گھڑی نے دو بجائے۔ سارے ہال میں حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پتلیوں نے آنکھیں کھول دیں۔ پتلیوں کی لمبی لمبی پلکیں یوں چلنے لگیں جیسے پنکھیاں چل رہی ہوں۔

سی تھرو نے انگڑائی لی۔

منی سکرٹ والی نے اپنی ٹانگ اٹھائی۔

جیکٹ والے دانشور نے اپنا قلم جیب میں ٹانگا۔ عینک صاف کی اور سی تھرو کی طرف بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔

موٹر سائیکل والے نے پیچھے بیٹھی لٹکتے بالوں والی پر گلیڈ آئی چمکائی۔ لٹکتے بالوں والی سے چھینٹے اڑنے لگے۔

”مائی گاڈ“ سی تھرو چلائی۔ ”یہ دیکھو اس نے اپنی ٹانگ لہرائی۔ میری ٹانگ پر نیلی رگیں ابھر آئی ہیں کھڑے کھڑے۔“

”کیوں نہ ہو، بلیو بلڈ ہے۔“ بلیک سوٹ مسکرایا۔

دور سے آواز آئی۔ ”ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلی میں“ سب لوگ بکس کے پاس کھڑی پتلون والی کی طرف دیکھنے لگے۔

”تیرے ہاتھ خالی ہیں۔ کہاں ہے ساغر؟“ کرتے پاجامے والے نے پوچھا۔

”اندھے وہ تو خود ساغر ہے۔ دکھتا نہیں تھے۔“ جین والا ہنسا۔

”میں تو بور ہو گئی ہوں۔“ منی سکرٹ والی نے آنکھیں گھما کر کہا۔

”کیوں مذاق کرتی ہو؟“ موٹر سائیکل والے نے گلہ آئی چمکائی۔

”تم تو سراپا حرکت ہو۔ تمہاری تو بوٹی بوٹی تھرکتی ہے۔ تم کیسے بور ہو سکتی ہو؟“

”کیوں بناتے ہو اسے اس کے جسم پر بوٹی ہی نہیں تھرکے گی کہاں سے۔“ دور کھڑے کونے میں کھڑے اچکن والے نے کہا۔

”ہاں“ پہلوان نما کرتے والے نے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ تو میاں کا زمانہ تھا جب بوٹی بوٹی تھرکا کرتی تھی۔ اب تو کاٹھ ہی کاٹھ

رہ گیا ہے۔“

”شٹ اپ“ جین والے نے آنکھیں دکھائیں۔ ”اپنے دقیانوسی رجعت پسند خیالات سے فیشن آرکیڈ کی فضا کو متعفن نہ کرو۔“

”ابے مسٹر اچکن“ سٹوڈنٹ چلایا۔ ”ذرا آئینہ دیکھو یوں لگتے ہو جیسے سارنگی پر غلاف چڑھا ہے۔“

”یہ مسٹر اچکن تو خالص ہسٹری ہے ہسٹری۔ اسے تو میوزیم میں ہونا چاہیے۔“

”انٹیکس میوزیم میں۔“ جیکٹ والے نے قہقہہ لگایا۔

”بالکل ان روایتی لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں۔“

”یہ لوگ زندگی کو کیا جانیں۔“

”ہپو کریٹس“ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

”اگنور ہم ہٹاؤ۔۔۔ کوئی اور بات کرو۔“ سی تھر و آنکھیں گھما کر بولی۔

”ہاؤ کین وی اگنور ہم؟ یہ لوگ ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں۔“

”نان سنس“ ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ وی آر آل فار پروگرس موومنٹ۔“ جیکٹ والا چلا کر بولا۔

”ہیر ہیر“ تالیوں سے ہال گونجنے لگا۔

”بابا بابا“ اوپر گیلری میں کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ اس کی آواز کھرج تھی۔ انداز والہانہ تھا۔ تالیاں رک گئیں۔ ہال میں خاموشی چھا

گئی۔ پھر سرگوشیاں ابھریں۔

”کون ہے یہ؟“

”کون ہنس رہا ہے؟“

”یہ اب بھی ماضی میں رہتے ہیں اور ہم کو ماضی کی طرف گھسیٹنا چاہتے ہیں۔“ جیکٹ والا تحارت سے بولا

”بڑے میاں سلام۔“ جیکٹ والے نے ماتھے پر ہاتھ مار کر طنز یہ سلام کیا۔ ”ماضی پرستی کا دور ختم ہوا۔ نصرت اب جدیدیت کا زمانہ ہے۔“

گیلری میں اوندھا پڑا ہوارومی ٹوپی والا لنگڑا سوئی پکڑ کر اٹھ بیٹھا۔

”احتمق ہیں یہ جدیدیت کے دیوانے۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اس دنیا میں نہ قدیم ہے نہ جدید۔ جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا۔“

”یہ ظاہر کے دیوانے کیا سمجھیں گے۔“ مشہدی لنگی والے نے قہقہہ لگایا۔ ”کہ دور ایک گھومتا ہوا چکر ہے جو آج اوپر ہے کل نیچے چلا جائے گا۔ جو آج نیچے ہے کل اوپر آ جائے گا۔“

جین والے نے اپنی پتلون جھاڑی ”ان کباڑ خانوں والوں کی باتیں تو سنو۔ یہ بے چارے کیا جانیں جدیدیت کو۔“

”جدیدیت کے دیوانے۔ آج تیری پتلون کے پانچ کچے کھلے ہیں۔ کل تنگ ہو جائیں گے۔ پرسوں پھر کھل جائیں گے۔ یہی ہے نا تیری جدیدیت۔“ رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔

”ذرا اس کی جین کی طرف دیکھو۔“ لنگی والا بولا ”نیلی پتلون پر سرخ ٹلی لگی ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

”احتمق یہ ٹلی نہیں۔ سچ ہے سچ۔ سچ فیشن ہے۔ سچ لگی جین کی قیمت عام پتلون سے دگنی ہوتی ہے۔ تجھے کچھ پتا بھی ہو۔“

”پیوند کبھی غربت کا نشان تھا۔ پیوند لگے کپڑوں والے سے لوگ یوں گھن کھاتے تھے جیسے کوڑی ہو۔ آج تم اس پیوند کی نمائش پر فخر محسوس کر رہے ہو۔“ مشہدی لنگی والا ہنسنے لگا۔ ”تم عجیب تماشا ہو۔“

رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔ ”دور جدید کے تحفیل کا فقدان ملاحظہ ہو۔ پیوند کو فیشن بنا بیٹھے ہیں۔ ہی ہی ہی ہی۔۔۔۔۔۔“

”سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے۔“ پن نے سراٹھا کر کہا۔

”ہائیں۔۔۔۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی ہے؟“ پتلون والی نے پوچھا۔

”لو“ سی تھروزی رلب گنگنائی۔ ”چھلنی بھی بولی۔“

”ہاں“ پی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے۔“

”تعفن کا کریڈٹ غلامت کا کریڈٹ اور کون سا۔“ بیدنگ کا سٹیوم والی بولی۔

”ساڑھی والی نے ناک چڑھائی۔

ہی نے قہقہہ لگایا۔ ”جدیدیت کے ذہنی تعفن کو دور کرنے کا کریڈٹ۔ جدیدیت کے بت توڑنے کا کریڈٹ۔ جھوٹی قدروں کو پاؤں تلے روندنے کے لئے ہمیں غلاظت کو اپنا نا پڑا۔“

سپورٹس گرل نے بیڈمنٹن ریکٹ کو گھما کر دانت نکالے۔

”ڈینیئل کریم کا اشتہار کسے دکھا رہی ہو؟“ ہی ہنسا۔ ”ہم نے دور حاضرہ کے سب سے بڑے بت دولت کو پاش پاش کر دیا۔ ہم نے جھوٹے رکھ رکھاؤ کا بت ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ہم نے ماڈرن ایج کے واحد دل بہلاوے سال کنفرٹس کی نفی کر دی۔ ہم نے مغربی تہذیب کا جنازہ نکال دیا۔“

”یہ بے چارے کیا جانیں۔“ پن بولی ”ظاہریت کے متوالے۔۔۔۔۔۔ جب کوئی تہذیب متعفن ہو جاتی ہے تو اسے مسمار کرنے کے لئے مجاہد بھیج دیئے جاتے ہیں۔ ہم وہ مجاہد ہیں۔“

”تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔“ رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔

”بالکل درست“ لنگی والا چلایا۔ ”یہ بڑا اثر انزیشنل دور ہے۔ جب ایک شو ختم ہو جاتا ہے تو دوسرے شو کے واسطے ہال صاف کرنے کے لئے جمعہ آ جاتے ہیں۔ یہ جمعہ اروں کا دور ہے۔“

”سلی فول۔“ سی تھرڈ ہنسی۔ ”یہ تو رومانس کا دور ہے۔“

”رومانس“ گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک مجنوں صفت دیوانہ لپک کر رینگ پر آ کھڑا ہوا۔ ”تم کیا جانو رومان کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ تمہارے دور نے تو عشق کا گلا گھونٹ دیا۔ عاشق کو ٹھنڈا کر کے رکھ دیا۔ محبوب سے محبوبیت چھین کر اسے رنڈی بنا دیا۔

عریانی کو رومان نہیں کہتے بی بی“

”ہالڈر ڈیش“

”نان سینس“

رومی ٹوپی والے نے ایک لمبی آہ بھری۔ ”دوستو ہمارے زمانے میں عورت کا نقاب سرک جاتا تھا تو گال دیکھ کر مرد میں تحریک پیدا ہوتی تھی لیکن اب ننگے پنڈوں کی یلغار نے مردانہ حس کو کند کر دیا ہے۔ تمہارے دور نے مرد کو نامرد اور عورت کو بانجھ کر کے رکھ دیا ہے۔“

جیکٹ والا آگے بڑھا۔ اس نے قلم جیب میں ڈالا۔ عینک اتاری۔ ”ہم جنس کے متوالے نہیں۔ ہم جنس کی دلیل میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں۔ دور حاضر میں سب سے اہم ترین مسئلہ اقتصادیات کا ہے۔ تم حالات حاضرہ سے چشم پوشی کرتے ہو۔ ہم تمہاری طرح حالات حاضرہ سے آنکھیں نہیں چراتے۔ ہم ترقی پسند لوگ ہیں۔“

”حالات حاضرہ“ رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔ ”تمہارے نزدیک حالات حاضرہ روٹی، کپڑا اور مکان میں ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ انا کا ہے۔ سلف کا۔۔۔۔۔ میں کا۔“

”روٹی کپڑے والو ہماری طرف دیکھو، پین چلائی“ جو ملتا ہے کھا لیتے ہی۔ جہاں بیٹھ جاتے ہیں وہی ٹھکانہ بن جاتا ہے۔ جو میسر آتا ہے پین لیتے ہیں۔ کہاں ہیں وہ مسئلے جنہیں تم اہرام مصر بنائے بیٹھے ہو۔“

”اونہوں انہیں کچھ نہ کہو۔ یہ تو فارن خیالات کی ایڈ کے بل بوتے پر کھڑے ہیں۔ انہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکا۔“ رومی ٹوپی والا بولا۔

”کل جب روٹی، کپڑا اور مکان کا مسئلہ حل ہو جائے گا پھر تمہارے ہاتھ پلے کیا رہ جائے گا بتاؤ۔“ پین بولی۔

”یہ تو حرکت کے متوالے ہیں منزل کے نہیں۔ انہیں صرف چلنے کا شوق ہے پہنچنے کا نہیں۔“ مشہدی لنگی والے نے منہ بنایا۔

”کو نہیں ہمارے راستے میں جو شخص روڑے اٹکائے گا اس پر رجعت پسندی کا لیبل لگا دیا جائے گا۔“

پہی قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”سو واٹ۔۔۔۔۔ ہم پیوں پر رجعت پسندی کا لیبل لگاؤ۔ بے شک لگاؤ۔ ہم نے کیپٹل ازم کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہم نے اقتداری پسندی کا تمسخر اڑایا ہے۔ ہم میں اور ان گوریلوں میں کیا فرق ہے جو سرمایہ داری کے خلاف جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔“

”صرف یہی کہ طریق کار مختلف ہے۔“ پین نے لقمہ دیا۔

ہال پر سناٹا چھا گیا۔

سی تھرو اپنے جسم کے پیچ و خم کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساڑھی والی اپنا پلو سنہال رہی تھی۔ لٹکے بالوں والی منہ میں انگلی ڈالے کھڑی تھی۔ پتلون والی کا چہرہ حقارت سے چمندر بنا ہوا تھا۔ جیکٹ والا سر کھجاتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ ”کتابوں میں تو یہ بات کہیں نظری نہیں گزری۔“

مجنوں نما نے قہقہہ لگایا ”خود کو زندگی کے متوالے گردانے والے کتابوں کی بیساکھیوں کے سہارے کے بغیر چل نہیں سکتے۔“

زندگی کتابوں سے اخذ نہیں کی جاتی، مسٹر۔ زندگی حال ہے۔۔۔۔۔ کسی صاحب حال سے پوچھو۔“

”جو قیل و قال کے دیوانے ہیں، انہیں حال کا کیا پتہ؟“ لنگی والا بولا۔

”انہیں اتنا نہیں پتا کہ حال پر قیل و قال نہیں ہو سکتا۔ حال کو رو نہیں کیا جاسکتا۔ حال سب سے بڑی حقیقت ہے۔“

ہال پر خاموشی چھا گئی۔

پھر دور سے ایک سرگوشی ابھری۔۔۔۔۔ ”میں کہاں آ پھنسی ہوں۔“ بچے کو لنگی لگائے کھڑی ماں گنگنا رہی تھی۔ ”یہ دور ماں کا

دور نہیں۔ یہ تو عورت کا دور ہے۔ میں کہاں آ پھنسی ہوں۔“

”عورت کا نہیں بی بی، پہلوان کرتے والے نے سر ہلا کر کہا۔“ یہ تو لڑکی کا دور ہے۔ انہیں کیا پتہ کہ عورت کسے کہتے ہیں۔ بال

سفید ہو جاتے ہیں، پھر بھی یہ لڑکیاں ہی بنی رہتی ہیں۔“

”خاموش“ آرکیڈ کی فرنٹ رو میں کھڑی ٹوکرا بالوں والی بولی۔ ”سنو سنو، یہ کیسی آواز ہے؟“

”کون سی آواز؟“

”کدھر ہے آواز؟“

”چپ“ موٹر سائیکل والا چلایا۔ ”یہ تو ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی ہے۔“

”یہ آواز تو باہر سے آرہی ہے۔“ منی سکرٹ والی نے کہا۔

جیکٹ والے نے عینک صاف کی اور باہر دیکھنے لگا۔

”ہے اللہ“ سی تھر و بولی ”یہ آواز تو ایمر جنسی فون بوتھ سے آرہی ہے۔ وہ جو باہر پورٹیکو میں ہے۔“

”خاموش“ شکاری ڈانٹ کر بولا ”سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاؤ۔۔۔۔۔ وہ آرہا ہے۔“

”کون آرہا ہے؟“ سی تھر و نے زیر لب پوچھا۔

”چوکیدار“

”چوکیدار“ پتلیاں سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔ پتلے باہر جھانکنے لگے۔

سامنے ایک اونچا لمبا، جھلمی جوان خاکی وردی پہنے سر پر پگڑی لپیٹے ہاتھ میں سوٹا اٹھائے بوتھ کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔

”بالکل اجڈ نظر آتا ہے۔“ پتلون والی نے حقارت سے ہونٹ نکالے۔

”گامی، کروڑ، ان کو تھ“، نوکر بابا لوں والی دانت بھیج کر بولی۔

”میرے بدن پر تو رو گئے کھڑے ہو جاتے ہیں اسے دیکھ کر۔“ سی تھرو نے کہا۔

چوکیدار نے سونٹا باہر کھڑا کیا اور خود جلدی سے بوتھ میں داخل ہو گیا۔ اس نے ٹیلیفون کا چونکا اٹھایا اور فون پر باتیں کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن بات سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چند ایک منٹ کے بعد وہ بوتھ سے باہر نکلا اور حسب معمول ہال کا چکر لگانے کی بجائے ہال کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

”ضرور کوئی ایمر جنسی ہے۔“ شکاری نے چھائے ہوئے سکوت کو توڑا۔

گیلری میں رومی ٹوپی والا ہنسا۔ ”ایمر جنسی۔۔۔۔۔ یہ دور تو بذات خود ایک سٹیٹ آف ایمر جنسی ہے۔“

”ایک اباں ہے“ بے مقصد اباں۔“ لنگی والے نے قہقہہ لگایا۔

منی سکرٹ نے لمبی لمبی پٹلیں جھپکا کر اوپر دیکھا۔

”اگنور ہم مائی ڈیز“ موٹر سائیکل نے سائیکلسٹ فرٹ کر کے کہا۔

”میں کہتا ہوں ضروریہ کسی کے انتظار میں کھڑا ہے۔ ضرور کوئی آنے والا ہے۔“ سٹوڈنٹ زیر لب بولا۔

”چو کیدار کو دیکھ کر میری روح خشک ہو جاتی ہے۔“ سی تھرو نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

لنگی والے نے مسکرا کر کہا ”بی بی کیا تیرے اندر روح بھی ہے۔ ہوتی تو تو سی تھرو نہ ہوتی۔“

”کتنی ڈراؤنی شکل ہے چوکیدار کی۔“ پتلون والی، لنگی والے کے سوال کو دبانے کے لئے بولی۔

رومی ٹوپی والا ہنسے لگا۔ ”کتنی عجیب بات ہے! اپنوں کو دیکھ کر ڈر کر سہم جاتی ہیں۔ بیگانوں کو دیکھ کر ایٹ ہوم محسوس کرتی ہیں۔“

”سٹ اپ۔“ پتلون والی ڈانٹ کر بولی۔۔۔۔۔ ”یو۔۔۔۔۔ ان کلچرڈ“۔۔۔۔۔

ان کو تھ۔۔۔۔۔ سیدوج۔“

”ول سید“ بلک سوٹ نے کہا۔ ”ہیر ہیر۔۔۔۔۔ جٹلمین چیئرز“

سارا ال تالیوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ ”ہمارے دور میں ان سویلا رڈ۔ ان ایجوکیٹڈ لوگوں کو لب ہلانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔“ جیکٹ والا منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے بولا۔

”تمہارا دور“ مجنوں نما ہنسا۔ ”نقا لوں کا دور چر بہ دور۔ یہ مغربی تہذیب کی کاہلی ہے کاہلی۔ بیگانوں کی طرز زندگی کی نقل کرو۔ ان

کے خیال کو اپناؤ۔ اپنوں سے لگتوں سے نفرت کرو۔ یہی نا“

[illegible]

”میں کہتی ہوں“ پھن نے اس کی بات کاٹی۔ ”اگر نقل ہی کرنی ہے تو کسی ایسی قوم کی کرو جس میں جان ہے۔ زندگی ہے۔ چربہ بننا ہے تو کسی ایسی تہذیب کا بنو جو ابھر رہی ہے۔ کیوں ڈوبتے سورج کو پوچھ رہے ہو۔“

جیکٹ والے نے اپنا قلم جیب میں اٹکایا۔ عینک کو سنبھالا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ہال کے درمیان آ کر بولا ”کون نہیں جانتا کہ کون سی قومیں ابھر رہی ہیں۔“

مشہدی لنگی قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”ذرا اس فیشن آرکیڈ پر نظر دوڑاؤ۔ کیا یہ رنگ ان قوموں کا ہے جن کا تم حوالہ دے رہے ہو؟“

”کیا یہ منی سکرٹ؟ یہ سی تھرو بی بی اس آئیڈیل کے مظہر ہیں جس کے تم دعوے دار ہو؟ کیا تمہارا دور جس پر تم اتنے نازاں ہو تمہارے مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے؟“ رومی ٹوٹی والا جوش میں بولا۔

[illegible]

ہال پر خاموشی طاری ہو گئی۔ سب چپ ہو گئے۔ رومی ٹوپی ہنسنے لگا۔ کسی نے رومی ٹوپی کو جواب نہ دیا۔

”وہ دن کب آئے گا؟“ دور سے یوں آواز سنائی دی جیسے کوئی آہیں بھر رہا ہو۔

”کون سا دن بی بی؟“ کرتے یا جامے نے پوچھا۔

”جب مجھے مامتا کے جذبے پر شرمندگی نہ ہوگی۔“ بچے کو انگلی لگائے کھڑی ماں بولی۔ ”جب اس آرکیڈ میں سر اٹھا کر کھڑی ہو سکوں گی۔“

”سچ کہتی ہو بی بی۔ آج کے دور میں مائیں اپنے بچوں کو اپناتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں۔“ رومی ٹوپی نے کہا۔

”وہ ماں کہلوانا نہیں چاہتیں۔“ کرتے یا جامے والا بولا ”بچوں سے کہتی ہیں مجھے باجی بلاؤ۔“

”آج کی عورت عورت بن کر جینا چاہتی ہے ماں بن کر نہیں۔“ لنگی والا بولا۔

”میں پوچھتا ہوں کیا عورت کو عورت بن کر جینے کا حق نہیں۔ تم نے اسے ماں بنا کر قربانی کا بکرا بنا دیا تھا۔ ہم نے اسے عورت کی حیثیت سے جینے کا حق دیا ہے۔“ بلیک سوٹ نے کہا۔

”تمہیں کچھ پتا بھی ہو۔“ رومی ٹوپی ہنس کر بولا ”وہ سب تہذیبیں تباہ کر دی گئیں جنہوں نے مامتا کو رد کر دیا تھا اور عورت کو عورت بن کر جینے کا حق دیا تھا۔ اس دنیا میں صرف وہی تہذیب پنپ سکتی ہے جو بچے کو زندگی کا مقصد مانے۔“

”پاگل ہیں یہ ماضی کے دیوانے۔“ جیکٹ والے نے عینک اتار کر صاف کی۔ ”اتنا نہیں جانتے کہ آج سب سے بڑا معاشی مطالبہ یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش کو روکا جائے۔“

”بالکل بالکل“ بلیک سوٹ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

”بچے کم خوشحال گھرانہ۔“ موٹر سائیکل گنگنا نے لگا۔

”سبحان اللہ“ مشہدی لنگی والا بولا ”سوشل ازم کے نام لیوا سرمایہ داروں کے حربے کا پرچار کر رہے ہیں۔“

”بھائی صاحب بچے تو غربت کی پیداوار ہیں۔ قدرت کا اصول ہے جس گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگی بچے پیدا کرنے کی قوت کم ہو جائے گی۔ اگر غریبوں کی یہ صلاحیت ختم کر دی گئی تو تخلیق کا عمل مدھم پڑ جائے۔ شاید ہو جائے۔“ رومی ٹوپی نے کہا۔

”مین پاور کی عظمت کو ماننے والے بچوں کی پیدائش کو معاشی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔“ مجنوں نما قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

”پتلیاں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔

”کیا کہہ رہا ہے یہ؟“

”گاڈ نوز۔۔۔۔۔۔!“

”ہے چلڈرن آراے نوے سنس“

”سیانوں نے کہا تھا“ کرتا پا جامہ کہنے لگا ”کہ۔۔۔۔۔۔“

”کون سیانے؟“ جیکٹ والے نے پوچھا۔

”ہمارے لگتے لوگ۔“ کرتا پا جامہ نے وضاحت کی کوشش کی۔

”تم اپنے لگتوں کی کیا بات کر رہے ہو۔“ لنگی والے نے اسے ٹوکا۔ ”انہیں سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ان کے لگتے تو مغرب میں

رہتے ہیں۔ یہ تو مغربی تہذیب کے دیوانے ہیں۔“

”وہ دن دور نہیں۔“ اچکن والے نے کہا۔ ”جب انہیں اپنے لگتوں کو اپنا نا پڑے گا۔“

”بھول جاؤ وہ دن۔“ جیکٹ والا جلال میں بولا ”وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔“

”ہم ترقی کی جانب قدم اٹھا رہے ہیں۔ ہم آگے بڑھنے کے قائل ہیں۔ ہم کبھی واپس ماضی کی طرف نہیں جائیں گے۔“

موٹر سائیکل نے لٹکے بالوں والی کی طرف دیکھا۔ ”کیوں ڈارلنگ!“

”فارگٹ دیٹ ڈے اٹ ول نیور کم۔“ لٹکے بالوں والی نے جھٹک کر کہا۔

گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک پتلا اٹھ بیٹھا۔ اس نے ایک لمبا چنچہ پہن رکھا تھا۔ سر پر کلاہ تھا۔ ”کون نہیں مانتا اس دن کو۔ کیا

تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ دنیا کا نظام بدل رہا ہے۔“

”اچھا بدل رہا ہے کیا۔“ شکاری نے طنزاً کہا۔

سب پتلے چسنے لگے۔

”دنیا کے سارے مذہب سارے نجومی سارے سینرز آنے والے گولڈن ایج کو مانتے ہیں۔“ چغے والا چلایا۔

”عیسائی، مسلمان، یہودی، ہندو سبھی مانتے ہیں۔ اسٹرا لوجرز اس کی شہادت دیتے ہیں۔“ رومی ٹوپی والے نے کہا۔

”وہ گولڈن ایج۔“ چغے والے نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ”جب ترقی کا رخ مادی سہولتوں سے ہٹ کر روحانی مقاصد کی طرف مڑ

جائے گا۔ جب ہماری توجہ باہر کے آدمی کی جگہ اندر کے آدمی پر مرکوز ہو جائے گی۔ جب امن ہوگا۔ اطمینان کا دور دورہ ہوگا۔“

موٹر سائیکل نے طنز بھرا قبہ مارا۔

جیکٹ والے نے چلا کر کہا ”ضعیف الاعتقاد نہیں خوش فہمی ہے یہ۔“

”اچھا“ ماں بولی ”کیسا گولڈن ایج ہوگا وہ؟“

”نشاة ثانیہ“ ہال کی دیواریں گونجنے لگیں۔

”دنیا پر مبارک ترین ستاروں کا اکٹھ ہو رہا ہے۔ ایسا اکٹھ جو کبھی آج تک نہیں ہوا تھا۔“

چغے والا بولا ”اس کے اثرات ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ ظہور میں آئیں گے۔“

ٹوکر بالوں والی نے منہ میں انگلی ڈال لی۔ ”سچ؟“

ساڑھی والی نے سینہ سنہجایا۔

خاموش لٹکے بالوں والی چلائی۔ ”وہ دیکھو۔۔۔۔۔ وہ“ اس نے انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ سب انگلی کی سیدھ میں پورٹیکو کی طرف دیکھنے لگے۔

”کیا ہوا؟“ دور سے پولکا بکس کے قریب کھڑی پتلون والی نے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

”پتہ نہیں۔“

”کون ہے؟“

دور کھڑی پتلیاں سرگوشیاں کرنے لگیں۔

موٹر سائیکل نے اپنا سائلینر فٹ کر کے کہا۔ ”وہ آ رہے ہیں خاموش۔“ اس نے دور کھڑے پتلوں کو خبردار کیا۔ ”وہ آ رہے ہیں“ ادھر آ رہے ہیں۔“

”ہاں ہاں“ لٹکے بالوں والی نے کہا۔ ”انتظامہ کے لوگ آ رہے ہیں۔“

”بالکل“ ساڑھی والی نے کہا۔ ”وہ ضرور اندر آئیں گے۔“

[illegible]

سارے پتلے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہونے کے لئے دوڑے۔

گیلری میں کھڑے تیلے کونوں میں جا کر ڈھیر ہو گئے۔

ہال پر سناٹا طاری ہو گیا۔

آرکیڈ کا صدر دروازہ کھلا۔ ناظم اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے نائب تھا۔ نائب کے پیچھے دس بارہ کاریگر تھے۔ انہوں نے پینٹ کے بڑے ڈبے اور برش اٹھائے ہوئے تھے۔

ناظم کرسی پر بیٹھ گیا۔ نائب اور کارگیر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ”دیکھو اس وقت تین بچے ہیں۔“ ناظم نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہمارے پاس صرف چھ گھنٹے ہیں۔ حکومت کے معزز مہمان جو دنیاۓ اسلام کے بہت بڑے سربراہ ہیں، ٹھیک ساڑھے نو

بچے آرکیڈ دیکھنے کے لئے آرہے ہیں۔ ان کے آنے سے آدھ گھنٹہ پہلے سارا کام مکمل ہو جانا چاہیے۔ سمجھے!“ ناظم نے نائب سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یس سر“ نائب نے جواب دیا۔ ”اٹ شیل بی ڈن“

”ہوں“ ناظم نے کہا ”ہمارے پرائم سنٹر صاحب کا کہنا ہے کہ معزز مہمان توقع رکھتے ہیں کہ پاکستان کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر پاکستانی رنگ میں رنگا ہوگا اور پاکستانی زندگی، دستکاری اور فن کا مظہر ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ آرکیڈ کی ہر تفصیل پاکستانی ہو۔ سمجھے۔“

”آپ فکر نہ کریں سر۔“ نائب نے کہا

پھر وہ کاریگروں سے مخاطب ہوا۔ دیکھو بھی اتنے تھوڑے وقت میں اتنے شارٹ نوٹس پر ہم نیا سامان مہیا نہیں کر سکتے۔ اس لئے اسی سامان کو رنگ و روغن کر کے گزارہ کرنا ہوگا۔“

”جی صاحب“ کاریگروں نے جواب دیا۔

اگلے روز ساڑھے نو بجے جب معزز مہمان آرکیڈ میں داخل ہوئے تو صدر دروازے کے اوپر فیشن آرکیڈ کی جگہ پاکستان آرکیڈ کا بورڈ لگا تھا۔ اندر دروازے کے عین سامنے اچکن والا بڑے طمطراق سے کھڑا تھا۔ اس کے پاس ہی دائیں طرف رومی ٹوپی والا اپنا پھندا جھلارہا تھا۔ بائیں طرف طرہ باز مونچھ کو تاؤ دے رہا تھا۔ قریب ہی بچے کو انگلی لگائے چادر میں لپیٹی ہوئی خاتون بچے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے پرے کرتے پاجامے والا چھاتی پھلائے استادہ تھا۔

ساڑھی والی لمبا چنڈ لٹکائے لگا ہیں جھکائے لجا رہی تھی۔

سر تھرو چیئٹ کا گھگھراپنے سر پر پانی کی گاگر رکھے قدم اٹھائے کھڑی تھی۔

سکرٹ والی چست پاجامہ پہنے بازو پر جدید لمبا کوٹ اٹھائے مسکرا رہی تھی۔



ایڈیٹر

یہ ایک انوکھے سفر کی کہانی ہے۔

آپ نے عجیب و غریب سفروں کی کہانیاں سنی ہیں۔ سند باد کے سفر، الف لیلوی سفر، گلیور کے سفر۔۔۔۔۔۔ یاشیتیوں میں' ولوقا متوں میں۔

لیکن صائم کی ماں کا یہ سفر بالکل انوکھا تھا۔ وہ کبھی عازم سفر نہ ہوئی تھی۔ نہ ہی رخت سفر باندھا تھا۔ نہ ہاتھ میں لگام تھامی تھی نہ پاؤں رکاب پر رکھا تھا۔

نہ وہ کبھی جہاز پر سوار ہوئی تھی۔ نہ جہاز طوفان سے نکلایا تھا۔ نہ وہ بہہ کر کسی انجانے جزیرے کے ساحل پر جا گئی تھی۔ پھر پتہ نہیں کیسے۔۔۔۔۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک ان جانی بیگنی مخلوق اس کے گرد بھڑلگائے کھڑی اسے یوں دیکھ رہی ہے جیسے وہ عجوبہ مخلوق ہو۔

یہ سفر اس لحاظ سے انوکھا تھا کہ اماں نے خود حرکت نہ کی تھی بلکہ ایک ایلیمن ماحول خود بخود چل کر اس کے ارد گرد آکھڑا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگی ”یا اللہ یہ میں کہاں آ گئی ہوں۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ لوگ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟“

ان ایلینز میں بہت سے چہرے مانوس دکھتے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ انہیں جانتی ہو۔ جیسے وہ اس کے ہم سفر رہے تھے۔ لیکن یہ نہیں کیوں ایک نظر میں وہ مانوس دکھتے، دوسری نظر میں ایسے لگتا جیسے بیگانہ ہوں۔ ایلینز

پھر اماں کو اپنے پر شک پڑنے لگا۔۔۔۔۔ میں کون ہوں۔۔۔۔۔ کہاں ہوں۔۔۔۔۔ میرا مصرف کیا ہے۔۔۔۔۔
کس لئے ہوں۔۔۔۔۔ کیوں ہوں۔۔۔۔۔؟

اے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ سوچتی رہی۔ محسوس کرتی رہی۔ سوچتی رہی حتیٰ کہ بیمار پڑ گئی۔ ڈاکٹر نے ٹوٹیاں لگا کر اسے دیکھا۔ ڈاکٹر تو صرف ڈائی گنوسز کرتے ہیں۔ انہیں بیماری سے دلچسپی ہے، انسان سے نہیں۔ انہیں ابھی تک لاشعور نہیں ہوا کہ بیماری روح سے پھوٹتی ہے۔ ڈاکٹر بھلا کیا کہتا۔ مریضہ کو کوئی بیماری نہیں۔ صرف کمزوری ہے۔ بڑھاپا ہے۔

جس کا فکر جسم تک محدود ہو وہ کیسے سمجھے گا کہ بڑھاپا عمر سے نہیں ہوتا بلکہ جینے کی امنگ نہ رہے تو اعضا بوڑھے ہو جاتے ہیں۔

اماں میں جینے کی امنگ نہ رہی تھی۔

جینے کی امنگ تبھی قائم رہتی ہے جب کوئی خواہش، کوئی خیال، کوئی امید، کوئی فرد، کوئی مطمح نظر، کوئی سراب آپ انگلی پکڑ کر چلائے۔ جینے کی امنگ تبھی قائم رہتی ہے جب آپ کی اپنی حیثیت ہو، اہمیت ہو۔ آپ کو احساس ہو کہ آپ کا کوئی مصرف ہے۔ کئی ایک سال سے اماں محسوس کر رہی تھی کہ اس کا کوئی مصرف نہیں رہا۔ وہ ایک فالتو ہستی ہے۔

رضائی میں پڑی ہوئے سلوٹ میں جنبش ہوئی۔ ہڈیوں کے ایک ڈھانچے نے سر نکالا۔ بے نور آنکھوں نے صائم کی طرف دیکھا۔ نگاہیں صائم سے پار ہو گئیں۔ اگر اماں کے لئے صائم میں کوئی مفہوم ہوتا تو یقیناً صائم پر رک جاتیں۔ آنکھوں میں لگاؤ کی چمک لہراتی لیکن صائم تو عرصہ دراز سے اس کے لئے ایلین بن چکا تھا۔

صائم آسیہ کا اکلوتا بیٹا تھا جو اس وقت ماں کی چار پائی کی پابنتی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت کمرے میں ماں اور بیٹے کے سوا کوئی نہ تھا۔ آٹھ دن سے وہ اس کی پابنتی پر بیٹھا تھا۔ آٹھ دن سے آسیہ مر رہی تھی۔

دفعاً اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں تڑپ پیدا ہوئی۔ آسیہ کی مضطرب لیکن کراکری آواز گونجی۔ ”اب کیا دیر ہے اب کس کا انتظار ہے۔ تم مجھے لے جاتے کیوں نہیں؟“ اس نے ارد گرد کی فضا کو مخاطب کر کے کہا۔ آسیہ کی بات کرنے کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کمرے میں صائم کے علاوہ اور لوگ موجود تھے۔ شاید روح ہوں۔ بیولے ہوں۔ فرشتے ہوں۔

آٹھ دن سے وہ آسیہ کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ آٹھ دن سے وہ انہیں ڈانٹ رہی تھی۔ ”میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ مجھے لے جاتے کیوں نہیں؟ اب کیا دیر ہے؟“

اس نے گھر کے باقی لوگوں سے بات کرنا چھوڑ رکھی تھی۔

گھر میں صرف چند ایک لوگ ہی تو تھے۔ صائم اس کی دونو جوان بیٹیاں سلمیٰ، ستارہ، ایک بیٹا سمیع، بہو اسماء اور صائم کی بیوی

سمینہ۔

عرصہ دراز سے آسیہ ان سب افراد کی زندگیوں سے خارج ہو چکی تھی۔

اگرچہ ان سب کے دلوں میں بوڑھی اماں کی بڑی عزت تھی۔ لیکن عزت تو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عزت تو کوئی جذبہ نہیں۔ عزت تو تہذیب کی ایک مصنوع ہے جس طرح پلاسٹک کے پھول ہوتے ہیں۔ اماں وہ شہد کی مکھی تھی جس کے ارد گرد پلاسٹک کے پھولوں کا باغ سجا ہوا تھا۔

صرف ایک گھرانے کو اماں سے قلبی تعلق تھا۔ وہ ڈاکٹر صولت کا گھر تھا۔ ڈاکٹر صولت اماں کے بھائی کا بیٹا تھا۔ اس کا گھر ایک جزیرہ تھا جہاں جدید دور کی آندھی اثر انداز نہ ہوئی تھی۔ جہاں ماضی ابھی تک حال کا بہروپ دھارے آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر صولت کا گھر واحد گھر تھا جہاں اماں کے لئے ایلینز نہیں بستے تھے۔ جہاں وقت کو دوام مل گیا تھا۔ جہاں ابھی تک انیسویں صدی چل رہی تھی۔ جہاں بڑی اماں کو محسوس ہوتا کہ وہ اصلی پھولوں پر بیٹھی ہے۔

لیکن صائم کے لئے ڈاکٹر صولت کا گھر ایک دقیانوسی مقام تھا۔ اسے صولت سے شکایت تھی کہ اس نے گھر کو حنوط کر رکھا ہے۔ اور اس حنوط شدہ گھر نے آسیہ کو اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ کہیں اور رہ سکے۔ صولت کی نسبت صائم کا تعلق آسیہ سے کہیں زیادہ پرانا اور گہرا تھا۔

آسیہ اور صائم نے ساہا سال اکٹھے مل کر دکھ سہے تھے۔ اکٹھے مل کر دکھ سہنا گہرا تعلق پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب گرد و پیش ایلین نہ تھا۔ جب آسیہ نے اپنے دور میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ جب لوگ اس کی بات سمجھتے تھے۔ اسے اہمیت دیتے تھے۔ جب زندگی میں اس کا ایک مقام تھا، مفہوم تھا۔

ان کے دکھوں کی وجہ صرف حالات کی ناسازگاری تھی۔ اس ناسازگاری کی بنیاد ایک عام سا حادثہ تھا کہ خاوند نے دوسری شادی کر لی تھی اور آسیہ کو ہمیشہ کے لئے گھر کی نوکرائی کی حیثیت دے دی گئی تھی۔

جس باورچی خانے میں اسے رات دن کام کرنا پڑتا تھا، وہاں سے اسے اپنے اور اپنے بیٹے کے لئے طعام نہیں ملتا تھا اس لئے مالک اور مالکن کو کھانا کھانے کے بعد اسے اپنا چولہا جھونکنا پڑتا تھا۔

مالک کے باورچی خانے کا ایک فائدہ ضرور تھا کہ جب وہاں بھنڈی پکتی تو آسیہ بھنڈیوں سے اتاری ہوئی ٹوپیاں لے آتی اور ان سے اپنی ہانڈی پکاتی۔ جب وہاں کریلے پکتے تو کریلوں سے چھیلا ہوا بور پکانے کو مل جاتا۔ نوکرائی کے بیٹے کے لئے بور کریلے تھا، ٹوپیاں بھنڈیاں تھیں، چھلکے سبزیاں تھیں۔

مالک رات گئے گھر آتا تھا اور نوکرائی کو انہیں کھانا کھانے سے پہلے چھٹی نہیں ملتی تھی۔ کھانا کھلا کر جب وہ آؤٹ ہاؤس میں پہنچتی تو بیٹا سوچکا ہوتا۔ پھر وہ چولہا جھونکتی، چھلکے پکاتی اور جب ہانڈی تیار ہو جاتی تو بیٹے کو جگاتی۔ اسے کھانا کھلاتی۔ بیٹا کھا تو لیتا تھا مگر جاگتا نہ تھا اس لئے اسے یاد نہیں تھا کہ بچپن میں اس نے کبھی رات کا کھانا کھایا ہو۔

پھر مالک کا سٹیش اونچا ہو جانے پر ایک ٹرینڈ باوردی نوکر رکھنا لازم ہو گیا۔ اس لئے آسیہ کو نکال دیا گیا اور ماں بیٹا آزاد ہو

گئے۔ آزادی نے انہیں نئے مسائل سے دوچار کر دیا۔ الاؤنس بہت قلیل تھا۔ ضرورت بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔

بڑھتی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ماں بیٹے کو محنت مزدوری کرنی پڑتی۔ انہوں نے مل کر چار پائیاں بنیں۔ کتابوں پر جلدیں باندھیں۔ کاغذ کے پھول بنائے۔ پتنگ بنائے۔ دھاگہ خرید کر اس پر مانجھا لگایا تاکہ ڈور بیچ سکیں۔ بچوں کے کھلونے بنائے۔ آسیہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا محنت مزدوری کرے۔ اس کی خواہش تھی کہ ایک سلائی مشین خرید لے اور اکیلی سلائی کا کام کرے۔ لیکن اتنے پیسے نہ تھے۔ پر کسی مخیر نے قرض کے طور پر پرانی گھسی پٹی سلائی مشین خرید دی اور وہ کپڑے سینے لگی۔

آسیہ ہر فن مولا عورت تھی۔ وہ ہر کام کر سکتی تھی۔ وہ ہر عام سے عام کام میں بھی انفرادیت کی کلیاں ٹانک دیا کرتی تھی۔ انوکھے کام سوچا کرتی۔ انوکھی چیزیں بنایا کرتی۔ لیکن یہ اس دور کی بات ہے جب ہاتھ کے کام کی قدر نہ تھی، قیمت نہ تھی۔ ان کا باہمی تعلق بہت گہرا تھا۔ اس تعلق کے کئی رخ تھے۔ ماں بیٹے کا تعلق۔ مظلومیت کا تعلق۔ غربت کا تعلق۔ مزدوری کا تعلق۔ دکھ کا تعلق۔

اگر صائم علم حاصل نہ کرتا اور وہ دونوں ہمیشہ کے لئے مزدور رہتے۔ محنت اور مشقت بھری زندگی بسر کرتے اور یہ تعلق جوں کا توں قائم رہتا۔ لیکن علم فینچی بن کر آیا اور اس نے اس عظیم تعلق کے پرزے اڑا دیے۔

شاید علم دوست اس پر احتجاج کریں اور اپنی جواز پسندی کے تحت تاویل پیش کریں کہ جو خلوص بھرے تعلق کے پرزے اڑا دئے وہ علم دوست نہیں ہو سکتا۔ مجھے کسی حتمی علم کا پتہ نہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جو رائج الوقت ہو، وہی علم ہوتا ہے۔ ہر دور میں رائج الوقت علم کا خصوصی رخ ہوتا ہے۔

آسیہ کے دور میں ایمان لانا تھا۔ صائم کے دور میں شک کرنا۔ تاریخ شاہد ہے کہ علم کا رخ ہمیشہ گرگٹ کی طرح بدلتا رہا ہے۔ صائم کے زمانے میں عقل و خرد کا دور تھا۔ جوں جوں وہ علم حاصل کرتا گیا، جوں جوں عقل و خرد کی آنکھیں کھلتی گئیں، توں توں مضحکہ خیز ہوتا گیا۔ تعلقات کھٹتے گئے۔

صائم کو آسیہ کے خلاف کئی ایک شکایات پیدا ہو گئیں۔ اماں ایسے مرد سے شادی کرنے پر رضامند ہوئی جو کسی ایک عورت کا ہو کر نہیں رہ سکتا تھا بلکہ جسے عورت ذات سے دلچسپی تھی۔ اماں نے اپنے ہی گھر میں نوکرانی بن کر رہنے کو کیوں منظور کیا۔ اماں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کیوں نہ کی۔ اماں نے اندھی و فاشعاری کو کیوں اپنائے رکھا۔ شاید اماں غم خور ہو۔ شاید اماں ایذا پسند ہو۔

آہستہ آہستہ صائم کی نگاہ میں مظلوم اماں تسکین پسند آسیہ نظر آنے لگی۔ دکھی اماں ایذا پسندی کی لذت سے سرشار دکھائی دینے

لگی۔ یوں باہمی مظلومیت کا تعلق ٹوٹا گیا۔ دکھ کا تعلق ٹوٹا گیا۔ مزدوری کا تعلق بڑھتا گیا۔ ایذا پسند کے لئے محنت و جدوجہد نہیں ہوتا۔ دکھ دکھ نہیں ہوتا۔ بلکہ انا کی تسکین ہوتی ہے۔ بطح کے لئے جو ہڑ ہوتا ہے۔

اس عقل و دانش بھری سوچ بچار کی توجہ سے ایک ایسا دن آیا جب دونوں کے درمیان صرف ایک تعلق باقی رہ گیا۔ بیٹے اور ماں کا تعلق۔ لیکن بیٹے اور ماں کا تعلق تو ایک عارضی تعلق ہے جو صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک بیٹا ماں کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ تو ماں کا بیٹے سے تعلق ہے جو واحد دائمی تعلق ہے۔

چونکہ صائم ماں کا محتاج نہیں رہا تھا اس لئے وہ تعلق بھی ٹوٹ چکا تھا۔ صرف برائے نام باقی تھا۔ اس برائے نام تعلق کو ہم رسی طور پر احترام بھی کہتے ہیں۔

احتراماً صائم آٹھ روز سے اماں کی پابندی پہ بیٹھا تھا۔ اور آٹھ روز سے اماں مسلسل مر رہی تھی۔

دیر تک وہ رضائی میں پڑی ہوئی سلوٹ کی طرف دیکھتا رہا، کوئی جنبش نہ ہوئی۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ ”شاید۔۔۔۔۔“ اس نے پھر غور سے اماں کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ میں ڈر نہیں بلکہ امید کی جھلک تھی۔ جیسے اس شاید نے آنکھوں میں دیاروشن کر دیا ہو۔

چونکہ اماں نے منہ رضائی میں ڈھانپ رکھا تھا۔ صائم نے بیٹھے بیٹھے اندازہ لگایا کہ اماں کا دل کہاں ہوگا۔ پھر وہ اس مقام کو ٹنگی باندھ کر دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا کہ حرکت ہے یا نہیں۔ وہ مقام بالکل ساکت تھا۔

اس کے دل سے ایک ہلکی سی آواز آئی جیسے کسی نے اطمینان کا سانس لیا ہو۔ پھر ایک سرگوشی سی اٹھی۔ اچھا ہوا۔ بے چاری اس عذاب سے مخلصی پا گئی۔

اس کے اندر رچی بسی ہوئی عقل بول رہی تھی۔

پتہ نہیں کبھی کبھی وہ سرگوشیوں میں کیوں بولتی تھی۔ ایسے کیوں بولتی تھی جیسے وہ احساس گناہ سے بھیگی بھیگی ہو۔

اس کے اندر رچی بسی عقل تو گھر کی ملکہ تھی۔ عرصہ دراز سے گھر پر اس کا راج تھا۔ پھر وہ سرگوشیوں میں بات کیوں کرتی تھی۔ کس سے ڈرتی تھی۔ صائم کے دل میں وہ کون تھا جس کے ڈر سے سہم جاتی۔ شرمسار ہو جاتی۔ ندامت سے بھیگ جاتی۔ اس کی آواز زیر لبی ہو کر رہ جاتی۔

صائم کو تو اپنی عقل پر ناز تھا۔ وہ اپنے آپ کو دانشور سمجھتا تھا۔ محفلوں میں جان بوجھ کر بلند آواز میں ایسے اداریں نکلتے بیان کرنے کا عادی تھا جو دوسروں کو چونکا دیں۔

محفلوں کی بات چھوڑیے۔ اس نے کئی بار اپنی عقل و دانش کے بل بوتے پر ماں سے کہہ دیا تھا۔ ”اماں جب تم مرو گی تو میں دیگیں چڑھا دوں گا۔ غریبوں کو کھانا بانٹوں گا۔ شکرانے کے نفل پڑھوں گا کہ یا اللہ تیرا احسان ہے کہ تو نے میری ماں کو اتنی لمبی عمر دی اور مجھے ماں کے ساتھ اتنی دیر اکٹھے رہنے کا موقعہ عطا کیا۔ اور ماں میں گھر والوں سے کہہ دوں گا کہ میری ماں کے مرنے پر کوئی نہ روئے۔ کوئی بین نہ کرے۔ رونا اور بین کرنا تو ناشکری کے مترادف ہے۔“

آسیہ کی عمر 95 سال تھی۔ صائم سمجھتا تھا کہ ساٹھ ستر سال کے بعد موت زحمت بن جاتی ہے۔ صائم خود ستر سال کا ہو چکا تھا۔ خود اس کے اپنے ارد گرد ایلین ماحول قائم ہو چکا تھا۔ اس کی اپنی بیٹیاں سلمیٰ اور ستارہ اس کے خیالات اور احساسات سے بیگانہ تھیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ خود ماضی میں اماں سے بیگانہ ہوا تھا۔

اماں کے ایلین بننے کی بات تو سمجھ میں آتی تھی۔ اماں جدید تعلیم سے آراستہ نہیں تھی۔ لیکن سلمیٰ ستارہ کے ایلین بننے کے بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ صائم کا ماں سے تعلق تو علم نے کاٹا تھا۔ لیکن اولاد سے کٹنے کی ذمہ داری کس پر تھی۔

اس ڈر کے مارے کہ اس کے اپنے بچے اس سے کٹ نہ جائیں وہ مسلسل علم حاصل کرتا رہا۔ رائج الوقت علم زمانے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا تا کہ پیچھے نہ رہ جائے۔۔۔۔۔ پھر بھی۔ وہ پیچھے رہ گیا۔ کیوں؟

اس مسئلہ پر وہ سوچتا رہا تھا۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ وہ بے علمی کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ دانش کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ صائم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ شاید وہ علم ہی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہو۔ یہ سوچے بغیر کہ جذبہ تو راستہ ہوتا ہے منزل نہیں۔ منزل کیسی۔۔۔۔۔ ان کے جذبے کا تو کوئی رخ ہی نہ تھا۔ صرف شدت ہی شدت تھی۔ ہانڈی آگ پر چڑھی تھی مگر ہانڈی میں تھا کیا؟

سوچ سوچ کر وہ ہار گیا مگر سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔۔۔۔۔ مثلاً

سلمیٰ کو فلم اس لئے پسند آتی کہ اس میں کوئی خاص اداکار ہوتا۔ اگر وہ اداکار ہوتا تو سب کچھ آپ ہی آپ ہو جاتا۔ فلم کی کہانی عمدہ ہو جاتی۔ فوٹو گرافی شاندار ہو جاتی۔ مکالمے چست ہو جاتے۔

ستارہ کوئی وی سیریز اس لئے ناپسند ہوتی کہ اس میں کام کرنے والی کسی ایکسٹرا عورت کی شکل و صورت ایسی ہوتی کہ دیکھ کر اسے گھن آتی۔

سلمیٰ سمجھتی کہ کالج کی فلاں پروفیسر اس قدر عمدہ پڑھاتی ہے کہ ایک ایک لفظ دلنشین ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بڑی پیاری ہے۔ کتنی پیاری ہے وہ!۔۔۔۔۔ سلمیٰ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی کہ کوئی بد شکل پروفیسر اچھا پڑھا سکتی ہے۔

ستارہ سمجھتی تھی کہ فلاں مضمون اس لئے اچھا ہے کہ فیشن ایبل سر میں اس کا ذکر رہتا ہے اور فلاں فلاں مضمون اس لئے برا ہے کہ اس میں دقیانوی سوچیں بھری پڑی ہیں۔

اتفاقاً صائم نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے میں سلمیٰ کھڑی تھی۔ بال لٹک رہے تھے۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ سرد دروازے کی چوکھٹ سے لٹکا ہوا تھا۔ وہ آسیہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سلمیٰ حزن و ملال کی تصویر بنی کھڑی تھی۔

گھر کے سارے افراد حزن و ملال سے بھرے ہوئے تھے۔ سارا ماحول حزن و ملال سے بوجھل ہو رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ ماں یادادی مر رہی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ گھر میں موت گھس آئی تھی۔ چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی۔ سارا گھر موت سے یوں لبالب بھرا ہوا تھا جیسے انار دانوں سے بھرا ہوتا ہے۔

ان جانے میں گھر کا ہر فرد کا آرزو مند تھا کہ وہ بوجھ اٹھائے۔ بوجھل بورڈم دور ہو جائے۔ گھر کا موڈ بحال ہو جائے۔ چاہے بوڑھی اماں پر کچھ بیت جائے۔

سلمیٰ نے اشارے سے پوچھا کہ بڑی اماں کا کیا حال ہے۔

صائم نے مایوسی میں سر ہلادیا۔

سلمیٰ کی اداسی اور گہری ہو گئی۔ سر ڈھلک گیا۔ بال لٹکنے لگے اور ساتھ ہی آنکھوں میں امید کی کرن ناچنے لگی۔

سلمیٰ ایک جذبات لڑکی تھی۔ اسے آسیہ سے بڑی محبت تھی لیکن کیا کرتی، اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے مجبور تھی۔ اس کی چہیتی سہلی شافی کے بیاہ کو صرف آٹھ دن باقی رہ گئے تھے۔ اس نے شافی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اس کے بیاہ پر ملتان آئے گی۔ وہ چاہتی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے، لیکن اس کے ملتان جانے میں رخصت نہ پڑے۔ اور اگر اماں یونہی پڑی رہی تو وہ ملتان نہ جاسکے گی۔

پہلے ہی اماں کی بیماری کی وجہ سے سلمیٰ کی ساری روٹین تباہ ہو چکی تھی۔ مثلاً فون ہی لیجئے۔ فون اس برآمدے میں لگا ہوا تھا جو اماں کے کمرے سے ملحق تھا۔ اماں کی وجہ سے سلمیٰ فون کو آزادانہ طور پر استعمال نہیں کر سکتی تھی۔

پہلے تو عادی طور پر وہ ہر آنے والی کال کو بڑے شوق سے موصول کیا کرتی تھی۔ ان کالوں میں زیادہ تر رانگ نمبر ہوتے تھے۔ وہ ان رانگ نمبروں کو بڑے نخرے سے جھاڑ پلا دیا کرتی۔ یا بڑے تہذیب یافتہ انداز سے مذاق اڑا دیتی۔

خاص سہیلیوں کے علاوہ سلمیٰ کو کسی خاص راسخ یا رانگ نمبر سے دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن رانگ نمبر کو کائنات میں کتنا مزا آتا تھا۔ واٹس فن۔۔۔۔۔ اظہار لگاؤ کے جواب میں اظہار بے نیازی میں کتنی لذت ہوتی ہے۔

اماں کی بیماری کی وجہ سے وہ سہیلیوں سے بھی بات نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے تو وہ فون پر گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی۔ پتہ نہیں کیا باتیں کرتی تھی۔ پاس کھڑے شخص کے کچھ پلے نہیں پڑتا تھا۔ فون پر وہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد ایک ایک لفظ بوتلی رہتی۔ ”اچھا۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔ بور۔۔۔۔۔ موڈ نہیں۔ وہ کیسے۔۔۔۔۔“ ایسے الفاظ یا پھر خالی ہنس دیتی۔ چھوٹی ہنسی، لمبی ہنسی، مہذب ہنسی۔ جس میں ہنسی نہ ہوتی، البتہ آواز کے زیر و بم میں جاذبیت ضرور ہوتی۔

سلمیٰ کے لئے اماں کی صحت یا بیماری اہم نہ تھے۔ اہم بات تو یہ تھی کہ اس کی روزمرہ بحال ہو جائے۔ ستارہ کو بھی اماں سے بڑا لگاؤ تھا۔

ستارہ نے اپنی تمام تر اہمیت کا انحصار ہر امتحان میں کلاس میں فرسٹ آنے پر رکھا ہوا تھا۔ اماں کی بیماری کی وجہ سے سارے گھر پر جو بوجھ پڑا ہوا تھا، وہ اس کی پڑھائی میں مغل ہو رہا تھا۔ اسے فکر لگ گیا تھا کہ کہیں رابعہ اس کی پوزیشن نہ ہتھیا لے۔

رابعہ وہ بد صورت بھدی لڑکی تھی جو رٹا لگا لگا کر ہر امتحان میں اس کے پیچھے پیچھے چڑیل کی طرح لگی ہوئی تھی اور ہر بار سیکنڈ آتی تھی۔ کہیں وہ چڑیل میری جگہ نہ لے لے۔ ستارہ کو صرف یہی ایک فکر لگا رہتا تھا۔ بے اللہ۔ اماں کی بیماری کیا مصیبت ہے۔ اس مصیبت سے کب جان چھوٹے گی۔ اسے اس بات پر غصہ آتا تھا کہ اماں ڈاکٹر کا علاج کیوں نہیں کراتی۔

ستارہ کی بات سچی تھی۔ عرصہ دراز سے اماں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ علاج نہیں کرائے گی۔ اسے ڈاکٹر پر اعتماد نہیں تھا۔ ”اب کیا حال ہے؟“ صائم کی بیوی سکینہ سمینہ نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔

صائم نے مایوسی میں سر ہلادیا۔

سمینہ چار پائی پر بیٹھ گئی۔ وہ حزن و ملال سے نچڑہی تھی۔

سمینہ اور آسیہ کے مابین خدا ترسی کے سوا کوئی تعلق نہ تھا۔ سمینہ ایک مذہبی عورت تھی۔ مذہب اس کے لئے صرف خوف خدا تھا۔ وہ بے چاری خود اس گھر میں اکیلی تھی۔ وہ خود ایلینز میں گھری ہوئی تھی۔ وہ کبھی کیا سکتی تھی۔

اگرچہ آسیہ اور سمینہ کے مابین ساس بہو کا رشتہ تھا لیکن وہ رشتہ ہمیشہ برائے نام رہا تھا۔ سارا قصور آسیہ کا تھا۔ اگر وہ حکم چلانا جانتی تو ساس کا مرتبہ حاصل کر لیتی۔ لیکن وہ توازل سے حکم بجالانا جانتی تھی۔ چوکی پر بیٹھ کر حکم چلانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے بیٹے

میں مسافر یا سیدان پر لٹکے ہوتے ہیں۔

”اوہ“ سمجھ چوٹکا۔ ”مجھے تو جانا ہے۔ دفتر میں فنکشن شروع ہو چکا ہوگا۔ ابو میں واپسی پر ڈاکٹر لے آؤں؟“ اس نے یوں کہا جیسے صرف ڈاکٹر لے آنے سے اماں سے تعلق استوار ہو جائے گا۔ سنیس آف گلٹ دور ہو جائے گا۔

”اماں سے پوچھ لو۔“ صائم نے کہا۔

”اماں! اماں جی“ سمیع نے آواز دی۔

اماں نے کوئی جواب نہ دیا۔

پھر سب گھوم کر اماں کے سرہانے کی طرف جا کھڑا ہوا۔ اس نے اماں کے منہ سے رضائی اتار دی۔

”اوہ“ وہ زیر لب چلایا۔ ”اماں تو۔۔۔۔۔۔ اماں تو۔۔۔۔۔۔“

”کیا کہا۔“ کئی ایک چیخیں گونجیں۔

”اماں گزر گئیں کیا؟“

”ہائے اللہ۔۔۔۔۔ اماں چلی گئیں۔۔۔۔۔“

بڑوس والے کہتے ہیں کہ صائم کے گھر سے چیخوں کی آوازیں بلند ہوں گیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں ”نہیں! چیخیں نہیں، وہ تو بگڑے ہوئے قہقہوں کی آوازیں تھیں۔“

میں نے وہ آوازیں نہیں سنیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں جیسے صائم کی ماں مری نہیں بلکہ صائم کے گھر سے منتقل ہو کر میری ماں بن کر میرے گھر آ بیٹھی ہے۔ جیسے یہ کہانی صائم کی نہیں بلکہ میری ماں کی ہے۔ شاید تمہاری ماں کی ہو۔ ہم سب کی ماؤں کی ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ گھر گھر بیٹھی ہے۔ اور اس کے ارد گرد ایلینز یوں ناچ رہے ہیں جیسے وحشی قربانی کرنے سے پہلے بلی کے ارد گرد ناچتے ہیں۔



وقار محل کا سایہ

وقار محل کی چھتیں گر چکی ہیں لیکن دیواریں جوں کی توں کھڑی ہیں۔ جنہیں توڑنے کے لئے بیسیوں جوان مزدور کئی ایک سال سے کدال چلانے میں مصروف ہیں۔

وقار محل نیو کالونی کے مرکز میں واقع ہے۔ نیو کالونی کے کسی حصے سے دیکھئے کھڑکی سے سر نکالنے، روشن دان سے جھانکنے، میسر سے نظر دوڑائیے۔ ہر صورت میں وقار محل سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ مضبوط ویران، بوجھل رعب دار، ڈراؤنا، سر بلند کھوکھلا، غظیم۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری نیو کالونی آسیب زدہ ہو اور وقار محل آسیب ہو۔ نو جوان دیکھتے ہیں تو دلوں میں غصہ ابھرتا ہے۔ نیو کالونی کے چہرے کا پھوڑا۔ رستی بستی کالونی میں آثار قدیمہ۔ چہرے پر نفرت سے بگڑ جاتے ہیں۔ ہٹاؤ اسے۔ لیکن وہ محل سے اپنی نگاہیں ہٹا نہیں سکتے۔

بچے دیکھتے ہیں تو حیرت سے پوچھتے ہیں۔ ”ڈیڈی! یہ کسی بلڈنگ ہے؟ بھدی! بے ڈھب! موٹی موٹی دیواریں! اونچی اونچی چھتیں! تنگ تنگ کھڑکیاں۔ اور ڈیڈی کیا یہ لوہے کی بنی ہے۔ اتنے سارے مزدوروں سے بھی نہیں ٹوٹ رہی۔“

بڑے بوڑھے محل کی طرف دیکھتے ہیں تو۔۔۔۔۔ لیکن بڑے بوڑھے تو اس طرف دیکھتے ہی نہیں۔ انہیں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو رہتے ہی محل میں ہیں چوری چھپے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کسی پر بھید کھل نہ جائے۔

کالج کے لڑکے جو اس کھوکھلے محل کے زیر سایہ مل کر جوان ہوئے ہیں، وقار محل کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اب تو خالی دیواریں رہ گئی ہیں۔ کچھ دنوں کی بات اور ہے۔ لیکن ان کے دلوں سے آواز ابھرتی ہے اور وہ تالیاں پیٹنے لگتے ہیں۔ قہقہے لگانے لگتے ہیں تاکہ وہ آواز ان میں دب کر رہ جائے۔ بہر حال نیو کالونی کا ہر نو جوان وقار محل سے ایک پراسرار لگاؤ محسوس کرتا ہے۔ اگرچہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ لگاؤ نہیں لاگ ہے۔ لیکن اسے پتہ نہیں ہے کہ لاگ تو لگاؤ کا ایک روپ ہے۔ ڈھکا چھپا شدت سے بھرا لگاؤ۔

وقار محل صدیوں سے وہاں کھڑا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب تعمیر ہوا تھا۔ جب سے لوگوں نے ہوش سنبھالا تھا، اسے وہیں کھڑے دیکھا تھا۔

پہلے تو لوگ وقار محل پر فخر کیا کرتے تھے۔ پھر نئی پود نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ پھر کسی منچلے نے بات اڑادی کہ محل کی دیواروں

میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ چھتیس بیٹھ رہی ہیں۔ وہ نیو کالونی کے لئے خطرہ ہے۔ اس پر کمیٹی والے آگئے۔ انہوں نے چاروں طرف سے محل کی ناکہ بندی کر دی۔ اور جگہ جگہ بورڈ لگا دیئے۔ ”خبردار۔۔۔۔۔ دور رہیے عمارت گرنے کا خطرہ ہے۔“ پھر بیسیوں مزدور کدال پکڑے آپہنچے اور محل کی چھتوں اور دیواروں کو توڑ توڑ کر گرانے لگے۔

پتہ نہیں بات کیا ہے کہ سالہا سال سے اتنے سارے لوگ کدال چلا رہے ہیں۔ اسے توڑنے میں لگے ہیں لیکن پھر بھی محل کا کچھ نہیں بگڑا۔ وہ جوں کا توں کھڑا ہے۔ پتہ وہ کس مصالحوے سے بنا ہے کہ اسے منہدم کرنا آسان نہیں۔ بہر حال سارا دن مزدور کدال چلاتے رہتے ہیں۔ نیو کالونی میں آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔ ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک۔

یہ ٹھک ٹھک جھکی کی رانوں میں گونجتی ہے۔ اس کی لرزش سے کوئی پوشیدہ کھلتا ہے۔ کوئی پراسرار گھڑی چلنے لگتی ہے۔ اس کی ٹپک ٹپک دل میں پہنچتی ہے۔ دل میں لگا ہوا ایمپلی فائر اسے سارے جسم میں اچھال دیتا ہے۔ ایک بھونچال آ جاتا ہے۔ چھاتیوں سے کچا دودھ رسنے لگتا ہے۔ ہونٹ لہس کی آرزو سے بوجھل ہو کر ٹپک جاتے ہیں۔ نیس تن جاتی ہیں اور سارا جسم یوں بجنے لگتا ہے جیسے سارنگی ہو۔ اس پر جی دیوانہ وار کھڑکی کی طرف بھاگتی ہے اور وقار محل کی طرف یوں دیکھنے لگتی ہے جیسے اس سے پوچھ رہی ہو اب میں کیا کروں؟

[illegible]

لیکن اس روز جب کہ کچھ بلکہ بہت کچھ ہو گیا تھا۔ یہاں تک ہو گیا تھا کہ جس کے اسے توقع نہ تھی۔ لیکن وہ خوشی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ النادہ ہاتھ مل رہی تھی کہ یہ کیا ہو گیا۔ پتہ نہیں اس روز جی کو کیا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پر غم تھیں۔ وہ حسرت آلود نگاہوں سے وقار محل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دوڑ کر وقار محل میں چا پناہ لے۔ اس روز جیسے جی پھر سے یاسمین بن گئی تھی۔

اگرچہ شعوری طور پر جی کو وقار محل سے سخت چڑتھی اور وہ اسے اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتی تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں وقار محل اس کے بنیادی جذبات کو مسلط تھا۔ ان جانے میں وہ اس کی زندگی پر یوں سایہ کئے ہوئے تھا جیسے بڑا بوڑھا درخت کسی گلاب کی جھاڑی پر سایہ کئے ہوئے ہو۔

جی وقار محل کے زیر سایہ پیدا ہوئی تھی۔ وہیں کھیل کھیل کر جوان ہوئی تھی۔ اس کی کوٹھی ایور گرین وقار محل کے عقب میں تھی۔ اس کی تمام کھڑکیاں محل کی طرف کھلتی تھیں۔ دونوں ٹیرسیس ادھر کو نکلی ہوئی تھیں۔ بچپن میں جب وہ یاسمین تھی تو وقار محل اس کے لئے جاذب نظر چیز تھی پھر جوں جوں وہ جوان ہوتی گئی وقار محل اسے بوسیدہ عمارت نظر آنے لگی جو نیو کالونی کے راستے کی رکاوٹ تھی۔ اس کے دل میں یہ گمان بڑھتا گیا کہ وقار محل نو جوانوں کی آزادی کچلنے کے لئے تعمیر ہوا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ گرتے ہوئے وقار محل کا سایہ اس دل کی گہرائیوں پر چھایا ہوا ہے اور اس کی زندگی کے ہر اہم واقعے میں وقار محل کا حصہ تھا۔

مثلاً جب اس میں جوانی کی اولیس بیداری جاگی تھی تو گرتے ہوئے وقار محل کی ٹھک ٹھک نے ہی تو اسے جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ ابھی جسمن تھی بھی نہیں بنی تھی۔ اگرچہ اس کی باجی عفت مدت سے عفت سے اف اور پھر اف سے افی بن چکی تھی۔ چونکہ اف بٹ کا امکان خارج ہو چکا تھا۔

ان دنوں باجی سارا سارا دن اپنے بیڈ پر اوندھے منہ پڑی رہتی تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔ افی باجی تو بیڈ پر ڈھیر ہونے والی نہ تھی۔ اس کی تو بوٹی بوٹی تھرتھرتھی۔ ابھی یہاں کھڑی ہے ابھی باغیچے میں جا پہنچی۔ لوہہ تو ٹیرس پر ٹہل رہی ہے۔ ہائیں وہ تو چلی بھی گئی۔ کسی گٹ ٹو گیدر میں۔ کسی فنکشن میں کسی پارٹی میں۔ ایک جگہ تک کت بیٹھنا افی باجی کا شیوہ نہ تھا۔ پھر پتہ نہیں ان دنوں اسے کیا ہو گیا تھا کہ پلنگ پر گٹھڑی بن کر پڑی رہتی تھی۔ جسمن سمجھتی تھی کہ افی باجی مس واسکوڈے گاما کی روح ہے۔ اسے خبر نہ تھی کہ واسکوڈے گامانے امریکہ دریافت کر لی ہے اور اب تھک ہار کر پڑ گئی ہے۔

ان دنوں می بار بار افی کے بیڈ روم کے دروازے سے چھپ چھپ کر جھانکتی اور حیرت سے باجی کی طرف دیکھتی رہتی۔ وہ باجی سے پوچھ نہیں سکتی تھی۔ پوچھنا الگ رہا، می تو باجی سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ کیسے کرتی بات بات کرتی تو باجی تنک کر کہتی۔ ”می ڈارلنگ آپ نہیں سمجھتیں۔ آپ نہ بولیں۔“ واقعی می نہیں سمجھتی تھی۔ کیسے سمجھتی وہ تو بے چاری سیدھی سادی امی تھی جسے حالات نے زبردستی می بنادیا تھا۔

جب فاطمہ بیگم کی شادی محمد عثمان سے ہوئی تھی تو وہ اسسٹنٹ تھے پھر حالات نے سرعت سے پلٹا کھایا اور وہ منیجر ہو گئے اور اب جنرل منیجر تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ محمد عثمان سے ایم اوٹمان ہو گئے تھے۔ لیکن فاطمہ بیگم فاطمہ بیگم ہی رہی تھی۔ وہ فاطمہ زیادہ تھی اور بیگم کم کم۔ تعلیم سرسری تھی۔ سوشل سٹینس کی بھاری بھر کم گھڑی سر پر آ پڑی تھی۔ پھر بھی جوں توں کر کے اس نے رہن سہن کی تبدیلی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا تھا۔ لیکن وہ اپنی شخصیت کو بیگم کا رنگ نہ دے سکے تھے۔

اس پر ایم اوٹمان اگر بیگم سے مایوس ہو گئے تھے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ پھر جو انہوں نے گھر سے ناطہ توڑ لیا اور کلب میں وقت بسر کرنے لگے تو یہ ایک قدرتی امر تھا۔ اس کے علاوہ کلب میں بہت سی بیگمات آتی تھیں جن پر چوکھا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس کے بعد فاطمہ بیگم گھر میں یوں کونے سے لگ گئی جیسے نیو کالونی کا رافنس کرو سو ہو۔ پھر لڑکیاں جوان ہوئیں تو انہوں نے اسے بالکل ہی بے زبان کر دیا۔

لڑکیوں نے زبردستی سے ممی بنا لیا۔ ممی کے لفظ سے فاطمہ کو بڑی چڑ تھی۔ کتنا نگا لفظ تھا۔ اس لفظ سے ننگے پنڈے کی بھڑاس آتی تھی لیکن وہ احتجاج نہیں کر سکتی تھی۔ جب اپنی پیٹ جائیاں بار بار کہیں ”ممی ڈارنگ“ آپ کو پتہ نہیں آپ نہ بولیں پلیز“ تو ماں کی زبان پر مہر نہ لگے تو کیا ہو۔ پہلے تو فاطمہ کو شک پڑنے لگا کہ شاید واقعی اسے پتہ نہیں پھر اسے یقین آ گیا کہ اسے پتہ نہیں۔ وہ نہیں جانتی۔ کبھی کبھار اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ جانے سمجھے۔ بولے یا نہ بولے پر کم از کم جان تو لے۔

ان دنوں اسی خواہش کے زیر اثر فاطمہ افعی کے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر کھڑی رہتی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ افعی اوندھے منہ بستر پر پڑی رہے۔ یوں پڑے رہے جیسے مصالحوں کے بنے ہوئے منے کے اعضاء کو جوڑنے والا دھاگا ٹوٹ گیا ہو۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ شاید فاطمہ کو بات سمجھ آ گئی۔ وہ دیوار وار بھاگی۔ غیر از معمول وہ سیدھی افعی کے ڈیڈی کے پاس پہنچی۔ پھر غیر از معمول میاں بیوی آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے۔ ان سرگوشیوں کے دوران میں میاں اہم اہم کرتے سنے گئے۔ اتنا اہم اہم کرنا تو انہوں نے مدت سے چھوڑ رکھا تھا۔ ان کے اہم اہم کرنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے گھر میں پھر سے محمد عثمان آ گیا ہو۔

کچھ دیر کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا، محمد عثمان باہر نکلے۔ ان کے سر پر ٹوپی تھی اور ہاتھ میں چھڑی۔ پیچھے پیچھے فاطمہ تھی۔ وہ بڑے وقار سے قدم اٹھاتے ہوئے سیزھیاں چڑھنے لگی۔ افعی کے بیڈ روم میں داخل ہو کر انہوں نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

جسمن یہ سب تفصیلات کافی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔ سے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ڈیڈی اور اہم اہم کر کے بات

کریں۔ پھر انہوں نے ٹوپی کیوں پہن رکھی تھی اور ان کے ہاتھ میں چھڑی کیوں تھی۔

پھر باجی کے کمرے سے محمد عثمان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان کی آواز میں بڑا تحکم تھا یا شاید منت تھی، یا شاید دونوں ملے جلے تھے۔ منت بھرا تحکم یا تحکم بھری منت۔

پھر باجی کی غصے بھری آواز سارے گھر میں گونجی۔ ”بچہ میرا ہے، میں اسے اپناؤں گی۔ دیکھوں گی مجھے کون روکتا ہے۔“
جسمن سوچنے لگی ”یا اللہ باجی کس بچے کی بات کر رہی ہیں۔ کمرے میں تو صرف باجی، ممی اور ڈیڈی تھے۔ بچہ کہاں تھا؟“
پھر اوپر کوئی کسی کو زد و کوب کر رہا تھا۔ چھڑی چلنے کی آواز آ رہی تھیں۔ ساتھ ہی باجی چیخ رہی تھی۔ رورہی تھی۔ کراہ رہی تھی۔
ہئے بچاری باجی۔۔۔۔۔۔ جسمن کے دل میں ڈیڈی کے خلاف غصہ کھولنے لگا۔

پھر پٹاخ سے دروازہ کھلا اور ڈیڈی امی سیزھیاں اتر رہے تھے۔ لیکن وہ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں تھے۔۔۔۔۔۔ افوہ
۔۔۔۔۔۔ ڈیڈی کا چہرہ لہو لہان ہو رہا تھا۔ ارے ڈیڈی نے شک سے پینا تو باجی کو تھا پھر ڈیڈی کا اپنا چہرہ کیوں سو جا ہوا تھا۔ جگہ جگہ
سے خون کیوں رس رہا تھا اور وہ اس قدر کھوئے ہوئے کیوں تھے کہ کمرے میں داخل ہونے کی بجائے سیدھے کوٹھی سے باہر نکل گئے
تھے۔ جسمن ان کے پیچھے پیچھے گئی تھی۔

دھڑا دڑا رام۔۔۔۔۔۔

اک زبردست دھماکہ ہوا۔

چاروں طرف سے شوراٹھا۔

”وقار محل کی چھت گر گئی۔ وقار محل کی چھت گر گئی۔“

گرد و غبار کا ایک بادل اٹھا اور اس نے نیو کالونی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اسی شام کو باجی ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

ہاں جسمن کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔

اس حادثہ کے بعد وہ روز کھڑکی میں کھڑی سوچتی رہی کہ باجی گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی۔ اور اس روز وہ کس بچے کی بات کر رہی
تھی۔ اور ڈیڈی کا منہ لہو لہان کیوں تھا اور وقار محل کی چھت کیوں گری تھی۔ وہ وقار محل کی طرف دیکھتی رہتی اور سوچتی رہتی۔ دیکھتی اور
سوچتی رہتی۔ غالباً وہ محسوس کرتی تھی کہ وقار محل اس راز سے واقف تھا۔

پھر ایک روز جب وہ کھڑکی میں کھڑی تھی تو کسی نے چلا کر کہا۔ ”ہائی“ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ اگلے دن پھر ”ہائی“ کی آواز آئی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ پھر چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ تیسرے دن وہ ”ہائی“ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ دو چھوٹی چھوٹی مونچھیں نیچے کولنگ رہی تھیں جس میں سے چٹے سفید دانت چمک رہے تھے۔ اوپر دو چندھیائی سی آنکھوں میں سے گلہبڑھائی چاند ماری کر رہی تھی اور اس کے اوپر بال بال ہی بال بال۔

پہلی مرتبہ ہائی کو دیکھ کر وہ سخت گھبرا گئی۔ اس کا جی چاہا کہ شرما کر منہ موڑ لے جس طرح ماہ رو شرما کر منہ موڑ لیا کرتی تھی۔ ماہ رو گوری چٹی پنٹھانی تھی جو اپنے باپ کے ساتھ وقار محل سے ملحقہ آؤٹ ہاؤس میں رہتی تھی۔ اس کا باپ وقار محل کا چوکیدار تھا اور اب محل کے ملے کی رکھوالی کیا کرتا تھا۔ ماں مرچکی تھی۔ صرف ایک چھوٹا بھائی تھا۔ سارا دن ماہ رو روٹی ہانڈی میں مصروف رہتی۔ دو پہر کو فراغت ہوتی تو باہر دھوپ میں آ بیٹھتی۔ ماہ رو اتنی گوری تھی اتنی گوری تھی کہ ہر راہرو اسے دیکھ کر رک جاتا۔ جب وہ محسوس کرتی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو اس کا سارا چہرہ گلابی ہو جاتا۔ جیسے کسی نے رنگ کی پچکاری چلا دی ہو۔ پتہ نہیں، حیا اس قدر گلابی کیوں ہوتی ہے۔ جسم نے کئی مرتبہ ماہ رو کو شرماتے دیکھا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی حیا کے غارے کو اپنالے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ ماہ رو کی طرح گنوار نہ تھی۔ اور ماڈرن کو یہ زیب نہیں دیتا کہ شرما کر منہ موڑ لے۔ الٹا اسے تو ہائی کے جواب میں ہائی کہنا چاہیے۔

جب پہلی مرتبہ ہائی جسم کے سامنے آئی تو اس نے بڑی جرات سے کام لیا اور شرما کر منہ موڑا۔ لیکن اس میں اتنی جرات پیدا نہ ہو سکی کہ جواب میں ہائی کہتی۔

دراصل جسم بڑی مخلص، سچی اور شرمیلی لڑکی تھی۔ جس طرح ساری ماڈرن گرلز ہوتی ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس کے دل میں کئی ایک خوش فہمیاں رچی بسی ہوئی تھیں۔ جس طرح ماڈرن گرلز کے دلوں میں خوش فہمیاں رچی بسی ہوتی ہیں۔ مثلاً اسے کچھ پتہ نہیں تھا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ اسے سب پتہ ہے۔ چونکہ ماڈرن گرل کو سب پتہ ہونا چاہیے۔ چاہنے اور ہے میں جو فرق ہے اسے اس کا احساس نہ تھا۔ شعور نہ تھا۔

اس کا دل بہت سے بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا۔ مگر وہ سمجھتی تھی کہ وہ آزاد ہے۔ چونکہ ماڈرن گرل پر لازم ہے کہ وہ آزاد ہے۔ بغضوں سے آزاد لگاؤ سے آزاد۔ رکی قید و بند سے آزاد۔

اگرچہ ذہنی طور پر اسے رجعت پسندوں کے خلاف زبردست چڑتھی جیسے کہ ماڈرن گرل کو ہونی چاہیے لیکن دلی طور پر اسے اپنے

ماں باپ سے لگاؤ تھا۔ اگرچہ اسے اس کا شعور نہ تھا۔ شعور کیسے ہوتا۔ جب بھی ایسی صورت حال پیدا ہوتی کہ شعور ہونے کا خطرہ لاحق ہو تو وہ اپنی توجہ کسی دوسری بات پر مبذول کر دیتی۔ چونکہ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسے یہ شبہ نہ پڑ جائے کہ اس کے برتاؤ کی کوئی تفصیل ایسی بھی ہے جو ماڈرن گرل کے شایان شان نہیں۔

ان دنوں اسے یہی ایک فکر دامن گیر تھا کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جو ماڈرن گرل کی شان کے منافی ہو۔ اسے ہائی نے اسے خاصا درہم برہم کر دیا تھا۔ لیکن وہ یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی کہ وہ درہم برہم ہے۔ اتنی چھوٹی سی بات ماڈرن گرل کو بھلا کیسے درہم برہم کر سکتی ہے۔ لہذا وہ درہم برہم نہیں تھی بالکل نہیں تھی۔

پہلی مرتبہ تو اس ہائی نے وقار محل سے سر نکالا تھا۔ پھر وہ جگہ جگہ سے سر نکالنے لگی۔ جب وہ کالج بس میں سوار ہوتی تو وہ بس سٹینڈ سے سر نکالتی۔ جب جسمن کالج کی گراؤنڈ میں ٹہل لگاتی تو وہ پردہ دیوار سے جھانکتی۔ جب وہ مارکیٹ جاتی تو وہ اس کا پیچھا کرتی۔

ہاں صورت حال بہت ہی خراب ہوئی جا رہی تھی۔ پھر اس کے اپنے جسم نے بغاوت کر دی۔ ان دنوں وقار محل میں مزدوروں نے دیواریں توڑنے کا کام شروع کر رکھا تھا۔ ان کی ٹھک ٹھک ساری نیوکالونی میں گونجتی رہتی تھی۔ ایک دن جب جسم کی طبیعت ناساز تھی اور وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی اس ہائی کے متعلق سوچ رہی تھی تو دفعتاً وہ حادثہ عمل میں آ گیا۔

ساری شرارت مزدوروں کی اس ٹھک ٹھک کی تھی۔ روز تو وہ ٹھک ٹھک جسمن کے کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر گونجتی تھی اس روز نہ جانے کیا ہوا۔ وہ ٹھک ٹھک سیدھی جسمن کی رانوں سے آنکرائی۔ اور اس کے جسم میں گونجنے لگی۔

جسمن کے جسم میں ایک عجیب سے لرزش جاگی۔ کسی پوشیدہ سپرنگ میں حرکت ہوئی۔ ایک تناؤ سا اٹھا اس نے دل پر دباؤ ڈالا۔ دل کے ایمپلی فائر نے اسے اچھالا۔ سارے جسم میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ نہیں تن گئیں۔ چھاتیوں سے کچا دودھ رسنے لگا۔ ہونٹ لمس کی آرزو سے بے حال ہو کر لٹک گئے۔ سارا جسم سارنگی کی طرح بچنے لگا۔

اس لمحے میں اسے سب پتہ چل گیا۔ سب کچھ کہ باجی گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی کہ وہ کس بچے کی بات کر رہی تھی کہ بچہ کہاں تھا۔ سب کچھ۔ اس روز وہ جسمن سے جہی بن گئی تھی۔ اس کے دل میں شدت سے آرزو پیدا ہوئی۔ ابھی اسی وقت۔ فٹافٹ۔ جلدی کچھ ہو جائے اور واقعی کچھ ہو گیا۔

اسی رات جہی کے بیڈروم کا وہ دروازہ آہستہ سے کھلا جو کوٹھی کے احاطے میں کھلتا تھا اور زیرِ لبی آواز آئی۔۔۔۔۔ ”ہائی“
جہی تڑپ کر مری۔

دولکی ہوئی مونچھوں میں چٹے سفید دانت چمک رہے تھے۔

اگلے روز گینی لنگتی ہوئی مونچھوں میں چٹے سفید دانت نکالے چندھیائی ہوئی مگر چڑھ جانے والی سرخ چیونٹیوں جیسی آنکھیں لئے سر پر کالے بالوں کا ٹوکرا اٹھائے صدر دروازے کے راستے سے ایور گرین میں داخل ہوا۔

جب گینی پیدا ہوا تھا تو وہ لڑکا تھا۔ اس کی پیدائش پر ماں باپ نے بڑی خوشیاں منائی تھیں۔ انہوں نے اس کا نام غنی رکھا تھا۔ لیکن جب وہ نوجوانی اور دور جدید میں داخل ہوا تو بہت سی تبدیلیاں عمل میں آ گئیں۔ بال بڑھ کر ٹوکرا بن گئے۔ مونچھیں لنگ گئیں۔ منہ پر پاؤڈر سرفخی کی تہہ چڑھ گئی۔ رنگدار قمیض، چمکیلی صدیریاں، منکوں کی مالا میں اور جانے کیا کیا۔ یوں وہ غنی سے گینی بن گیا تھا۔

ایور گرین میں گینی کی آمد سے کوئی ہلچل پیدا نہ ہوئی۔ پہلے ہی اس سلسلے میں افعی نے بڑی کارکردگی دکھائی تھی۔ اس کے بوائے فرینڈز ایور گرین میں اکثر آیا کرتے تھے اور وہ بڑے شوق سے ان کا ڈیڈی سے تعارف کرایا کرتی تھی۔ ممی سے نہیں چونکہ ممی ڈارلنگ تو سمجھتی نہیں تھی۔ اور اسے سمجھانا بہت مشکل تھا۔

فاطمہ نے گینی کو دیکھا تو سینہ تھام کر رہ گئی۔ افعی کے متعلقہ پرانے زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ اس کے دل میں از سر نو خدشات نے سراٹھایا۔ لیکن وہ بولی نہیں۔ کیسے بولتی۔ رہے ڈیڈی۔ ڈیڈی کی سب سے مشکل یہ تھی کہ وہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ انہیں ایم اوٹمان بن کر جینا ہے یا محمد عثمان بن کر۔

ان کی تعلیم، سٹیٹس اور پوزیشن اس بات کے مقتضی تھے کہ وہ ایم اوٹمان بن کر زندگی گزاریں۔ اسی وجہ سے خاصی محنت کر کے وہ ایم اوٹمان بنے تھے لیکن کئی بار بیٹھے بٹھائے محمد عثمان کے دل میں یوں گھس آتا جیسے ہاتھی چینی کی دکان میں آگھسا ہو۔

محمد عثمان بڑا ضدی تھا۔ غصیل تھا۔ منہ پھٹ تھا۔ کڑ تھا۔ ایم اوٹمان اسے سمجھاتے۔ دلیلیں دیتے۔ بھی زمانہ دیکھو۔ زمانے کا رنگ دیکھو۔ آج کے تقاضوں پر غور کرو۔ اب یہ پران باتیں نہیں چلیں گی لیکن محمد عثمان اپنی بات پر اڑا رہتا۔ اس لحاظ سے ایم اوٹمان بھی گویا ماڈرن گرل تھے۔ ان کی شخصیت کی اوپر لی سطح پر ایم اوٹمان کی جھال تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں محمد عثمان براجمان تھا۔

جب گینی کا تعارف ایم اوٹمان سے کرایا گیا تو محمد عثمان نے ان کے کان میں کہا۔ ”دھیان کرنا“ کہیں پھر سے تمہیں سر پر ٹوپی رکھ باتھ میں چھڑی پکڑ بیٹی کے کمرے میں جانا نہ پڑے۔“ ایم اوٹمان کو اس بات پر غصہ آیا۔ ”ہٹ جاؤ“ اس نے چلا کر کہا ”میرا دل پراگندہ نہ کرو۔“

پھر وہ گینی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آیا کرو، مسٹر گینی جب بھی فرصت ملے آ جایا کرو۔“

گیمینی ایور گرین میں کبھی صدر دروازے سے داخل نہ ہوتا۔ اس کے لئے تو صرف عقبی دروازہ ہی موزوں تھا۔ لیکن جی کو یہ گوارا نہیں تھا۔ وہ ایک ماڈرن گرل تھی اور ماڈرن گرل ”سلائی“ تعلق رکھنے سے نفرت کرتی تھی۔ اس سے اس کی آزاد طبیعت پر حرف آتا تھا۔ اس کی انا مجروح ہوتی ہے۔ ڈھکے چھپے تعلق تو وہ پیدا کرتی ہیں جن پر بندشیں عائد کی جاتی ہیں۔ جو پابندیوں میں جیتی ہیں۔ جی کو اپنا جیون ساتھی بھی تو تلاش کرنا تھی۔ جی کو اس بات کا علم نہ تھا کہ گیمینی نے جیون ساتھی بننے یا تلاش کرنے کے متعلق نہیں سوچا۔ گیمینی تو گڈ ٹائم اور ایڈ ونچر کا متلاشی تھا۔ جب وہ جی کے مجبور کرنے پر ایور گرین میں داخل ہوا تو ایڈ ونچر کا عنصر ہی ختم ہو گیا۔ ایڈ ونچر تو ہمیشہ عقبی دروازے سے متعلق ہوتا تھا۔ باقی رہا گڈ ٹائم۔ تو آپ جانتے ہیں گڈ ٹائم میں تنوع کا ہونا ضروری ہے۔ ایک ہی سر دبائے رکھنے سے نفع نہیں بنتا۔

اس لئے جوں جوں دن گزرتے گئے۔ ٹائم میں گڈ کا عنصر بتدریج کم ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ صرف ٹائم ہی ٹائم رہ گیا اور اس خالی خولی ٹائم سے اکتا کر گیمینی ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا۔

گیمینی کی روپوشی پر جی ساری کی ساری الٹ پلٹ ہو کر رہ گئی۔ چونکہ وہ گڈ ٹائم کی قائل نہ تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اسے پتہ نہ تھا کہ ان حالات میں ماڈرن گرل کو کیا کرنا چاہیے۔ لہذا وہ بکی بکی اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ پھر وقار محل کی ٹھک ٹھک نے اسے گھیر لیا۔ وہ ٹھک ٹھک اس کے جسم میں دھنس گئی۔ اندر جا کر تالیاں بجانے لگی۔ سے اکسانے لگی۔ اٹھو کچھ کرو۔ اٹھو کچھ کرو۔ اٹھو کرو۔ ٹھک ٹھک۔ اٹھو کرو۔ ٹھک ٹھک۔

ماڈرن گرل ہونے کے باوجود جی کو جسم کے تقاضوں کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ جب وہ گیمینی سے ملا کرتی تھی تو اسے یہ احساس نہ تھا کہ وہ جسم کا تقاضا پورا کر رہی ہے۔ اس نے تو ان جانے میں گیمینی کو جیون ساتھی بنالیا تھا۔ اسے گیمینی سے محبت ہو چکی تھی۔ جب گیمینی چلا گیا تو بات ہی ختم ہو گئی۔ پھر محل کی کھٹ کھٹ اس کی رانوں میں کیوں گونجتی تھی۔ گھڑی کیوں چلتی تھی۔ جی تو وہ پریشان تھی۔ کئی ایک دن وہ پریشان رہی۔

پھر ان کے گھر میں حسنی آ گیا اور مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔

حسنی ان کا بوائے سرونٹ تھا۔ چھٹپٹے ہی سے وہ کوشیوں میں کام کرتا رہا تھا۔ وہیں جوان ہوا تھا۔ ماڈرن بیگمات کے انداز دیکھ دیکھ کر وہ وقت سے پہلے جوان ہو گیا تھا۔ حسنی خاصا پٹو ڈیٹ تھا۔ کلین شیو سارٹ لک، لمبے بال۔ جی نے حسنی کی آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

نوکر تو گھر میں آتے جاتے ہی رہتے تھے۔ کبھی خانساں چلا گیا۔ کبھی بوائے سرونٹ آ گیا۔ گیمینی کی روپوشی کے بعد ان دنوں جی

کی طبیعت نا سازی رہتی تھی۔ اس روز اس نے چائے کمرے میں منگوائی۔

حسی پیالی بنا کر کمرے میں لے گیا۔ جب وہ چئی کو پیالی دینے کے لئے جھکا تو اتفاقاً چئی نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ حسی کے کلین شیو چہرے پر دو مونچھیں ابھر آئیں۔ وہ لٹکنے لگیں۔ گھبراہٹ میں چئی کے منہ سے نہ جانے کیا نکلا۔ حسی اسے سمجھ نہ سکا۔ ”جی؟“ چئی کو ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے ”ہائی“ کہا ہو۔ اس کا سر سرہانے پر گر پڑا۔ حسی کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی۔ لیکن چائے تو بستر پر گری تھی۔ چئی کیوں شرابور ہو گئی تھی۔

پھر یہ مشکل روز کی مشکل بن گئی۔

جب بھی حسی چئی کے کمرے کا دروازہ کھول کر آہستہ سے کہتا ”جی“ تو اسے محسوس ہوتا جیسے کسی نے ”ہائی“ کہا ہو۔ وہ چونک کر مڑ کر دیکھتی۔ اس وقت حسی کے کلین شیو چہرے پر مونچھیں لٹک جاتیں اور چٹے سفید دانت چمکتے۔ صورت حال یہاں تک آ پہنچی کہ چئی حسی سے ڈرنے لگی۔

اول تو چئی اپنے آپ کو بھی تسلیم نہیں کرتی تھی کہ وہ حسی سے ڈرتی ہے۔ اسے علم نہ تھا کہ وہ خود سے ڈر رہی ہے۔ حسی کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ ڈرتی ہے۔ حسی کو ٹھیکوں میں کام کرتے کرتے جوان ہوا تھا۔ وہ ماڈرن گرل سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ انہیں سمجھتا نہیں تھا لیکن جانتا تھا اور سمجھے بغیر جاننا جانے بغیر سمجھنے سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ بہر حال حسی کو پتہ تھا کہ جب مس صاحبہ ڈرنے لگے تو وہ ڈر صرف سٹینس کا ڈر ہوتا ہے۔ اور سٹینس کا ڈر ایسی بیل ہوتی ہے جس کی جڑ نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ انتظار کرتا رہا۔ حسی بار بار بہانے بہانے چئی کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولتا اور پھر مدھم مدھم مگر پرلے آواز میں کہتا ”جی۔۔۔۔۔“ آپ نے بلا یا مس صاحبہ۔“

ایک روز جب چئی آئینے کے سامنے کھڑی تھی تو حسی نے وہی حرکت دہرائی۔ چئی گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ اس کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ گری۔ دو مضبوط ہانہوں نے اسے سنبھال لیا۔ چئی نے اوپر دیکھا۔ دو لٹکی ہوئی مونچھوں میں چٹے سفید دانت چمک رہے تھے۔ چئی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس ڈر کے مارے کہ کہیں مونچھیں اڑ نہ جائیں۔ نیچے سے کلین شیو چہرہ نہ نکل آئے۔ پھر۔۔۔۔۔ پھر اسے یاد نہیں۔ ٹھک ٹھک ٹھک۔۔۔۔۔ وقار محل کی دیواریں ٹوٹ رہی تھیں۔ سنہرا گردوغبار اڑ رہا تھا۔

اگرچہ چئی نے اپنی عزت کا تحفظ کرنے کے لئے کلین شیو چہرے پر مونچھیں لگائی تھیں۔ اور یوں اپنے ذہن کو مطمئن کر لیا تھا لیکن جسم کو وہ کیسے سمجھاتی۔ جسم تو ایک بے سمجھ کہہ دینے والا دھقان ہے۔ وہ ذہن کی سیاست دانیوں کو نہیں سمجھتا۔ جھوٹے رکھ رکھاؤ کی ہیرا پھیریوں کو نہیں جانتا۔ عذاب اور ثواب کے فلسفے کو نہیں مانتا۔ وہ قدیم اور جدید کے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا۔ جسم غلیظ سہی لیکن مکار

نہیں۔ وہ صاف بات کرتا ہے۔ دو ٹوک بات۔ سیدھی بات۔

جسم نے جی کے کان میں بات کہہ دی کہ تھرل صرف گینی سے ہی وابستہ نہیں۔ مونچھیں لگانے کے تکلف کے بغیر بھی تھرل حاصل ہو سکتی ہے۔ جسم کی یہ زیر لب جی کو بہت ناگوار گزری۔

اگلی صبح جب دھند لکا دور ہوا اور سٹیٹس کی دنیا پھر سے آباد ہوئی تو جی کی انا کو بڑا صدمہ ہوا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ یہ کیسے ہو گیا۔ ایک معمولی نوکر۔

سارادن وہ اپنی نظر میں گرتی رہی۔ گرتی ہی چلی گئی۔ سارادن وہ کوشش کرتی رہی کہ اپنے آپ کو سنبھالے۔ لیکن اس روز گویا یاسمین اس کے دل میں آگھسی تھی۔ جی اور یاسمین برسرِ تکرار تھیں۔

جی بار بار کہتی ”چلو ہو گیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ اتنی چھوٹی سی بات پلے نہ باندھو۔“

یاسمین کہتی۔ ”اوپہوں بات پلے باندھی نہیں جاتی، وہ تو بن پوچھے بن سوچے سمجھے آپ ہی آپ پلے باندھ جاتی ہے۔“

جی کہتی ”دل میلانہ کرو تم تو ایک ماڈرن گرل ہو جس تو ایک ذاتی معاملہ ہے اسے روگ نہ بناؤ۔“

یاسمین کہتی ”تم ماڈرن گرل نہیں ہو۔ کوئی بھی ماڈرن گرل نہیں ہے۔ سبھی ماڈرن گرل بننا چاہتی ہیں۔ چاہنے اور ہونے میں بڑا فرق ہے۔“

اس روز سارادن جی اور یاسمین میں کشمکش ہوتی رہی۔ سارادن اس کے دل کی ہنڈیا میں جی اور یاسمین کی کھجڑی پکتی رہی۔

جی اور یاسمین کے جھگڑے کو سن کر اس کے کان پک گئے۔ وہ محسوس کرتی تھی جیسے وہ ان دونوں سے الگ تھلگ ہو۔

دفعتاً اس کے ذہن میں خیال ابھرا۔ پھر میں کون ہوں؟ کیا میں یاسمین ہوں؟ نہیں میں یاسمین نہیں۔ کیا میں جی ہوں؟ نہیں میں

جی بھی نہیں۔ تو پھر میں کون ہوں؟

صرف میں ہی نہیں ڈیڈی بھی تو ہیں۔ کیا ڈیڈی محمد عثمان ہیں؟ نہیں۔ کیا وہ ایم اوٹمان ہیں؟ نہیں۔ تو پھر ڈیڈی کون ہیں؟

اس گھر میں صرف ایک فرد می تھیں جو فاطمہ بیگم تھیں۔ خالی فاطمہ بیگم۔ جنہیں سب می کہتے تھے۔ نہ جانے کب سے کہہ رہے

تھے۔ جنہیں برسوں سے می بنانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ لیکن وہ می تھیں اور می ہی رہی تھیں۔ گھر میں صرف وہی تھیں جنہیں علم

تھا کہ وہ کون ہیں۔

میں کون ہوں۔ یہ ایک بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔ پندرہ برس تک وہ سمجھتی رہی تھی کہ وہ یاسمین ہے۔ دو سال تک وہ سمجھتی رہی تھی کہ جسم

ہے اور گزشتہ چار سال سے وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ جی ہے لیکن آج وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی کہ میں کون ہوں۔ آج اس کے دل

سمے کا بندھن

آپنی کہا کرتی تھی۔۔۔۔۔۔ ”سنہرے“ سے سے کی بات ہوتی ہے۔ ہر سے کا اپنا رنگ ہوتا ہے، اپنا اثر ہوتا ہے۔ اپنے سے پہچان۔ سنہرے اپنے سے سے باہر نہ نکل۔ جو نکلی تو بھٹک جائے گی۔“

اب سمجھ میں آئی، آپنی کی بات۔ جب سمجھ لیتی تو رستے سے نہ بھٹکتی۔ آلنے سے نہ گرتی۔ سمجھ تو گئی پر کتنی قیمت دینی پڑی سمجھنے کی۔ آپ مجھے سنہرے کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ کہتی تھی ”تیرے پنڈے کی جھال سنہری ہے۔ جب رس آئے گا تو سونا بن جائے گی۔ کٹھالی میں یڑے رہنا۔ پھر یہ جھال کپڑوں سے نکل نکل کر جھانکے گی۔“

پتا نہیں میرا نام کیا تھا۔ پتا نہیں میں کس کی تھی۔ کہاں سی آئی تھی۔ کوئی لایا تھا۔ بالین ہی میں آپنی کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ اسی کی گود میں پلی۔ اسی کی سر تال بھری بیٹھک کے جھولنے میں جھول جھول کر جوان ہوئی۔ پھر سنہرا اٹلڈ آیا چھپائے نہ چھپتا۔ آپنی بولی ”نہ دھیئے“ چھپانہ جو چھپائے نہ چھپاے کیا چھپانا۔“

کبھی کھڑکی سے جھانکتی تو آپنی ٹوکتی۔ ”یہ کیا کر رہی ہے بیٹی؟“ سیانے کہتے ہیں جس کا کام اسی کو سانجھے۔ تیرا کام دیکھنا نہیں، دکھنا ہے۔ تو نظرنہ بن، منظر بن اور جو دیکھے بھی تو دیکھنے کا گھونگھٹ نکال کر اس کی اوٹ سے دیکھ۔ پھر سے دیکھ۔ سنہرے ابھی تو شام ہے۔ یہ سے تو ادا سی کا سے ہے۔ دکھ کا سے ہے۔ شام بھی گھنٹا نہ آئے۔“ آپنی گنگنانے لگی ”یاد ہے نایہ بول؟ شام تو نہ آنے کا سے ہے۔ تیرا آنے کا سے ہے۔ پگلی ذرا رک جا۔ اندھیرا گاڑھا ہونے دے۔ پھر تیرا سی سے ہوگا۔ پچھلے پہر تک۔“

ایک دن آپنی کاجی اچھانہ تھا۔ مجھے بلایا، گئی۔ لیٹی ہوئی تھی۔ سر ہانے تپائی پرسوڈے کی بوتل دھری تھی۔ ساتھ نمک دانی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سوڈے کی بوتل کے گلے میں شیشے کا گولا پھنسا ہوتا تھا۔ ٹھا کر کے کھلتا تھا۔

بولی ”سنہرے! بوتل کھول۔ گلاس میں ڈال۔ چنگی بھر نمک گھول کر مجھے پلا دے۔“ میں نے نمک ڈالا تو جھاگ اٹھا۔ بلبلے ہی بلبلے۔ آپنی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی ”دیکھ لڑکی! یہ ہمارا سہ ہے۔ ہمارا سہ وہ ہے جب جھاگ اٹھے۔ ہم میں نہیں دو بے میں اٹھے۔ دو بے میں جھاگ اٹھنا یہی ہمارا کام ہے۔ خود شانت، دو جا بلبلے ہی بلبلے۔ جب تک جھاگ اٹھتا رہے ہمارا سہ۔ جب کدو جاشانت ہو جائے۔ سمجھ لے ہمارا سہ بیت گیا اور جب سہ بیت جائے تو دھیرج پاؤں دھرتا ٹھک نہ کرنا۔ ٹھک کا سہ گیا۔ چمک نہ مارنا۔ چمک

کا سے گیا۔ پائل نہ جھٹکارنا۔ پائل جھٹکار بیرن بھئی۔“

پھر وہ لیٹ گئی۔ بولی ”سنہرے“ میری باتیں پھینک نہ دینا۔ دل میں رکھنا۔ یہ بھتیر کی باتیں ہیں۔ اوپر کی نہیں۔ سنی سنائی نہیں۔ پڑھی پڑھائی نہیں۔ وہ سب تھلکے ہوتی ہیں۔ بادام نہیں ہوتیں۔ جان لے بیٹی بات وہ جو بھتیر کی ہو۔ گری ہو۔ چھلکانہ ہو۔ جو بیتی ہو جگ بیتی نہیں۔ آپ بیتی ہو۔ ہڈ بیتی۔ باقی سب جھوٹ۔ دکھلاوا۔ بہلاوا۔“

آج مجھے باتیں یاد آ رہی ہیں۔ بیتی باتیں۔ سری باتیں۔ سانپ گزر گئے۔ لکیریں رہ گئیں۔ لکیریں ہی لکیریں۔ سانپ تو صرف ڈراتے ہیں۔ پھٹکارتے ہیں۔ لکیریں کاٹتی ہیں۔ ڈستی ہیں۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لکیروں نے مجھے چھلنی کر رکھا ہے۔ چلتی ہیں چلے جاتی ہیں۔ جیسے دھار چلتی ہے۔ ایک ختم ہوتی ہے دو جی شروع ہو جاتی ہے۔

آپی کی بیٹھک میں ہم تین تھیں، پیلی روپی اور میں۔ پیلی بڑی روپیہ منجھلی اور میں چھوٹی۔ پیلی میں بڑی آن تھی پر مان نہ تھا۔ اس آن میں چھب تھی۔ سندر تا بھرا ٹھہراؤ تھا۔ یوں رعب سے بھری رہتی تھی جیسے نیار رس سے بھری رہتی ہے۔ گردن اٹھی رہتی مورتی سماں۔

روپہ سری سر تھی۔ شدھ سرتاروں سے بنی تھی۔ اس کے بند بند میں تار لگے تھے۔ سمرتیاں سمرتیاں اور وہ گونجتے مدھم میں گونجتے اور پھر سننے والوں کے دلوں کو جھلا دیتے۔ تجبی میں تھی۔ آپی کہتی تھی ”سنہرے“ تجھ میں دکھ کی بھیگ ہے تو بھگو دیتی ہے خود بھی ڈوب جاتی ہے دو بے کو بھی ڈوب دیتی ہے۔ پگلی دو بے کو ڈوبو یا کر خود نہ ڈوبا کر۔ مجھے تجھ سے ڈراتا ہے سنہرے۔ کسی دن تو ہم سب کو نہ لے ڈوبے۔“

آپی کی بیٹھک کوئی عام بیٹھک نہ تھی کہ جس کا جی چاہا، منہ اٹھایا اور چلا آیا۔ بیٹھک پر دھن دولت کا زور تو چلتا ہی ہے۔ وہ تو چلے گا ہی ہر بیٹھک پر۔ پر آپی نے برتاؤ کا ایسا رنگ چلا رکھا تھا کہ خالی دھن دولت کا زور نہ چلتا تھا۔ نو دولہیئے آتے تھے پر ایسے بد مزہ ہو کر جاتے تھے کہ پھر رخ نہ کرتے۔ آپی کی بیٹھک میں نگاہیں نہیں چلتی تھیں۔ اس نے ہمیں سمجھا رکھا تھا کہ لوگ نگاہوں پر اچھالیں گے تو پڑے اچھالیں۔ لڑکیوں نہ اچھلنا، جو نگاہوں پر اچھل جاتی ہیں، وہ منہ کے بل گرتی ہیں اور جو گر گئی وہ سمجھ لو، نظروں سے گر گئی پھر نہ اپنے جوگی رہی نہ دوسری جوگی۔“

آپی کی بیٹھک میں جسم نہیں چلتے تھے، آواز چلتی تھی۔ دل دھڑکتے تھے۔ وہاں ملاپ کا رنگ نہ ہوتا تھا۔ رنگ رلیاں نہیں ہوتی تھیں۔ نہ تماشا ہوتا نہ تماش بین۔

مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب وہاں ٹھا کر کی بیٹھک لگتی تھی۔ دو مہینے میں ایک بار ضرور لگتی تھی۔ ٹھا کر کی بیٹھک لگتی تو کوئی دو جا نہیں آ سکتا تھا۔ صرف ٹھا کر کے سٹکی ساتھی۔

ٹھا کر بھی تو عجیب تھا۔ اوپر سے دیکھو تو ریچھ۔ طاقت سے بھرا ہوا اور جھانکو تو بچہ۔ نرم نرم گرم گرم۔ ویسے تھا آن بھرا۔ مان بھرا۔ سنگیت کا رسیا۔ یوں لگتا تھا جیسے بھتیر کوئی لگن لگی ہو۔ دھونی رمی ہو۔ آرتی سبھی ہو۔

ٹھا کر کی ہمارے ہاں بڑی قدر تھی۔ آپنی عزت کرتی تھی۔ بھروسا کرتی تھی۔ ٹھا کرنے بھی کبھی نظر اچھالی نہ تھی۔ جھکائے رکھتا۔ پیتا ضرور تھا۔ پر ایسی کہ جوں جوں پیتا جاتا، اللہ مدھم پڑتا جاتا۔ آنکھ کی چمک گل ہو جاتی۔ آواز کی کڑک بھیگ جاتی۔ اس کا نشہ ہی انوکھا تھا۔ جیسے بوتل کا نہ ہو بھتیر کا ہو۔ بوتل اک بہانہ ہو۔ بوتل چابی ہو بھتیر کے پٹ کھولنے کی۔

ڈرو سکھو ڈرو۔ بھتیر کے نشے سے ڈرو۔ بھتیر کے نشے کے سامنے بوتل کا نشہ یوں ہاتھ جوڑے کھڑا ہے جیسے راجا کے روبرو بیچ کھڑا ہو۔ بوتل کا تو خالی سر چکراتا ہے۔ بھتیر کا من کا جھولنا جھلا دیتا ہے۔ بھتیر کا کسی جوگا نہیں چھوڑتا۔ خود جوگا بھی نہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ٹھا کر کے نشے کا ریلہ مجھے بھی لے ڈوبے گا۔“

ہاں تو اس روز ٹھا کر کی بیٹھک ہو رہی تھی۔ بول تھے ”گاٹھری میں کون جتن کر کھولوں، مورے پیا کے جیا میں پڑی رہی۔“ گیت نے کچھ ایسا سا باندھ رکھا تھا کہ ٹھا کر جھوم جھوم جا رہا تھا۔ ”پھر کہو پھر بولو۔“ کا جاپ کئے جا رہا تھا نہ جانے کس گرہ کو کھولنے کی آرزو جاگی تھی۔ اپنے من یا محبوب کے من کے سے بیتا جا رہا تھا۔ سس کی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سس جیون سے نکل جاتا ہے کہ کون ہیں، کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ اس روز وہ سس ایسا ہی سے تھا۔

دفعۃً گھڑی نے تین بجائے۔ آپنی ہاتھ جوڑے اٹھ بیٹھی۔ بولی ”شما کرو ٹھا کر جی، معافی مانگتی ہوں۔ ہمارا سس بیت گیا۔ اب بیٹھک ختم کرو۔“

ٹھا کر پہلے تو چونکا، پھر مسکایا۔ ”نہ آپنی“ وہ بولا ”ابھی تو رات بھگی ہے۔“

آپنی بولی ”ٹھا کر ہم سوکھے پروں والی پنچھی ہیں۔ جب رات بھیگ جاتی ہے تو ہمارا سس بیت جاتا ہے۔ جو ہمارے پر بھیگ گئے تو اڈاری نہ رہے گی۔ فنکار میں اڈاری نہ رہے تو باقی کیا رہا؟“ ٹھا کرنے بڑی منتیں کیں۔ آپنی نہ مانی۔

محفل ٹوٹ گئی تو ہم تینوں آپنی کے گرد ہو گئیں۔ ”آپنی یہ سس کا گورکھ دھندا کیا ہے؟“

آپنی بولی ”لڑکیوں سے بڑی چیز ہے۔ ہر کام کا الگ سے بنا ہے۔ رات کو گاؤ بجاؤ پلو پلاؤ ملو ملاؤ موج اڑاؤ۔ تین بجے تک

پھر بھروسے اس کا سے ہے۔ اس کا نام چپو۔ اسے پکارو۔ فریاد کرو۔ دعائیں مانگو۔ سجدے کرو۔ اس سے میں تم عیش نہیں کر سکتے۔ گناہ نہیں کر سکتے۔ قتل نہیں کر سکتے۔ یہ دھندا جو ہمارا ہے اس کے سے میں نہیں چل سکتا۔ اس کے سے میں پاؤں نہ دھرنا۔ اس نے برامانا تو ماری جاؤ گی۔ جو اچھا مانا تو بھی ماری جاؤ گی اور دیکھو۔ اس کے سے کے نیڑے نیڑے بھی ایسا گیت نہ گانا جو اسے پکارے۔ بھجن نہ چھیڑنا۔ ڈرتے رہنا۔ کہیں وہ تمہاری پکار سن کر ہنکار نہ بھر دے۔“

پھر وہ دن آ گیا جب میں نے ان جانے میں سے کا بندھن توڑ دیا۔ اس روز ٹھا کر آئے۔ آپنی سے بولے ”بائی کل خواجہ کا دن ہے۔ خواجہ کی نیاز سارے گاؤں کو کھلاؤں گا۔ آج رات خواجہ کی محفل ہوگی۔ ادھر حویلی میں صرف اپنے ہوں گے گھر کے لوگ۔ تجھے لینے آیا ہوں۔ چل میرے ساتھ گاؤں چل۔“

آپنی سوچ میں پڑ گئی۔ بولی ”روپہ ماندی ہے وہ تو نہیں جاسکے گی۔ کسی اور دن رکھ لینا نذر نیاز۔“

”خواجہ کا دن میں کیسے بدلوں؟“ وہ بولا

”تو کسی اور منڈلی کو لے جا۔“

”اوہ ہوں“ ٹھا کرنے منہ بنا لیا۔ ”خواجہ کی بات نہ ہوتی تو لے جاتا۔ ان کا نام لینے کے لائق کھ تو ہو۔“

”میں کس لائق ہوں جو ان کا نام منہ پر لاؤں۔“

”بس اک تیری بیٹھک ہے بائی جہاں پو پرتا ہے۔ جسم کا نہیں من کا ٹھکانہ ہے۔“

آپنی مجبور ہو گئی۔ اس نے روپہ کا دھیان رکھنے کے لئے پہلی کو وہاں چھوڑا اور مجھے لے کر ٹھا کر کے گاؤں چلی گئی۔

رات بھر وہاں حویلی میں خواجہ کی محفل لگی۔ وہ تو گھریلو محفل تھی۔ ٹھا کر کی بہنیں، بہویں، بیٹیاں، ٹھا کرانی سب بیٹھے تھے۔ وہ تو سمجھ لو بھجن منڈلی تھی۔ ”خواجہ میں تو آن کھڑی تو رہے دوار“ سے شروع ہوئی تھی۔

آدھی رات کے سے محفل اتنی بھیگی کہ سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل ڈولے۔ آپنی کا ڈوب ہی گیا۔ ٹھا کر اسے محفل سے اٹھا کر اندر لے گیا۔ شربت شیرا پلانے کو۔ پھر وہیں لٹا دیا۔

پھر خواجہ کے گیت چلے تو میں بھی بھیگ گئی۔ آنکھیں پھر بھر آئیں۔ میں حیران۔ میں تو کچھ مانگ نہیں رہی۔ میں تو التجا نہیں کر رہی۔ میں تو اک تاجر ہوں۔ پیسہ کمانے کے لئے آئی ہوں۔ میری آنکھیں کیوں بھر بھر آئیں۔ خواہ مخواہ۔ سو میں بنا سوچے سمجھے گائے چلی گئی۔ آنکھیں بھر بھر آتی رہیں۔ دل کو کچھ کچھ ہوتا رہا۔ پر میں بھیگ بھیگ کر گاتی گئی۔ سے بیت گیا اور مجھے دھیان ہی نہ آیا کہ

میں اس کے سسے میں پاؤں دھر چکی ہوں۔ آپ تو تھی نہیں جو مجھے لڑکتی۔

اور پھر مجھے کیا پتا تھا کہ خواجہ کون ہے۔ میں نے تو صرف نام سن رکھا تھا۔ اس کے گیت یاد کر رکھے تھے۔ میں تو صرف یہ جانتی تھی کہ وہ غریب نواز ہے۔ میں غریب نہ تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ مجھے بھی نواز دے گا۔ خواہ مخواہ۔ زبردستی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اس میں اتنی بھی سدھ بدھ نہیں کہ کون پکار رہا ہے۔ کون گارہا ہے۔ کون منگتا ہے کون خالی جھولی پھیلا رہا ہے۔ کون بھری جھولی سمیٹ رہا ہے۔ میں تو یہی سنتی آئی تھی کہ دکھی لوگ پکار پکار کر ہار جاتے ہیں۔ پر کوئی سنتا نہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اتنا دیا لو ہے۔ اتنا نیڑے ہے۔ اتنے کان کھڑے رکھتا ہے۔

پھر ٹھا کر بولا ”سنہری بائی“ بس اک آخری فرمائش۔ خواجہ پیاموری رنگ دے چڑیا۔ ایسی بھی رنگ دے رند نہ چھوٹے۔ دھوبیا دھوئے جائے ساری عمر یا۔“

پھر مجھے سدھ بدھ نہ رہی۔ ایسی رنگ پچکاری چلی کہ میں بھیگ بھیگ گئی اور میں ہی نہیں، محفل رنگ رنگ ہو گئی۔ انگ انگ بھیگا۔ خواجہ نے رنگ کھاٹ بنا دیا۔

گھر پہنچی تو گویا میں میں نہ تھی۔ دل رویا رویا۔ دھیان کھویا کھویا۔ کسی بات میں چت نہ لگا۔ بیٹھک بے گانہ دکھتی۔ ساز میں طرب نہ رہا۔ سارنگی روئے جاتی۔ استاد کو خان بجاتے پر وہ روئے جاتی۔ طلبہ پیٹتا۔ گھنگھر و کہتے پاؤں میں ڈال اور بن کو نکل جا۔ وہاں اس کا جھومر ناچ جو پتے ڈال ڈال سے جھانک رہا ہے۔

روز دن میں تین چار بار ایسی رقت طاری ہوتی کہ کہہ بھیں بھیں کر کے روتی۔ پھر حال کھیلنے لگتی۔ پیلی حیران روپہ کا منہ کھلا۔ آپلی چپ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جب آٹھ دن یہی حالت رہی بلکہ اور بگڑ گئی تو آپلی بولی ”بس پتر تیرا اس بیٹھک سے بندھن ٹوٹ گیا۔ دانا پانی کھتم ہو گیا۔ تو نے اس سسے میں پاؤں دھر دیا۔ اس نے تجھے رنگ دیا۔ اب تو اس دھندے جو گی نہیں رہی۔“

”پر کہاں جاؤں آپلی؟“ اس بیٹھک سے باہر پاؤں دھرنے کی کوئی جگہ بھی ہو میرے لئے۔“

”جس نے بلایا ہے اس کے دربار چلی جا۔“ روپہ بولی۔

”اس بھیڑ میں جائے۔“ آپلی بولی ”یہ لڑکی جائے جس کا سنہری پنڈا اکپڑوں سے باہر جھانکتا ہے۔ نہیں یہ کہیں نہیں جائے گی۔ اسی کو ٹھٹھی میں رہے گی۔ بیٹھک میں پاؤں نہیں دھرے گی۔“

پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ رقت ختم ہو گئی۔ دل میں اک جنون اٹھا کہ کسی کی ہو جاؤں۔ ہو رہوں۔ وہ آئے تو اس کے جوتے اتاروں۔

پکھا کروں۔ پاؤں دابوں۔ سر میں تل مالش کروں۔ اس کے لئے پکاؤں۔ میز لگاؤں۔ برتن رکھوں۔ اس کی بنیائیں دھوؤں۔ کپڑے استری کروں۔ آرسی کا کول بناؤں۔ پھر سر ہانے کھڑی رہوں کہ کب جاگے۔ کب پانی مانگے۔

ایک دن آپنی بولی۔ ”اب کیا حال ہے دھیے؟“ میں نے رورو کے ساری بات کہہ دی کہ کہتے ہیں کسی ایک کی ہو جا۔ بولی ”وہ کون ہے؟ کوئی نظر میں ہے کیا؟“

”اوپہوں کوئی نظر میں نہیں۔“

”ناک نقشہ دکھتا ہے کبھی؟“

”نہیں آپنی“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ بولی ”جو کھوئی پر لٹکا نام مقصود ہے تو آپ کھوئی بھیجے گا۔“

دس ایک دن کے بعد جب بیٹھک راگ رنگ سے بھری ہوئی تھی تو میری کوٹھڑی کا دروازہ بجا۔ آپنی داخل ہوئی۔ بولی ”خواجہ نے کھوئی بھیج دی۔ اب بول کیا کہتی ہے؟“

”کون ہے؟“

”کوئی زمیندار ہے۔ ادھیڑ عمر کا ہے۔ کہتا ہے ”بس ایک بار بیٹھک میں آیا تھا۔ سنہری بائی کو سنا تھا۔ جب سے اب تک اس کی آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ توجہ ہٹانے کے بہت جتن کئے۔ کوئی پیش نہیں گئی۔ اب ہار کے تیرے در پر آیا ہوں۔ بول تو کیا کہتی ہے۔ منہ مانگا دوں گا۔ چاہے ایک مہینے کے لئے دے دے۔ ایک سال کے لئے یا ہمیشہ کے لئے بخش دے۔ جیسے تیری مرضی۔“ آپنی ہنسنے لگی۔ بولی ”چل بیٹھک میں اسے دیکھ لے ایک نظر۔“

”اوپہوں۔“ میں نے سر ہلا دیا۔ ”نہیں آپنی انہوں نے بھیجا ہے تو ٹھیک ہے۔ دیکھنے کا مطلب؟“

”کتنی دیر کے لئے مانوں؟“

”جیون بھر کے لئے۔“

”سوچ لے جو ادب باش نکلا تو؟“

”پڑا نکلے۔ کیسا بھی ہے جیسا بھی نکلے۔“

اگلے دن بیٹھک میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ زمیندار نے پیسے کا ڈھیر لگا دیا۔ آپنی نے رد کر دیا۔ لوٹا دیا۔ بولی ”سودا نہیں کر رہی۔ دھی

وداع کر رہی ہوں اور یاد رکھ یہ خواجہ کی امانت ہے۔ سنبھال کر رکھیو۔“

حویلی یوں اجڑی اجڑی تھی جیسے دیو پھر گیا ہو۔

ویسے تو سبھی کچھ تھا۔ ساز و سامان تھا۔ آرائش تھی۔ قالین بچھے ہوئے تھے۔ صوفے لگے ہوئے تھے۔ قد آدم آئینے، جھاڑ فانوس۔ سبھی کچھ۔ پھر بھی حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

برآمدے میں آرام کرسی پر چھوٹی چودھرائی بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے تپائی پر چائے کے برتن پڑے تھے مگر اسے خبر ہی نہ تھی کہ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اسے تو خود کی سدھ بدھ نہ تھی کہ کون ہے۔ کہاں ہے۔ کیوں ہے۔

اوپر سے شام آ رہی تھی۔ سسے کو سسے سے لکراتی۔ اداسیوں کے جھنڈے گاڑتی۔ یادوں کے دیے جلاتی۔ بیتی باتوں کے الاپ گنگنائی۔ دبے پاؤں۔ مدھم یوں جیسے پائل کی جھنکار بیرنیا ہو۔

دور اس کو ارڈر کے باہر کھاٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار کی نظریں چھوٹی چودھرائی پر جمی ہوئی تھیں۔ حقے کا سونا لگاتا تھا اور پھر سے چھوٹی چودھرائی کو دیکھنے لگتا یوں جیسے اسے دیکھ دیکھ کر دکھی ہوا جا رہا ہو۔

دوسری جانب گھاس کے پلاٹ کے کونے پر بوڑھا مالی پودوں کی تراش خراس میں لگا ہوا تھا۔ ہر دو گھڑی کے بعد سر اٹھاتا اور چھوٹی چودھرائی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتا پھر چونک کر لمبی ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر سے کاٹ چھانٹ میں لگ جاتا۔

جنت بی بی جو چودھرائی کا کھانا پکاتی تھی دو تین بار برآمدے کے پرے کنارے پر کھڑی ہو کر اسے دیکھ لیتی تھی۔ جب دیکھتی تو اس کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں۔ پلو سے پونچھتی پھر لوٹ جاتی۔

سارے نوکر کمین چھوٹی چودھرائی پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کے غم میں گھلے جا رہے تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس پر سخت ناراض بھی تھے۔ اس نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی کیوں ماری تھی؟ کیوں خود کو دو جوں کا محتاج بنا لیا تھا؟ کیوں؟ اپنی اولاد ہوتی تو پھر بھی سہارا ہوتا۔ اپنی اولاد تو تھی نہیں۔

جب چودھری مرنے سے پہلے بھائی ہوش و حواس اپنی آدمی غیر منقولہ جائیداد چھوٹی چودھرائی کے نام گفٹ کر گیا تھا تو اسے کیا حق کہ اپنا تمام تر حصہ بڑی چودھرائی کے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دے۔ اگر ایک دن بڑی چودھرائی نے اسے حویلی سے نکال باہر کیا تو وہ کیا کرے گی؟ کس کا درد دیکھے گی۔

ایک طرف تو اتنی بے نیازی کہ اتنی بڑی جائیداد اپنے ہاتھ سے بانٹ دی۔ اور دوسری طرف یوں سوچوں میں غم تصویر بن کر بیٹھ

اگلی شام چھوٹی چودھرائی نے جنت بی بی سے پوچھا۔ ”جنت“ یہ جو درویش ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہاں ان کے پاس گاؤں والے آتے ہیں کیا؟“

جنت بولی ”لو چھوٹی چودھرائی“ وہاں تو سارا دن لوگوں کا تاننا لگا رہتا ہے۔ بڑے پینچے ہوئے ہیں جو منہ سے کہتے ہیں، ہو جاتا ہے۔“

”تو تیار ہو جنت، ہم بھی جائیں گے۔ تو اور میں۔“

”چودھرائی جی وہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔“

”تو چل تو سہی۔“ چودھرائی نے خود کو چادر میں لپیٹے ہوئے کہا ”اور دیکھ وہاں مجھ کو چودھرائی کہہ کر نہ بلانا، خبردار۔۔۔۔۔“

جب وہ مہمان خانے پہنچیں تو دروازہ بند تھا۔ جنت نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ”کون ہے؟“ اندر سے آواز آئی۔ جنت نے پھر دستک دی۔ سفید ریش بوڑھے خادم نے دروازہ کھولا۔ جنت زبردستی اندر داخل ہو گئی۔ پیچھے پیچھے چودھرائی تھی۔ سفید ریش گھبرا گیا۔ بولا

”سائیں بادشاہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔ وہ اس کمرے میں مشغول ہیں۔“

”ہم سائیں بادشاہ سے ملنے نہیں آئے۔“ چھوٹی چودھرائی بولی۔

”تو پھر؟“ سفید ریش گھبرا گیا۔

”ایک سوال پوچھنا ہے۔“ چودھرائی نے کہا۔

”سائیں بابا اس سے سوال کا جواب نہیں دیں گے۔“

”سائیں بابا نے جواب نہیں دینا انہوں نے پوچھنا ہے۔“ وہ بولی

”کس سے پوچھنا ہے؟“ خادم بولا۔

”اس سے پوچھنا ہے جس کے وہ بالے ہیں۔“ یہ سن کر سفید ریش خادم سن کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

”ان سے پوچھو“ چھوٹی چودھرائی نے کہا۔ ”ایک عورت تیرے دوار پر کھڑی پوچھ رہی ہے۔ اے غریب نواز بتا کہ میرا جیون کس کام آیا؟“

کمرے یرمنوں بوجھل خاموشی طاری ہو گئی۔

جو دھرائی بولی ”کہو وہ عورت بوجھتی ہے“ تو نے پٹھک کے گملے سے ایک بوٹا اکھیرا۔ اسے نیل بنا کر ایک درخت کے گرد لپیٹ دیا۔

کہ جا اس پر ثار ہوتی رہ۔“ وہ رک گئی۔ کمرے کی خاموشی اور گہری ہو گئی۔ ”اب تو نے اس درخت کو اکھیڑ پھینکا ہے۔ نیل مٹی میں رل گئی۔ وہ نیل پوچھتی ہے۔ بول میرا جیون کس کام آیا؟“ یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔

”تیرا جیون کس کام آیا۔ تیرا جیون کس کام آیا؟“ سفید ریش خادم کے ہونٹ لرزنے لگے۔ ”تو پوچھتی ہے تیرا جیون کس کام آیا؟“ وہ رک گیا۔ کمرے کی خاموشی اتنی بوجھل ہو گئی کہ سہاری نہیں جاتی تھی۔

”میری طرف دیکھ۔“ سفید خادم نے کہا۔ ”سنہری بی بی، میری طرف دیکھ کہ تیرا جیون کس کام آیا۔ مجھے نہیں پہچانتی؟ میں تیرا سارنگی نواز تھا۔ میں کیا تھا، کیا ہو گیا۔“

چھوٹی چودھرائی کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ ”استاد جی آپ۔۔۔۔۔؟“ وہ استاد کے چرن چھونے کے لئے آگے بڑھی۔ عین اس وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک بھاری بھر کم نورانی چہرہ برآمد ہوا۔

”سنہری بی بی،“ وہ بولا ”مجھ سے پوچھ، تیرا جیون کس کام آیا۔“

چھوٹی چودھرائی نے مڑ کر دیکھا۔ ”ٹھا کر۔۔۔۔۔“ وہ چلائی۔

ٹھا کر بولا ”اب ہمیں پتہ چلا کہ سرکار نے ہمیں ادھر آنے کا کیوں حکم دیا تھا۔“ اس نے سنہری بی بی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ بولا

”بی بی، ہمیں آئیں باد دے۔“



چکٹ گاڑی، ہونکتا ہوٹرا اور موم بتی

لاحول ولاقوة..... کتنی بے معنی خبر ہے۔ میں نے غصے سے اخبار اٹھا کر پرے پھینک دیا۔ بھلا ماننے کی بات ہے کیا کہ کہانی اس قدر پر اثر ہو کہ سننے والوں کو فساد پر آمادہ کر دے۔ میں نہیں مانتا۔ میں نے چلا کر کہا۔

ایسے ہی من گھڑت خبریں چھاپ دیتے ہیں۔ بھئی میں خود کہانیاں لکھتا ہوں۔ ساری زندگی اسی دھندے میں گزاری ہے۔ ادبی انجمنیں شاہد ہیں کہ میری کوئی کہانی کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکی ایمان سے۔ لوگ سنتے ہیں، اوئے اوئے کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھار انجانے میں واہ بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن جلد ہی ہوش میں آ کر تنقید کی چٹیاں، قینچیاں، چھریاں نکال لیتے ہیں اور پھر چر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ کہانی کو کم، لکھنے والے کو زیادہ۔

س روز صبح سویرے سے میں اخبار لئے بیٹھا تھا۔ سب سے پہلے یہی خبر نظر آئی کہ مزدور شغل میں کسی بڑے میاں نے ایک کہانی سنائی جسے سن کر سبھی مشتعل ہو گئے۔ فساد برپا ہو گیا۔ دھماکے ہو گئے۔ پانچ زخمی ہو گئے۔ آپ کہیں گے اتنی غیر اہم خبر میری نگاہ پر کیسے چڑھی۔ آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میں صرف غیر اہم خبریں پڑھا کرتا ہوں۔ اخبار پڑھنا بھی مجھے میرے دوست ابن انشاء نے سکھایا تھا۔ کہنے لگا۔ ”مفتی! سچی اور عوامی خبریں پڑھنا چاہتے ہو تو غیر اہم خبریں پڑھو۔ اس لئے اخبار کو الٹی طرف سے کھولو۔ جہاں غیر اہم خبریں ہوتی ہیں۔ اہم خبریں کبھی سچی نہیں ہوتیں۔ جن مسائل سے بڑوں کی غرض و غایت وابستہ ہو، وہ سچی ہو سکتی ہیں نہ عوامی۔ لہذا عوام سے متعلق خبریں پڑھو جو اخبار میں غیر اہم صفحات پر ڈھیر کر دی جاتی ہیں۔ مثلاً فلاں خاتون کے گھر دوسروں والا بچہ پیدا ہوا۔ فلاں گھر میں جنات کی خشت باری ابھی تک جاری ہے۔ راہ چلتے نو جوان نے خاتون کو آنکھ ماری اور پکڑا گیا۔ ایسی خبریں۔“

اس روز اخبار میں پڑھ کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ ممکن ہے یہ درست ہو۔ بھلا غیر سیاسی خبریں جھوٹ ملانے کی کیا ضرورت تھی۔ جوں جوں میں سوچتا گیا، توں توں شکوک پیدا ہوتے گئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کہانی اس قدر پر اثر ہو کہ فساد پر آمادہ کر دے۔

پھر خیال آتا۔ آخر ادبی محفل میں بھی تو کہانی سننے والے آستین چڑھا کر بات کرتے ہیں اور میز پر مکے مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے تو خبر درست ہو سکتی ہے۔ پھر خیال آتا۔ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ ادبی محفل میں تو پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں۔ ہر

کسی نے تنقید پر کوئی نہ کوئی کتاب پڑھ رکھی ہوتی ہے۔ لہذا وہ اپنے علم کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور علم کا مظاہرہ دوسرے کی بات رد کرنے میں ہی ہوتا ہے سپورٹ کرنے میں نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ادبی محفل کا ہال واحد جگہ ہے جہاں ادیب کو کھل کر بات کرنے کا موقع ملتا ہے۔ باہر سیاستیے بولنے نہیں دیتے۔ گھر میں بیوی اور اور پھر یہ بھی تو ہے کہ معترض کا مقصد کہانی پر بات کرنا نہیں ہوتا بلکہ اپنی ادبی صلاحیتیں چھانٹنا ہوتا ہے۔ مزدور نقاد تھوڑا سی ہوتے ہیں۔ وہ ایک معصوم سی کہانی پر کیسے مشتعل ہو سکتے ہیں۔

”خبر من گھڑت ہے۔“ میں نے چیخ کر کہا اور غصے میں اخبار کو پھینک دیا۔ عین اس وقت سجاد آ گیا۔ سجاد میرا دوست ہے۔ یقیناً آپ اسے جانتے ہوں گے۔ بھی مشہور جرنلسٹ ہے۔ وہ آتے ہی بولا ”کون سے خبر من گھڑت ہے؟“

”خبر ہے کہ چلتی گاڑی میں ایک مزدور نے ایک کہانی سنائی جسے سن کر لوگ اس قدر مشتعل ہو گئے کہ فساد برپا ہو گیا۔ دو مارے گئے۔ پانچ زخمی ہو گئے۔ لیکن میں نہیں مانتا کہ کوئی کہانی اس قدر پر اثر ہو سکتی ہے۔“

”کیوں نہیں ہو سکتی؟“ وہ بولا

”بھئی میں خود افسانہ نویس ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا؟“ سجاد تن کر کھڑا ہو گیا۔

”بھئی ایک کہانی کی وجہ سے اتنا فساد ہو جائے۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ التبتہ ایک صورت ہے۔ اگر کہانی ذاتی نوعیت کی ہو تو پھر ہو سکتا ہے کہ سننے والے کو غصہ آ گیا ہو۔“

سجاد نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بولا ”یہ کہانی ذاتی نوعیت کی نہیں تھی۔“

”تمہیں پتا ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں پتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیسی کہانی تھی وہ؟“ میں نے اسے کریدا۔

”عام سی کہانی تھی جیسے فیملر ہوتی ہیں۔ مثلاً چڑی کاں کی کہانی۔“

”نہیں یا مذاق نہ کر۔“ میں ہنس پڑ۔ ”اول تو کہانی میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ فساد برپا کر سکے۔ پھر چڑی کاں کی کہانی۔“

اونہوں نے یہ خبر سرے سے ہی غلط پڑتی ہے۔“

”خبر تو بھی سولہ آنے مصدقہ ہے۔“ سجاد نے تن کر کہا۔

”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ مصدقہ۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”بھئی میں خود وہاں موجود تھا۔“ سجاد نے جواب دیا۔

”موقع پر؟“

”ہاں، موقع پر“

”تم نے وہ کہانی خود سنی تھی کیا؟“

”بالکل بھئی، میں کہانی سنانے والے کے قریب کھڑا تھا۔“

”تو یار مجھے سناؤ وہ کہانی۔“ میں نے پینتر ابدلا۔

”بھئی، وہ ایک عام سی کہانی تھی۔ جیسے ہوتی ہیں پرانی کہانیاں۔ اور سنانے والا ایک عام سا آدمی تھا۔ ایک معمر مزدور اور کہانی

سنانے سے اس کا کوئی خاص مقصد نہ تھا۔“

”تو پھر اس نے کہانی سنائی کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”یار بڑے بوزھوں کی عادت ہوتی ہے کہ جہاں بیٹھتے ہیں، کوئی اصلاحی بات یا نصیحت چھیڑ دیتے ہیں اور پھر اس کی سپورٹ

میں کوئی فوک وزڈم کی کہانی سنا دیتے ہیں یا سعدی کی یا مولام روم کی کوئی حکایت۔ بہر حال وہ اپنی نوعیت کی کہانی تھی۔“ سجاد نے

کہا۔

”تم سناؤ تو سہی۔“ میں نے سجاد کی منت کی۔

سجاد کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ نکالا۔ سلگایا۔ ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑ۔ پھر جیسے کہانی سنانے کے لئے تیار ہو کر

بیٹھ گیا۔ لیکن جلد ہی پھر ہچکچا کر بولا ”اس وقت کہانی شاید پھپھسی لگے۔ دراصل کہانی کا ماحول سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔“

”تو ماحول بھی بیان کر دو۔ اس میں کیا مشکل ہے؟“ میں نے کہا۔

”کچھ دیر کے لئے سجاد سوچتا رہا۔ پھر بولا ”تم فیکٹری شٹل کو جانے ہو کیا؟ جس میں یہ حادثہ وقوع پذیر ہوا؟“

”بھئی ظاہر ہے وہ کوئی گاڑی ہوگی۔“ میں نے جواب دیا۔

”گاڑی تو ہے۔“ سجاد بولا ”لیکن ایک خصوصی گاڑی ہے۔ یہ گاڑی روز صبح شہر سے مزدوروں کو لاد کر تارپین آئل فیکٹری تک

پہنچاتی ہے اور شام کو فیکٹری سے انہیں لاد کر شہر لے آتی ہے۔ یہ فاصلہ تقریباً چالیس میل کا ہے۔ اس لائن پر کوئی اسٹیشن نہیں۔ صرف

فلگ سٹاپ ہیں۔ جب یہ شٹل شہر پہنچتی ہے تو اسے باقاعدہ پلیٹ فارم پر نہیں لاتے بلکہ اسٹیشن سے باہر سائڈنگ پر کھڑا کر دیتے ہیں۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا

”بھئی اس لئے کہ یہ گاڑی اس قابل نہیں کہ اسے منظر عام پر لایا جائے۔“ سجاد نے کہا۔ ”دراصل یہ گاڑی نہیں تیلی کی دکان ہے۔ کل کوئی چھ بوگیاں ہوں گی۔ سب تیل سے چکت۔ سیٹیں، فرش، پہنے پائیدان سب کالے دھت۔ نہ تو بوگیوں میں دروازوں کے پٹ ہیں۔ نہ کھڑکیوں کے شٹر۔ سامان رکھنے کے تختے بھی اکھاڑ لئے گئے ہیں۔ کھڑکیوں کو بند کرنے والے شیشے اور تختے ٹوٹ چکے ہیں۔ ہاتھ روم کے دروازے بھی غائب ہیں۔ ان بوگیوں میں نہ بتیاں ہیں نہ پنکھے۔ صرف یہی نہیں بوگیوں کا ہر بیچ ڈھیلا ہے۔ پہنے چلنے کے ساتھ جھولتے جھومتے بھی ہیں۔ ایک گاڑی کو دوسری گاڑی سے جوڑنے والے کنڈے تو ہیں مگر بفرز کے شک آبزائز کب کے دم توڑ چکے ہیں۔ چلتے ہوئے دھکے لگتے ہیں اور ساتھ عجیب و غریب قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ یوں جیسے پراسرار فلم میں بیک گراؤنڈ میوزک چل رہی ہو۔“ سجاد ہنسنے لگا۔ ”وہ گاڑی نہیں اونٹ ہے۔ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ البتہ ایک ہوٹر ہے جو بہت جاندار ہے۔ نہایت بھدی اور ڈراؤنی آواز میں بجتا ہے۔ اور تقریباً سارا راستہ بجتا ہی رہتا ہے۔“ کچھ دیر کے لئے وہ رک گیا۔

”ہوایوں کہ چار ایک دن پہلے تاریخین آئل فیکٹری کے متعلق ایک خبر چھپی تھی کہ بیروزہ کے پھوک سے ہم ایک ایسی چیز بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو عوام کی زندگی پر گہرا اثر مرتب کرے گی۔“ وہ پھر رک گیا۔

”اخبار کے ایڈیٹر نے مجھ سے کہا۔ بھئی یہ کیا چیز ہے جو عوام کی زندگی پر اثر گہرا اثر مرتب کرے گی؟ اس کی تفصیلات کا پتہ لگاؤ۔ اور اگر واقعی یہ چیز اہم ہے تو اس پر ایک فیچر لکھ دو۔ اس پر میں نے فیکٹری کے پی آر کو فون کر کے پوچھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ وہ بولا۔ وہ چیز بتانے کی نہیں دیکھنے کی ہے۔ یہاں آ جاؤ۔ اسی وجہ سے مجھے کل تاریخین آئل فیکٹری جانا پڑا۔ وہاں دن بھر ریسرچ میں مصروف رہا۔ پھر شام کو اسی گاڑی سے لوٹا جس میں یہ حادثہ پیش آیا۔“ سجاد خاموش ہو گیا۔ پھر بولا ”چائے پلاؤ گے؟“

میں نے چڑ کر کہا۔ ”پہلے ساری بات بتا مجھے پھر پلاؤں گا۔“

وہ ہنسنے لگا۔ سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔ بولا ”واپسی پر جب سٹاپ پر پہنچا تو گاڑی حرکت میں آ چکی تھی۔ خیر۔۔۔۔۔ میں دوڑ کر سوار ہو گیا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ گاڑی مزدوروں سے کچا کھج بھری ہوئی تھی۔ دراصل اس روزانہ کا پے ڈے تھا۔ اس لئے حاضری فل تھی۔ گاڑی میں تیل، سپینے اور فلر مندی کی بو کے بھسکے اٹھ رہے تھے۔ وہ سب گردنیں جھکائے

بیٹھے تھے۔ ہر کوئی اپنی ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ ایک دوسرے سے کوسوں دور۔ نہ جانے کہاں۔“

”تو تو کہتا ہے وہ بے ڈر تھا۔“ میں نے سے ٹوکا۔

”بالکل پیڑے ڈے تھا۔“ سجاد نے کہا۔

”مزدور تو بے ڈے پر خوش ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ غلط فہمی ہے۔“ سجاد بولا ”مہینے بھر مزدور لوگ پے حاصل کرنے کی امید رکھتے ہیں۔ خواب دیکھتے ہیں۔ پے ڈے کو انہیں احساس ہوتا ہے کہ حصول کتنا عبث ہے۔ کتنا بے معنی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے۔“ سجاد مسکرایا۔ ”کہ زندگی کا المیہ حاصل نہ ہونے میں نہیں بلکہ حاصل ہو جانے کے بعد اس احساس میں ہے کہ کیا اسی کے لئے اتنی شورا شوری تھی۔ غصے کہتا ہے کہ ہماری زندگی کا عظیم ترین لمحہ وہ ہے جب ہماری بڑی سے بڑی آرزو بڑی سے بڑی کامیابی ہماری نگاہ میں پہنچ نظر آتی ہے۔“

”ہٹا یا ر۔“ میں نے چڑ کر کہا۔ ”نٹسے بازی چھوڑ مجھے وہ کہانی سنا۔“

وہ میری بے قراری پر ہنسنے لگا۔ ”ایک معمولی سی کہانی کے لئے تم خود کوری کی طرح بل دے رہے ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے سگریٹ ایک لمبا کش لیا اور بات شروع کی۔ بولا ”اتفاق سے مجھے کھڑے ہونے کے لئے وہیں جگہ ملی جہاں وہ بڈھا مزدور داستان گو بیٹھا تھا۔ ایک دبلا پتلا مزدور میرے پاس کھڑا تھا۔ بولا ”میاں جی آپ کہانی سنانے لگے تھے۔“ ہاں ہاں، وہ بڈھا بولا۔۔۔۔۔۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب غلام رکھنے کی رسم عام تھی۔ بازار میں ہر اٹھوارے منڈی لگا کرتی تھی جس میں غلام کھلم کھلا بکتے تھے۔ سوداگر بکنے والے کو تھڑے پر کھڑا کر کے اس کی خوبیاں گناتے کہ دیکھ لو۔ مضبوط آدمی ہے، جوان ہے، طاقتور ہے، کام کر سکتا ہے، بے داغ ہے۔ جس طرح گھوڑے کو بیچتے وقت اس کے دانت دکھاتے ہیں۔ پھر بولی شروع ہو جاتی۔ جو سب سے اونچی بولی دیتا، غلام ہمیشہ کے لئے اس کی ملکیت ہو جاتا اور مالک اس سے زندگی بھر جو کام چاہتا، لیتا۔

گاڑی چینی چلاتی، کراہتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ گرد و پیش کا ویران علاقہ دھندلا ہو چکا تھا۔ رات کا اندھیرا ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ گاڑی کے اندر فکر مندی اور اداسی کے انبار لگے ہوئے تھے۔ مزدوروں کی شکلیں دھندلائے جا رہی تھیں۔ ہوٹرا اپنی بھدی آواز میں کراہ رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد میاں جی بولے۔۔۔۔۔ پھر جو بندے کو غلام بنانے کے خلاف آواز اٹھائے گئے تو ملک کے قانون میں بدلی کر دی گئی۔ ملک میں ڈھنڈورا پیٹ کر اعلان کر دیا گیا کہ جس طرح مالک کو حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اپنے غلام کو منڈی میں

لاکریچ سکتا ہے اس طرح آئندہ سے غلام کو بھی حق حاصل ہوگا۔ وہ جب چاہے خود کو بکنے کے لئے پیش کر دے۔ مطلب یہ کہ جس غلام کو اپنا آقا پسند نہ ہو وہ شہر کے قاضی کے پاس جائے۔ اگر قاضی اسے بکنے کی اجازت دے دے تو منڈی میں خود کو بکنے کے لئے پیش کر دے۔ بولی میں جو قیمت ملے وہ اپنے پہلے مالک کو دے دے اور خود کو نئے مالک کے حوالے کر دے۔ میاں جی پھر خاموش ہو گئے۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے مزدور جوں کے توں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی کہانی سن نہیں رہا تھا۔ ہر کوئی اپنی ہی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ صرف وہی دبلا پتلا مزدور ہنکارا بھر رہا تھا۔ جی میاں جی پھر۔۔۔۔۔؟

میاں جی نے سراٹھایا۔ ایک لمبی آہ بھری۔ اور بولے 'شہر میں ایک غلام تھا زبیر۔ نو جوانی کا عالم تھا۔ مسیں بھیگ رہی تھیں۔ جسم میں جان تھی۔ ناک نقشے میں جاذبیت تھی۔ وہ ہر چوتھے دن شور مچا دیتا۔ میں بکوں گا۔ میں اس مالک کے پاس نہیں رہوں گا۔ اس مالک میں کیا عیب ہے جو تو اس کے پاس نہیں رہے گا؟ قاضی نے پوچھا۔ زبیر بولا۔۔۔۔۔۔ جناب یہ مالک مجھ سے اچھا برتاؤ نہیں کرتا۔ میں سارا دن اس کے کاموں میں جتا رہتا ہوں لیکن یہ خود تو تازی روٹی کھاتا ہے اور مجھے کھانے کو باسی دیتا ہے۔ قاضی نے زبیر کو بہت سمجھایا بچھایا کہ اتنی سی بات کو دل پر نہیں لگاتے لیکن زبیر نہ مانا۔ قاضی نے اسے بکنے کی اجازت دے دی اور وہ پھر سے بک گیا۔

اپنے نئے مالک کے گھر چند ہی روز رہنے کے بعد زبیر نے پھر شور مچا دیا۔ میں بکوں گا۔ میں بکوں گا۔ میں اس مالک کے پاس نہیں رہوں گا۔ اس لئے کہ یہ خود گئیہوں کی کھاتا ہے اور مجھے جو کی دیتا ہے۔ قاضی نے پھر اسے بہت سمجھایا بجھایا مگر وہ نہ مانا اور پھر بک گیا۔

تیسرے مالک کے گھر پہنچتے ہی زبیر نے پھر چیخ پکار شروع کر دی۔ اس سے بہتر تو میرا پہلا مالک ہی تھا جو اگرچہ جو کی دیتا تھا لیکن دو وقت دیتا تھا۔ یہ تو صرف ایک وقت روٹی دیتا ہے اور وہ بھی روٹی نہیں بلکہ پانی میں بھگوئے ہوئے سوکھے ٹکڑے۔ یہ مجھے انسان نہیں جانور سمجھتا ہے۔ میں اس کے پاس نہیں رہوں گا۔ قاضی بولا زبیر میں نے تجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ مالک ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اب میں تجھے کیا سمجھاؤں۔

گاڑی کے ہوٹرنے زور سے لمبی چیخ ماری۔ بوڑھا رک گیا۔

گاڑی ہونک رہی تھی۔ یوں جیسے سسکیاں بھر رہی ہو۔ کل پرزے کڑکڑا رہے تھے۔ انجن یوں چیخ رہا تھا جیسے چلا چلا کر کہہ رہا

ہو۔ بکوں گا۔ میں بکوں گا۔ گاڑی کے اندر خاموشی کا تنہوتا ہوا تھا۔ گھپ اندھیرے میں سے دہلی دہلی آہوں کراہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

پھر میاں جی؟ دبلے پتلے واحد سامع کی آواز سنائی دی۔ پھر کیا ہوا؟

میاں جی بولے۔۔۔۔۔ زیر کی آوازیں آتی رہیں، آتی رہیں، میں بکوں گا، میں بکوں گا۔ پہلے ان آوازوں میں غصے کا رنگ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ان میں دکھ کا پہلاوا بھرتا گیا۔ یکاریں کراہوں میں بدلتی گئیں اور وہ بکتا گیا۔ بکتا گیا۔ پھر دفعتاً اس کی آواز خاموش ہوگئی۔ زیر چپ ہو گیا۔ زیر کو یوں چپ دیکھ کر لوگ چونکے۔ یہ کیا ہوا؟ زیر چپ کیوں ہو گیا؟

سارے مزدوروں اور غلاموں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک بولا زبیر کو آخر کار آقا مل گیا ہے۔ وہ خوشی کی وجہ سے چپ ہو گیا ہے۔ دوسرے نے کہا، چلو مان لیا کہ وہ خوش ہے۔ پھر وہ خوش دکھتا کیوں نہیں؟ پہلے اس کا چہرہ کتنا صاف تھا اس پر بشارت کی جھلک تھی۔ مگر اب ماتھے پر تیوری چڑھ بیٹھی ہے۔ آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں۔

ایک بوڑھے غلام نے کہا، وہ اس لئے چپ ہو گیا ہے کہ اب وہ جان گیا ہے۔ اس کے بعد جب بھی زبیر بازار میں نکلتا تو لوگوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں۔ دیکھو دیکھو وہ قاضی کی طرف جا رہا ہے۔ ضرور وہ بکنا چاہتا ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتے کہ اس کا رخ کسی اور طرف ہے تو وہ مایوس ہو جاتے۔ پھر وہ آوازے کتے۔ زبیر تو قاضی کے پاس کیوں نہیں جاتا؟ کیا تو بکنا نہیں چاہتا؟ کیا تو خوش ہے؟ لیکن زبیر ان آوازوں کو سنی ان سنی کر کے گردن جھکائے چلا جاتا۔

لوگوں کی آپس میں شرطیں بندھ گئیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ زیر خوش ہے۔ کچھ کہتے تھے وہ خوش نہیں۔ شرط پر فیصلہ سننے کے لئے لوگوں نے اپنے آوازے تیز کر دیئے۔ آخر ایک روز ان آوازوں سے اکتا کر زیر رک گیا۔ اس نے منہ موڑ کر آواز لگانے والے کی طرف دیکھا اور چلا کر کہا۔ میں نہیں بکوں گا میں نہیں بکوں گا۔ میں خوش ہوں بہت خوش۔ آوازے لگانے والوں پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ابھی زیر نے جانے کے لئے رخ بدلا ہی تھا کہ مجمعے سے ایک آواز آئی۔ تو کیوں نہیں بکے گا۔۔۔۔۔۔ وجہ؟

زیر پھر رک گیا۔ بولا، میرا آقا علم کا رسیا ہے۔ مطالعے کا شوقین ہے مگر اتنا کنجوس ہے کہ چراغ دان نہیں خریدتا۔ رات کو جب وہ مطالعہ کرتا ہے تو چراغ میری ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے۔ یوں میں آدھی آدھی رات تک چراغ اٹھائے رہتا ہوں۔ نہیں، میں نہیں بکوں گا۔ وہ چیخ کر بولا۔ میں ڈرتا ہوں کہ میرا اگلا مالک مجھے تیل پلا دے گا اور میرے منہ سے بتی نکال کر مجھے دیا بنالے گا۔ نہیں، میں نہیں بکوں گا۔

بڈھا خاموش ہو گیا۔ گاڑی پر سکوت طاری ہو گیا۔ اندھیرا اس قدر گاڑھا تھا کہ محسوس ہوا جیسے کسی نے ہمیں کنوئیں میں دھکا دے دیا ہو۔ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ یونہی صدیاں بیت گئیں۔ پھر دفعتاً گاڑی کا ہوٹر کراہنے لگا۔ میں نہیں بکوں گا۔ میں نہیں بکوں گا۔ اس پر گاڑی میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ ایک آواز آئی۔ میاں جی تو مجھے طعنہ دے رہا ہے۔ عبداللہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ ایک مزدور کھڑا ہو گیا۔ بولا، ”یہ تجھے طعنہ نہیں دے رہا۔ عبداللہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ مجھے پتا ہے۔“ اس کی آواز میں تشدد تھا۔ نہیں نہیں، دہلا پتلا مزدور بولا۔ میاں جی تو کہانی سنا رہے تھے۔ ٹھہر جا تو۔ تشدد بھری آواز پھر آئی۔ اس بڈھے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں اسے سمجھ لوں گا۔

پھر اس ہنگامے سے ایک دھونس سنائی دی اور ایک اونچا لمبا آدمی چھلانگ لگا کر کونے سے باہر نکل آیا۔ تو رہنے دے۔ لمبا تڑنگا بولا۔ اس بڑھے نے تجھے نہیں مجھے چھیڑا ہے مجھے۔ میرا نام زبیر ہے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ میں کیوں بکنا نہیں چاہتا۔ ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ۔ جس نے اس کی حمایت کی اس سے میں سمجھ لوں گا۔ پھر یوگی میں چاروں طرف سے تشدد بھری آوازیں آنے لگیں۔“

سجاد نے کہا۔ ”یہ عالم دیکھ کر میں ڈر کے پیچھے ہٹ گیا اور وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ گاڑی کے پہیے ہونک رہے تھے۔ بفرنگر اکر اکر دھکے دے رہے تھے۔ ہوٹر چلا رہا تھا، میں نہیں بکوں گا میں نہیں بکوں گا۔“

سجاد خاموش ہو گیا۔۔۔۔۔ دیر تک خاموش بیٹھا رہا جیسے گہری سوچ میں پڑا ہو۔ پھر اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ ”سچی بات یہ ہے مفتی!“ وہ بولا ”میرا جی چاہتا تھا کہ بڑھ کر اس بڑھے کی ناک پر گھونسا مار دوں۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”پتا نہیں“، سجاد ہنسا۔ ”مجھے ایسا لگا جیسے اس بڈھے نے میرا راز مجھ پر کھول دیا ہو۔ پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا جیسے میرے ایڈیٹر نے مجھے موم بتی بنا کر دونوں سروں پر جلا رکھا ہوتا کہ اس کا اپنا نام روشن رہے۔“



عینی اور عفریت

زندگی کا عظیم ترین واقعہ چھوٹے چھوٹے معمولی واقعات کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ایک چھوٹا سا چشمہ پھوٹتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شوریدہ سردریا بن کر آپ کی شخصیت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔

وہ اچانک رونما ہوتا ہے۔ ایسے وقت جبکہ نہ خواہش ہوتی ہے نہ آرزو۔ نہ امید نہ توقع۔ آپ دروازے بند کر چکے ہوتے ہیں۔ اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔ جب آپ بھرپور زندگی بتا چکے ہوتے ہیں، خود سے مطمئن، تکمیل کے احساس سے سرشار۔ اس وقت وہ اچانک نمودار ہوتا ہے اور آپ کی شخصیت کے اس شاندار ایوان کو جسے آپ نے سالہا سال ایک ایک اینٹ رکھ کر تعمیر کیا تھا، ایک جھٹکے میں مسمار کر دیتا ہے۔

اور پھر جو آپ دیکھتے ہیں تو۔۔۔۔۔ کیا دیکھتے ہیں کہ آپ ملے کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں۔ میں نے بڑی بھرپور زندگی گزاری تھی۔ جوانی میں جذبات کی ایک بھیڑ لگائے رکھی۔ میلہ لگایے رکھا۔ پٹانے چھوڑے۔ پھلجڑیاں چلائیں۔ ہولیاں کھیلیں۔ رنگ پچکاریاں چلائیں۔ ایئر گھال کے تھال بھرے۔ میں جذباتی تھا۔ شدت پسند تھا۔ جذبات اور شدت میری دانست میں خلوص کے مظہر تھے۔ میرا رخ مثبت تھا۔ خلوص بھرا۔ ہمدردی بھرا۔ حقارت اور نفرت سے پاک۔ میں کہہ دینے والا تھا۔ گونگے اور ٹھنڈے خون والے مجھے پسند نہ تھے۔ میں نے علم حاصل کیا تھا۔ نفسیات میں مجھے دسترس تھی۔ تحلیل نفسی میں خاصی اہلیت تھی۔ دوست مانتے تھے۔ اچھا جانتے تھے۔ قدر کرتے تھے۔

اپنے ماضی پر مجھے پشیمانی نہ تھی۔ نہ احساس گناہ نہ کمتری۔ میں نے عشق کئے، محبتیں کیں۔ افیر نہیں، یارانے نہیں۔ توجہ کا مرکز بن رہا۔ ذلتیں اور رسوائیاں جھیلیں۔ فراق و وصال سبھی کچھ۔ جیسی تو اب خود مطمئن تھا۔ احساس تکمیل سے سرشار۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے بول کیا مانگتا ہے؟ جو مانگے گا، ملے گا۔ تو یقیناً میں سوچ میں پڑ جاؤں گا۔ کیا مانگوں؟ میں مانگ کی دنیا سے دور نکل آیا ہوں۔ سکون اور اطمینان کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔

شور شرابا پیچھے رہ گیا ہے۔ بہت پیچھے۔

جس راستے پر میں گا مزن ہوں، وہ اطمینان سے لبریز ہے۔

سڑک خاموش ہے۔

راستہ ہموار ہے۔ نہ اوچان، نہ نہچان۔ سیدھا، صاف۔ دونوں جانب پیڑا گے ہوئے ہیں۔ سرسبز نہیں، پیلے پیلے اونچے لے نہیں

بیٹھے بیٹھے، جھکے جھکے، گرد آلود۔ پتے مسلسل جھڑ رہے ہیں۔ کھڑکھڑ کر رہے ہیں۔

شام گہری ہوتی جا رہی ہے۔

دور دور لگے کھمبوں پر بتیاں ٹٹمار رہی ہیں۔

ان کی زرد ٹٹم زمین تک نہیں پہنچ پاتی۔

شام کا گھسبہ بڑھتا جا رہا ہے۔

سڑک کا اکادکاراہ گیر چل رہے ہیں۔

چپ چاپ تھکے ہارے۔ گرد سے اٹے ہوئے۔

ایک دوسرے سے دور دور۔ اکیلے اکیلے تنہا تنہا۔

منظر پر سکون کا ایک خیمہ تنا ہوا ہے۔ بے چینی کی مدھانی مدت سے زنگ آلود ہو چکی ہے۔ میرے دل میں کوئی مدوجذر نہیں۔

ذہن سوچ بچار کی گھاٹیوں سے نکل چکا ہے۔ کیوں؟ کیسے؟ کس لئے بھڑبھن بھن کرنا بھول چکے ہیں۔

میرے سامنے آسمان پر چاند لٹکا ہوا ہے۔ چاندنی والا چاند نہیں۔ چاندنی تو چھیر دیتی ہے۔ ایک بڑا سا مدھم مدھم چاند۔ جیسے

تانے کا ایک تھال لٹک رہا ہو۔ میں چلے جا رہا ہوں۔ چلے جا رہا ہوں۔

دفعاً پاؤں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ قریب، اور قریب۔ یہ کون ہے جو میرے ساتھ چل رہا ہے؟

میں مڑ کر دیکھتا ہوں، کون ہوں؟

وہ سرائٹاتی ہے۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹکتی ہے۔ رکتی ہے۔ پھر سر جھکا لیتی ہے۔ جواب نہیں دیتی۔

اس کے جسم میں چمک ہے۔ تازگی ہے، شگفتگی ہے، لیکن منہ لٹکا ہوا ہے۔ خدو خال پر بے تعلقی کی دھول جمی ہے۔ تھکا ہارا مردہ

چہرہ۔ گردن جھکی ہوئی۔ نگاہیں ہیں استائی ہوئیں۔ جیسے بہت کچھ دیکھا ہو۔ دیکھ دیکھ کر تھک گئی ہوں۔ جھک گئی ہوں۔ نہ دیکھنے کی چاہ

میں رک جاتا ہوں۔" میں تمہارے ساتھ نہیں چلوں گا۔"

"تھینک یو" وہ جواب دیتی ہے اور تیز چلنے لگتی ہے۔

"تھینک یو۔۔۔۔۔ کس بات پر؟" میں چلاتا ہوں۔

"میں تمہارے ساتھ چلنا پسند نہیں کرتی۔" وہ پیچھے مڑے بغیر جواب دیتی ہے۔

غصے سے میری کنپٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ میں اس کے پیچھے بھاگتا ہوں۔ "میرے ساتھ چلنے میں کیا ہو؟ بولو۔"

"تم ساتھی نہیں ہو۔"

"لیکن کیوں؟" میں اسے کندھوں سے پکڑ لیتا ہوں۔

"تم اپنی میں سے بھرے ہوئے ہو۔ اتنے بھرے ہوئے ہو کہ دوسرے کی گنجائش نہیں۔ تم توجہ دے نہیں سکتے۔ خود توجہ طلب ہو۔"

"تم مجھے جانتی ہو کیا؟"

"جانتی نہیں۔" وہ جواب دیتی ہے۔ "تمہارے ماتھے پر لکھا ہوا ہے۔"

"تم اسے پڑھ سکتی ہو کیا؟" میں طنز اُپوچھتا ہوں۔

"ہاں" وہ سر اٹھا کر جواب دیتی ہے۔ "میں عورت جو ہوں۔"

مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے سن کر دیا ہو۔ میں اپنے ہاتھ اس کے کندھوں سے اٹھا لیتا ہوں۔ میری گردن لٹک جاتی ہے۔

مجھے دیکھ کر اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ کہتی ہے۔ "میں تمہیں دکھانا نہیں چاہتی۔ دل میلانہ کرو۔ سچ سننے کی ہمت پیدا کرو۔"

اس نے پہلی بار نگاہیں اٹھائی ہیں۔ مجھ پر بھرپور نظر ڈالی ہے اور مسکرا دی ہے۔ دفعتاً نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ کچھ ہو گیا ہے۔ رنگ

پچکاری چل گئی ہے۔ بیڑ تن گئے ہیں۔ پتے ہرے ہو گئے ہیں۔ بتیاں روشن ہو گئی ہیں۔

چاند کی چاندنی نے سارے منظر کو بھگو دیا ہے۔

میرے ارد گرد اک بھیڑ لگ گئی ہو۔

وہ چل پڑتی ہے۔

"رک جاؤ۔ رک جاؤ۔" میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا ہے۔

پیچھے پیچھے چلنے کا میرا یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ زندگی میں میں بار بار پیچھے پیچھے چلا ہوں۔ مجھ میں یہ صلاحیت نہیں کہ کسی کو پیچھے لگا سکوں۔

دراصل میں ازلی طور پر پیچھے چلنے والوں میں سے ہوں۔

میرا عشق پیچھے چلنا ہے۔

جو میرے پیچھے چلتی ہے وہ دل سے اتر جاتی ہے۔

جب تک میں پیچھے پیچھے چلتا ہوں جنون قائم رہتا ہے۔

جب ساتھ ساتھ چلنے کا موقع آتا ہے قدم اکھڑ جاتے ہیں۔

سالہا سال پہلے یہی بات مجھے اماں نے بتائی تھی۔ لیکن اماں کی بات میں نے کبھی نہ سنی تھی۔ اماں کی بات پر میں کیسے سوچتا۔ میں تو بات بات پر اماں سے کہا کرتا تھا۔ ”اماں تم نہیں سمجھتیں۔“ جو سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ اس کی بات پر سوچنا کیسا۔ اماں کی بات کو میں نے کبھی نہ جانا تھا۔ اور جانا ہی نہیں تھا تو ماننا کیسا۔

دو پہر کا وقت تھا۔ بدلتے موسم کی ہوا چل رہی تھی۔ گرتے پتے کھڑکھڑ کر رہے تھے۔ اداسی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اس چھوٹے سے گھر میں ہم تین رہتے تھے۔ ننھا منیر دیوار سے لگا۔ بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ میں ٹین کی کرسی پر بیٹھا دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے فضا کو گھور رہا تھا۔ بوڑھی اماں دیوار سے ٹیک لگائے آلوچھیل رہی تھی۔

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

دفعتاً اماں بولی ”ایسے کیسے چلے گا بیٹے؟“

میں نے سراٹھایا۔ ”ایسے کیسے کیا اماں؟“

”کب تک وہ دیوار سے لگا کھڑا ہے گا؟“ اس نے منیر کی طرف اشارہ کیا۔ ”تو دونوں ہاتھوں میں سر تھامے زمین کو گھورتا رہے گا اور میں۔۔۔۔۔۔“ وہ رک گئی۔

”مجھ سے اب یہ کچھ نہیں ہوتا بیٹے۔“

”کیا کریں اماں؟“

”کوئی گھر والی لے آنا۔“

”کیسے لے آؤں؟ ملے تو لاؤں؟ ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”نہ نہ نہ“ وہ بولی۔ اس کا چہرہ یوں پھوٹ گیا جیسے شیشہ ترخ جاتا ہے۔ آواز میں منت بھری ٹوٹ جھلکی۔ ”نہ بیٹے نہ اللہ کے واسطے ڈھونڈ نہ پڑنا۔“

”کیوں اماں؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی پسند آگئی تو تو اس کے پیچھے بھاگے گا۔“ وہ رک گئی۔ انگلی سے آنسو پونچھا۔ ”پہلے بھی یہی ہوا تھا۔ سولہ سال تو اس کے پیچھے بھاگتا رہا تھا۔ پھر جب وہ مل گئی تو ساتھ ساتھ نہ چل سکا۔“ وہ رک گئی۔

”جو پیچھے بھاگنے والے ہوتے ہیں، بیٹا، وہ ڈرتے ہیں کہ مل نہ جائے۔ پیچھے بھاگنے کی لذت ختم نہ ہو جائے۔“ وہ چپ ہو گئی۔ میں سوچنے لگا۔ بات سامنے دھری تھی پر میرے پلے نہ پڑی تھی۔

اب میں نے جانا ہے کہ سامنے دھری نہیں دکھتی۔ جو ڈھونڈ کا رسیا ہوا، اسے سامنے دھری کیسے دکھے۔ دیر تک ہم چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر اماں اٹھی، میرے پاس آئی۔ ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔ تھپک کر بولی۔ ”بیٹے، تو سب کچھ جانتا ہے۔ پر خود کو نہیں جانتا۔ میں تجھے جانتی ہوں۔ مجھے پتا ہے۔“

”تو مجھے کیسے جانتی ہے، اماں؟“

”تو اپنے ابا پر گیا ہے نا، ہو ہو وہی ہے اور میں نے ساری زندگی اس کے ساتھ گزاری ہے۔ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ پیچھے بھاگنا محبت ہے۔ بس وہ بھاگتا ہی رہا زندگی بھر۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ دیر تک کھڑی میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی رہی۔ اور میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”اماں۔۔۔۔۔ میں نے خاموشی توڑی۔ محبت کیا ہوتی ہے؟“

کچھ دیر کے لئے وہ خاموش رہی۔ پھر بولی ”بیٹے محبت دوڑ بھاگ نہیں ہوتی۔ طوفان نہیں ہوتی۔ سکون ہوتی ہے۔ دریا نہیں ہوتی۔ جھیل ہوتی ہے۔ دو پہر نہیں ہوتی۔ بھور سے ہوتی ہے۔ آگ نہیں ہوتی۔ اجالا ہوتی ہے۔ اب میں تجھے کیا بتاؤں کہ کیا ہوتی ہے۔ وہ بتانے کی چیز نہیں، بیتنے کی چیز ہے۔ سمجھنے کی چیز نہیں، جاننے کی چیز ہے۔“

اماں کی بات میرا رستہ روک لیتی ہے۔ میں رک جاتا ہوں۔ لیکن تڑپ بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہتا ہوں۔ دیکھتا رہتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید وہ مڑ کر دیکھے پھر مسکرائے۔ پھر پھلجھڑی چل جائے۔ پھر ”کن“ کہہ دیا جائے۔ لیکن وہ چلے جاتی ہے۔ یوں چلے جاتی ہے جیسے کسی نے اس کا راستہ کاٹا ہی نہ ہو۔ جیسے کسی کو پیچھے چھوڑ کر نہ جا رہی ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ اگرچہ میرے پاؤں رک گئے

ہیں لیکن میں نہیں رکا ہوں۔ میں اس کے پیچھے چلے جا رہا ہوں۔ چلے جا رہا ہوں۔
 دن گزر جاتے ہیں، ہفتے گزر جاتے ہیں لیکن میں چل رہا ہوں۔ چلے جا رہا ہوں۔ اس کے پیچھے پیچھے چلے جا رہا ہوں۔
 پتا نہیں، میں اس کے پیچھے کیوں چلے جا رہا ہوں۔
 کوئی خواہش نہیں، آرزو نہیں جو پیچھے چلنے پر اکسائے۔ حصول کی خواہش نہیں۔ مطلب نہیں، مانگ نہیں۔
 اسے دینے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔
 پوجا کے پھول سوکھ کر کانٹے بن چکے ہیں۔
 آرتی کی تھالی خالی پڑی ہے۔
 بھینٹ چڑھانے کے لئے کچھ بھی تو نہیں ہے۔
 پھر بھی چلے جا رہا ہوں۔

نہ مقصد نہ منزل

چلتے چلتے ایک دن وہ پھر نظر آ جاتی ہے۔
 مجھے یقین نہیں آتا، آنکھیں ملتا ہوں۔

نظر تو وہ مجھے مسلسل آتی رہتی ہے۔ آتی رہتی ہے۔ وہ مسکراہٹ، وہ رنگ پچکاری جیسے کسی نے ”کن“ کہہ دیا ہو۔ نہیں نہیں۔ فریب نگاہ
 نہیں۔ واقعی وہ پارک کے ایک کونے میں درخت کے مقابل زمین پر اکڑوں بیٹھی ہے۔ ہاتھ میں برش ہے۔ پہلو میں بہت سے رنگ
 بکھرے ہوئے ہیں۔ روبرو ایک بڑی سی کیئوس فریم پر لگی ہوئی درخت کے سہارے کھڑی ہے۔

میں دبے پاؤں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوتا ہوں۔

ارے یہ کیئوس پر کیا بنا ہوا ہے؟ اس قدر خوفناک چہرہ دیکھ کر رو گئے کھڑے ہو رہے ہیں۔ کوئی عفریت ہے۔ یہ کیا بنا رہی ہے؟ میں دل
 ہی دل میں سوچتا ہوں۔

دیر تک وہاں کھڑا رہتا ہوں۔ کھڑا رہتا ہوں۔

وہ مڑ کر دیکھتی ہے۔ ایک نظر انداز۔۔۔۔۔۔ سرسری۔۔۔۔۔۔ اور پھر سے رنگ بھرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ جیسے پیچھے کوئی
 کھڑا ہی نہ ہو۔ انداز میں نہ تعجب ہے نہ لگاؤ۔ نہ لاگ۔

”یہ کیا بنا رہی ہو؟“ میں پوچھتا ہوں۔

”پورٹریٹ“ وہ منہ موڑے بغیر جواب دیتی ہے۔

”کس کی ہے؟“

”ہے کسی کی“

”کوئی عفریت ہے کیا؟“

”نہیں، عفریت نہیں۔“

”کس کے لئے بنا رہی ہو؟“

”میری اسائنمنٹ ہے۔“ وہ پیچھے دیکھے بغیر جواب دیئے جا رہی ہے۔

”کانٹوں سے بھری شبیہ ہے۔“

”ہاں، تناؤ ہے، تلخی ہے، شدت ہے۔ مٹھاس نہیں، محبت نہیں۔“

”محبت تو شدت کے بغیر ممکن نہیں۔“ میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔

”نہیں، محبت شدت کی نفی ہے۔“ وہ پہلی بار مڑ کر میری طرف دیکھتی ہے۔ مسکراتی ہے۔ وہی رنگ پچکاری۔ فرحت سے بھری ایک

پھواری اڑتی ہے۔ پورٹریٹ کی ساری تلخی دھل جاتی ہے۔

”تم شدت کو برا جانتی ہو؟“ میں پوچھتا ہوں۔

وہ میری طرف منہ موڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ کہتی ہے۔ ”محبت ایک پرسکون کیفیت ہے۔ وجدان ہے۔ نہیں۔“ وہ

زیر لب گویا خود سے کہتی ہے۔ ”بتائی نہیں جاسکتی۔ صرف جیتی جاسکتی ہے۔“

دفعاً وہ میری طرف دیکھ کر چوکتی ہے۔ ”رک جاؤ، رک جاؤ۔“ وہ اٹھ کر میری طرف آتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے میری ٹھوڑی تھام لیتی

ہے۔ پھر ٹھوڑی پر بائیں طرف انگلی رکھ کر پوچھتی ہے۔ ”یہ کیا ہے؟ سکار ہے یا قل ہے؟“

”قل ہے۔“ میں جواب دیتا ہوں۔

وہ پورٹریٹ کی طرف مڑتی ہے۔ برش اٹھاتی ہے اور شبیہ کی ٹھوڑی کے بائیں طرف کا لالہ لکھ لگا دیتی ہے۔

غصے سے میرا منہ سرخ ہو جاتا ہے۔ ”کیا مطلب؟ تمہارا مطلب ہے یہ میری۔۔۔۔۔؟“ میں پورٹریٹ کی طرف اشارہ کر کے کہتا

ہوں۔ لیکن میرا گلا خشک ہو جاتا ہے۔

وہ میری طرف منت بھری نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ”سچ جاننے کا حوصلہ پیدا کرو۔“

دفعتاً پارک کے پھول انگاروں میں بدل جاتے ہیں۔ شعلے اٹھتے ہیں۔ پودے دھڑ دھڑ جلنے لگتے ہیں۔ منظر دھواں دھواں ہو جاتا ہے۔ میں اٹھ کر بھاگتا ہوں۔ بھاگتا رہتا ہوں۔ پتا نہیں کب تک بھاگتا رہتا ہوں۔

شام کو جب تھکا ہارا گھر پہنچتا ہوں تو دفعتاً لیٹے لیٹے میرے اندر کوئی کہتا ہے۔ ”تم خود سے بھاگ رہے ہو۔“ میں چوکنا ہو جاتا ہوں۔ یہ کیا ہوا؟ کیا میری ”میں“ کا ایک حصہ باقی ہو گیا ہے؟ ضرور اس لڑکی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ میں خود کو اس کی نظر سے دیکھنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔

نہیں! میں خود سے نہیں بھاگ رہا۔ یہ جھوٹ ہے۔ غصے میں میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔ میری بیوی یہ سن کر گھبرا گئی ہے۔ پوچھتی ہے۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“۔۔۔۔۔۔ ”اے کیا جواب دوں؟“

اگلے روز صبح باتھ روم میں میری نگاہ آئینے پر پڑتی ہے تو میں چونک جاتا ہوں۔ ارے یہ کیا؟ آئینے میں عفریت مجھے گھور رہی ہے۔ نہیں! نہیں! یہ میں نہیں۔ میں تو روز آئینہ دیکھتا ہوں۔

ہنسی کی آواز سن کر میں چونک جاتا ہوں۔

آئینے میں عفریت کے پیچھے باتھ میں برش پکڑے وہ ہنس رہی ہے۔ کہتی ہے۔ ”تم روز آئینے میں وہ دیکھتے ہو جو تم دیکھنا چاہتے ہو وہ نہیں جو تم ہو۔ وہ جو تم سمجھتے ہو کہ ہو۔“

میں آئینے پر پتھر مارتا ہوں۔ تزاخ کی آواز آتی ہے اور پھر باہر نکل جاتا ہوں۔

شام کو جب میں گھر پہنچتا ہوں تو میری بیوی ایک بڑا سا پیکٹ میرے ہاتھوں میں تھما دیتی ہے۔ کہتی ہے ”ایک خاتون دے گئی ہے۔“ پیکٹ کا غد میں لپٹا ہوا ہے۔

میں کا غد پھاڑتا ہوں۔۔۔۔۔۔ ارے وہ پورٹریٹ پورٹریٹ کے کونے میں ”عینی“ لکھا ہوا ہے۔

تصویر کو دیکھ کر میری بیوی ہونٹوں پر انگلی رکھ لیتی ہے۔ ”ہے یہ تو کوئی بھوت ہے۔“

میں اس کی بات کا جواب نہیں دیتا۔ تصویر کو الٹا کر کے دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہوں۔

کچھ دیر کے بعد اچانک جو میں ادھر دیکھتا ہوں تو سن ہو کر رہ جاتا ہوں۔ تصویر کینوس کی پشت پر ابھر آتی ہے۔

دیوانہ وار لپک کر میں تصویر کو اٹھا لیتا ہوں اور باہر نکل جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں۔ میں اسے ایسی جگہ پھینک آؤں گا جہاں کسی کی نظر نہ پڑے۔

سڑک پر اکا دکا موٹریں چل رہی ہیں۔ ایک وگین آ کر رک گئی۔ میری نگاہ اس کی پشت پر پڑتی ہے۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ یہ کیا۔۔۔۔۔؟ وگین کی پشت پر وہی تصویر بنی ہوئی ہے۔ گھبرا کر میں منہ موڑ لیتا ہوں۔ سامنے دیوار پر بھی وہی تصویر۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔؟ میں بھاگ لیتا ہوں۔ جگہ جگہ ٹریفک سائنز پر وہی عفریت مجھے گھور رہا ہے۔
میں گھر کی طرف بھاگنا شروع کر دیتا ہوں۔

ڈرائنگ روم میں میرا دوست راجا شفیق میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں تصویر کو کمرے کی دیوار سے لگا کر راجا سے ہاتھ ملاتا ہوں۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی ہے۔

ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔

راجا بوڑھے ساتھی سے کہتا ہے۔ ”حاجی صاحب میرا دوست آج کل بہت پریشان رہتا ہے۔ اس کے لئے دعا کریں۔“

”کیا پریشانی ہے؟“ حاجی پوچھتا ہے۔

”میں ایک الجھن میں پھنسا ہوں۔“ میں جواب دیتا ہوں۔ ”وہ یہ کہ میں کون ہوں؟“ حاجی مسکرا دیتا ہے۔

میں اپنی بات کی وضاحت کرتا ہوں۔ کہتا ہوں۔ ”میرا مطلب ہے۔ کیا میں وہ ہوں جو خود کو سمجھتا ہوں۔ یا وہ ہوں جو لوگ مجھے سمجھتے ہیں؟“ حاجی پھر مسکراتا ہے۔ کہتا ہے۔ ”چاہے آپ یہ ہیں یا وہ ہیں۔ آپ جھجھٹ میں کیوں پڑتے ہیں کہ آپ کیا ہیں۔ اپنی میں کا بوجھ اپنے کندھوں پر کیوں اٹھائے پھرتے ہیں۔ خواہ مخواہ۔“

دفعۃً میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے کندھوں کا بوجھ اتر گیا ہے۔ عین اس وقت شفیع چلا کر کہتا ہے۔ ”ارے۔۔۔ یہ کیونس تو خالی ہے۔“

میں پورٹریٹ کی طرف دیکھتا ہوں۔ کیونس واقعی خالی ہے۔



دومو نہی

سوچتی ہوں کہ میں تیاگ کلینک میں گئی ہی کیوں؟ کیا فائدہ ہوا بھلا؟ اپنی بیماری دور کرانے کے لئے گئی تھی، ساری مخلوق کو بیمار کر کے آگئی۔ وہی بات ہوئی نا، بڑھیا بڑھیا تیرا کبڑ دوڑ ہو جائے یا ساری دنیا کبڑی ہو جائے۔

لیکن تیاگ جیتی سنانے سے پہلے میں اپنا تعارف کرا لوں۔ میں سانوری ہوں۔ تیس سال کی۔ سلمان سے میرج ہوئے دو سال ہوئے۔ لو میرج تھی۔ میرے خدو خال عام سے ہیں یعنی ایورج سے کچھ بہت۔ ہاں ذہن کی تیکھی ہوں۔ کانٹھی مضبوط ہے۔ جسم تناتنا۔۔۔۔۔ لیکن نہیں۔ میں غلط بیانی کر رہی ہوں۔ کسر نفسی سے کام لے رہی ہوں۔ میرے خدو خال ایورج سہی لیکن مجھ میں بڑا چارم ہے۔ راہ چلتے سراٹھا اٹھا کر گردن موڑ موڑ کر دیکھتے ہیں۔ دیکھتے ہیں تو یوں دکھتے ہیں جیسے سر سے پاؤں تک الو کے پٹھے بن گئے ہوں۔ بس میں نہیں رہتے۔ کنٹرولز ہاتھ سے چھوٹ جاتے ہیں۔ ڈولتے ہیں۔ پتو ارچھوٹ جائے تو کشتی ڈولتی ہے نا۔

میں لڑکی پن سے نکل آئی ہوں۔ لیکن ابھی لڑکی ہوں۔ عورت نہیں بنی۔ اللہ نہ کرے بنوں۔ عجیب سا عالم ہے جیسے شام کو ڈسک ہوتی ہے رات نہیں پڑتی۔ دن بھی نہیں رہا لیکن دن دن سا لگتا ہے۔

لو ایک بات تو میں بھول ہی گئی۔ مجھ میں ایک عجیب سی بات ہے۔ جیتی ہوں، بھرپور جیتی ہوں۔ تھری ڈا منشنل زندگی سے عشق ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خود کو جیتے ہوئے دیکھتی بھی ہوں۔ پرکھتی رہتی ہوں۔ سیانے کہتے ہیں، دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں ہوتیں۔ نہیں ہو سکتیں۔ یا تو جیو یا خود کو جیتے رکھو۔ وہی ایٹ دی کیک اینڈ ہیواٹ والی بات ہے۔ پتا نہیں میری بات کیوں الگ ہے۔ کیک کھاتی بھی ہوں، یا س بھی رکھے ہوئے ہیں۔

[illegible]

نہیں یہ مثال غلط ہے۔ مجھے یہ مثال نہیں دینی چاہیے تھی۔ میں نے تو کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں۔ کیوں بولوں؟ جھوٹ وہ بولتے ہیں جنہیں ڈر ہوتا ہے کہ سننے والے کو سچ کڑوا لگے گا اور وہ تھو تھو کرے گا۔ میں تو ان لڑکیوں میں سے ہوں جن کے منہ سے کڑوا سچ سن کر بھی سننے والا بد مزہ نہیں ہوتا۔ پھر جھوٹ بولنے کا فائدہ؟۔۔۔۔۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ مجھ میں بڑا چارم ہے۔ راہ چلتے کوئی بانکا اچھا لگے تو ایسی چھلکی چھلکی بھر پور نگاہ ڈالتی ہوں کہ اس کا سارا کلف اتر جاتا ہے۔ ”گویا“ ہو کر گر پڑتا ہے۔ پھر میرے اندر سے آواز آتی ہے۔ ”تت‘تپ‘ بے چارہ۔ اپنے آپ سے بھی گیا۔“

مجھے پتہ ہے کہ میں بڑی طاقتور نگاہ رکھتی ہوں۔ اتنی سادگی سے خزرہ کرتی ہوں کہ کوئی اسے خزرہ مان ہی نہیں سکتا۔ سمجھتا ہے کہ انوسنس ہی انوسنس ہوں۔ میک اپ کرتی ہوں لیکن کیا مجال کوئی سمجھے کہ میک اپ ہے۔ سمجھتے ہیں میک اپ سے بے نیاز ہوں۔ لووہ میک اپ ہی کیا جو میک اپ نظر آئے پٹھے منہ ایسے میک اپ کا۔

بس میری ایک ہی مشکل ہے۔ میرے اندر کچھ ہے۔ پتہ نہیں کیا ہے۔ پر ہے۔ جس طرح مدفون خزانے پر سانپ ہوتا ہے جس طرح اہرام مصر کے اندر جادو ٹونا کیلا ہوا ہے۔ ویسا ہی کچھ ہے۔

اونہ۔۔۔۔۔ غلط کہہ گئی۔ میرے ایک نہیں دو ہیں۔ دور و حسی ہیں۔ کبھی ایک کنٹرول پر بیٹھ جاتی ہے کبھی دوسری۔ میں دو مومنہ سانپ کی طرح ہوں۔ کبھی دو مومنہ دیکھی ہے؟ اس کے دوسرے ہوتے ہیں۔ ایک سر کی جانب۔ دوسرا دم کی جانب۔ سراٹھایا چل پڑی۔ پھر رک گئی۔ سر زمین پر رکھ دیا۔ پھر دم والا سراٹھایا اور اس جانب چلنے لگی۔ کبھی اس جانب کبھی اس جانب۔ پتہ نہیں چلتا لگے کب کس جانب چلنے لگوں گی۔ پیش خبری سے عاری ہوں۔ مطلب کہ Unpredictable۔ بس یہی میری مشکل ہے۔ یہی میری بیماری ہے۔

لیکن ٹھہریے۔ شروع شروع میں مجھے پتہ نہ تھا کہ Unpredictable بری چیز ہے۔ الٹا میں تو سمجھتی تھی کہ یہ بڑی پیاری خصوصیت ہے۔ آپ کو کیا پتا جو ان لڑکی ہو چھیڑ دینے والی نگاہ ہو بے نیازی سے مخمور ہو۔ اوپر سے برتاؤ Unpredictable ہو۔ پھر وہ تلواریں بن جاتی ہے۔

بچپن سے ہی میں دودلی تھی۔ کبھی تو اپنی مس اتنی اچھی لگتی اتنی اچھی لگتی کہ میں اس کے وارے نیارے جاتی۔ کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھتی تو ایسے دکھتی جیسے اکستانی تھکی ہاری بے جان عورت ہو۔ کبھی ماں باپ بڑے پیارے لگتے، کبھی ایسا لگتا جیسے قصائی ہوں۔ دو ایک محبتیں بھی ہوئیں۔ کبھی محبت کے جذبات سے چھلکتی، چھلکے جاتی۔ کبھی سوکھی کاٹھ ہو کر رہ جاتی۔

یہ دودھاری پن بچپن ہی سے موجود تھا۔ دوسوادی تھی۔ کھٹ میٹھی۔ گنگا جمنی۔ گرم ٹھنڈی۔ الٹی سیدھی۔ سبھی کچھ تھی۔ لیکن ان دنوں میں اس بات کو اہمیت نہ دیتی تھی۔ جوان ہوئی تو دودھ منی ابھرتی آئی۔ ابھرتی آئی۔۔۔۔۔ چھاگئی۔ پھر دفعتاً مجھے احساس ہوا۔ ڈرگئی۔ بری طرح سے ڈرگئی۔

ان دنوں میں سلمان کی محبت میں چور تھی۔ اتنی لت پت تھی کہ دوسرا سراٹھانے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس دیوانگی میں ڈیڑھ سال گزر گیا۔ پھر ایک روز میں نے جو سراٹھا کر دیکھا تو سامنے سلمان نہ تھا۔ پتا نہیں کون تھا۔ نہ وہ رنگ، نہ وہ روپ، بے جان، جس سے مشک کا فور کی بو آتی تھی۔ میں ڈرگئی۔ اپنی دنیا تباہ ہونے کے خوف سے ڈرگئی۔ خود کو بچانے کے لئے میں نے جھٹ پٹ سلمان سے شادی کر لی۔ شادی کی ہماہمی میں بات پھر چل نکلی۔

بہر حال مجھے احساس ہو گیا کہ یہ ایک بیماری ہے۔ میں مینٹل ہوں۔ میں نے اس احساس کو بہت دبا یا۔ جتنا دباتی، اتنا ابھرتا۔ میں نے بڑے جتن کئے۔ ڈاکٹروں سے ملی۔ ہسپتالوں میں اس قدر گھومی پھری کہ لوگ مجھے ہاسپٹل واکر سمجھنے لگے۔ سپیشلسٹ کیا دوا دیتے، انہوں نے میری بیماری کو سمجھا ہی نہیں۔ میں نے بہت سمجھا یا لیکن سمجھانا آسان ہوتا ہے، سمجھنا بہت مشکل۔ ڈاکٹروں سے مایوس ہو گئی۔

شادی سے پہلے تو سلمان میری Unpredictable پر اس قدر مسحور ہوتا تھا جیسے سانپ بین پر ہوتا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ شادی کے بعد بھی یوں ہی چھن پھیلا کر میرے ہیرے پھیرے لیتا رہے گا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس کا پیش خبری کا مطالبہ بڑھتا گیا۔ اسے میرے دودھ منی پن پر غصہ آنے لگا۔ میں گھبرا گئی۔ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ ادھر میں بھی تو ایک نہ تھی۔ میرے اندر کی دوسری میرے کان میں سرگوشی کرنے لگی۔ ہٹاؤ سلمان کو۔ کوئی اور سہی جو تیرے دودھ منی پن پر مسحور ہو جائے۔ اپنے گرد کوئی اور چھن پھیلا دیکھو۔ دنیا میں نو جوان سبھی اُلٹی بدلتیوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ یہ سر زمین پر رکھ دو دوسرا اٹھاؤ۔ دوسرا سراٹھا کر سلمان کی طرف دیکھتی تو وہ سپاٹ نظر آتا۔ روکھا پھیکا۔ ہئے۔۔۔۔۔ کیا میں اس پر جان دیتی رہی؟

پھر وہ واقعہ پیش آ گیا اور میں لرز کر رہ گئی۔

ایک روز سلمان کا ایک نیا دوست گھر آیا۔ اس وقت سلمان موجود نہ تھا۔ میں تو اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ وہی۔۔۔۔۔ وہی دو سال پہلے کا سلمان جسے دیکھ کر خود کو میں نے اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ وہی رنگ، وہی روپ، وہی شوخی، وہی تازگی۔ میں نے انجانے میں ایک بھر پور چھیڑنے والی نگاہ ڈال دی۔ اس نے چھن پھیلا یا۔ اور بین کے ہیرے پھیرے لینے لگا۔ عین اس وقت

سلمان آ گیا۔ میں جاگ پڑی۔ ہوش میں آئی تو دیکھا کہ میری ”میں“ اٹھ پلٹھ ہو رہی ہے۔ ڈرگنی۔ بری طرح سے ڈرگنی۔ اس روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ تیاگ کلینک جاؤں گی۔ ضرور جاؤں گی۔ چاہے کچھ ہو جائے۔

چھ مہینے پہلے تیاگ کلینک کے متعلق میری ایک سہیلی نے مجھے بتایا تھا۔ وہ خود ذہنی بیماری میں مبتلا تھی۔ ایک مہینہ تیاگ کلینک میں زیر علاج رہی۔ صحت مند ہو کر لوٹی۔

دو پہاڑیوں میں تیاگ ایک قصبہ تھا۔ وہاں ڈاکٹر داؤد نے ذہنی بیماریوں کے لئے ایک ہسپتال کھول رکھا ہے۔ ڈاکٹر داؤد ایک زمیندر ہے۔ ولایت سے ایم ڈی کر کے آیا ہے۔ مقصد پریکٹس کرنا نہیں بلکہ علاقے کے لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔ عمر بھر کے تجربے اور تحقیق کے بعد اس نے ایک اپنا طریق علاج ڈسکور کیا ہے۔ جڑی بوٹیوں اور مش رومز سے علاج کرتا ہے۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ دور دور سے مریض آتے ہیں۔ ان کی رہائش کے لئے ڈاکٹر نے ایک ہوٹل تعمیر کر رکھا ہے۔

یہاں تک تو بات ٹھیک تھی لیکن میری سہیلی نے بتایا کہ علاج شروع کرنے سے پہلے وہ مریضوں سے زبانی اور تحریری حلف لیتا ہے کہ علاج کے دوران میں بغیر چوں و چراں ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کروں گا۔ اس دوران میں ذاتی سوچ بچار کو عمل میں نہیں لاؤں گا۔ میں سچے دل سے اپنی دل سرنڈر کرتا ہوں۔ یہ سن کر میں ڈرگنی۔ نہیں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں سبھی کچھ تیاگ سکتی ہوں، اپنی دل نہیں تیاگ سکتی۔ میرے پاس لے دے کہ اک ”میں“ ہی تو ہے۔ اسے میں کیسے تیاگ دوں؟ کیسے کسی دوسرے شخص کے تابع کر دوں؟ نہیں نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ میری سہیلی نے مجھے بہت سمجھایا کہ ذہنی بیماری کے علاج میں سب سے بڑی رکاوٹ ”میں“ ہی تو ہوتی ہے۔ اس نے بڑی دلیلیں دیں۔ لیکن میں نہ مانی۔

اس سے کچھ دیر پہلے میرے چچا نے مجھے ایک بزرگ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ انہوں نے کہا کہ سانوری بیٹی تیری ساری مشکلات دور ہو جائیں گی۔ بزرگ کی خدمت میں پہنچی۔ انہیں تفصیل سے اپنی ذہنی کیفیت سنائی۔ سن کر بولے ”بیٹی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہماری بیعت کر لو۔“

”بیعت کیا ہوتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

بولے ”بیعت کا مطلب ہے۔ حوالگی، سپردگی، خود کو ہمارے سپرد کر دو۔“

”کیسے سپرد کر دوں؟“ میں نے پوچھا۔

بولے ”اپنی میں تیاگ دو۔ سارا شر تمہاری میں کا ہے۔ وہ خود سر ہو گئی ہے۔ بٹ کر دو ہو گئی ہے۔ جیسے سانپ کی زبان بٹ کر دو

ہو جاتی ہے۔“

غصے میں، میں کھولنے لگی اور جواب دیئے بغیر بھاگ آئی۔

ہاں تو اس روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ تیاگ کلینک جاؤں گی۔ لیکن حلف نہیں اٹھاؤں گی۔ اس رات میں نے سلمان سے کہا۔ ”سلمان میں ایک مہینے کے لئے بل سٹیشن جانا چاہتی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے اکیلی رہوں۔ کسی ایسے پہاڑی مقام پر جہاں بھیڑ بھڑکانہ ہو، کراؤ نہ ہو۔“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر بولا کہ دیکھو اگر تم واقعی تنہا رہنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

تیاگ کا سفر خاصا دشوار تھا۔ پہلے تو گلیات کی طرف جانا پڑا۔ رات وہاں ٹھہری۔ پھر پھول گلی سے تیاگ جانے والی سوزو کی مل گئی۔ سڑک بہت تنگ اور نیم پختہ تھی۔ ساٹھ میل کا سفر سات گھنٹوں میں طے ہوا۔ شکر ہے کلینک سے ملحقہ ہوسٹل میں جگہ مل گئی۔ رات گویا گھوڑے بچ کر سوئی۔ اگلے دن نو بجے کے قریب کلینک پہنچی۔ ایک گھنٹہ استقبالیہ میں انتظار کرنا پڑا۔ پھر ڈاکٹر نے اندر بلا لیا۔

اپنے روبرو ایک نوجوان ڈاکٹر کو دیکھ کر میں حیران ہوئی۔ سہیلی کی باتیں سن کر میں سمجھی تھی کہ ڈاکٹر داؤد معمر آدمی ہوگا۔ ”آپ ڈاکٹر داؤد ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں ان کا بیٹا ڈاکٹر خالد ہوں۔“ وہ بولا ”والد صاحب انتقال کر گئے ہیں۔ اب میں ان کی جگہ کام کر رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے خالد نے ایک لمبا سا کاغذ اٹھالیا۔ بولا ”سب سے پہلے اپنی کیس ہسٹری لکھو اور بتائیے جسے آپ اہم سمجھتی ہیں۔“ دو گھنٹے میں کیس ہسٹری مکمل ہوئی۔ میں نے ہر بات بتادی۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا کہ اب آپ آرام کیجئے۔ رات کو میں آپ کا کیس سنڈی کروں گا۔ کل سے آپ کا علاج شروع ہو جائے گا۔

پتا نہیں اس وقت میرے ذہن میں یہ بات کیسے آئی۔ میں نے کہا کہ میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ یہ بتائیے مجھے کہ اس گاؤں کا نام تیاگ کیوں ہے؟

وہ مسکرایا، کہنے لگا۔ ”بس نام ہے جس طرح آپ کا نام سانوری ہے حالانکہ آپ گوری ہیں۔“ تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے پھر سے بات شروع کی۔ کہنے لگا ”والد صاحب کا اس کے متعلق ایک نظریہ تھا۔ مفروضہ کہہ لیجئے۔“

میں پھر سے بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر خالد میں مجھے ایک بے نام سی کشش محسوس ہونے لگی تھی۔

”بتائیے نا“ میں نے کہا ”وہ مفروضہ کیا تھا؟ لیکن پہلے تو یہ بتائیے کہ تیاگ کا مطلب کیا ہے؟“

کہنے لگا ”تیاگ ہندی کا لفظ ہے۔ مطلب ہے چھوڑ دینا، ترک کر دینا۔ یہ قصبہ ہندوؤں نے آباد کیا۔ اوپر ٹیلے پر ایک مندر بنا ہوا تھا۔ مندر کے ساتھ ایک عمارت ہے۔ غالباً اس عمارت کا نام تیاگ بھون تھا۔“ وہ رک گیا۔

”والد صاحب کا نظریہ بھی تو بتائیے نا۔“ میں نے پوچھا۔

مسکرا کر بولا ”والد صاحب کا کہنا تھا کہ پہاڑوں کی بلندی کا انسانی جذبات سے گہرا تعلق ہے۔ جوں جوں نیچے اتر و جذبات کی شدت بڑھتی جاتی ہے۔ وہ گاڑھے ہو جاتے ہیں۔ جو بھل۔ بھاری۔ جوں جوں اوپر جاؤ۔ جذبات میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔ مٹھاس پیدا ہوتی ہے۔ نیچے لاگ لگاؤ بڑھتے ہیں۔ اوپر بے نیازی کا سماں پیدا ہوتا ہے۔ والد صاحب کہا کرتے تھے دس ہزار کی بلندی پر بھور سے کا عالم ہوتا ہے۔“

”بھور سے کیا؟“

”جس طرح صبح سویرے ڈان کے وقت سپیدی سی ہوتی ہے۔ ایک عجیب سا سکون، اطمینان، نروان۔ دس ہزار کی بلندی پر جذبات کی ایسی کیفیت ہوتی ہے۔ نیچے کے لوگ ندگی کے تالاب میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اوپر کے لوگ ڈوبتے نہیں تیرتے ہیں۔ نیچے خواہش میں ڈنک ہوتا ہے۔ اوپر خواہش تو ہوتی ہے۔ پر اس میں ڈنک نہیں ہوتا۔ نیچے انسان کی ”میں“ میں اتنا ملتا ہوتا ہے کہ وہ پتھر بن جاتی ہے۔ اوپر روئی کے گالے جیسی ہلکی پھلکی رہتی ہے۔ نیچے محبت و نفرت دونوں میں دھار ہوتی ہے۔ اوپر نفرت بھی ہوتی ہے، محبت بھی۔ لیکن دھار نہیں ہوتی۔“

”اوپر سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آٹھ دس ہزار کی بلندی“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ کو حیرت ہوگی کہ یہاں تیاگ میں کوئی ذہنی بیماری نہیں ہوتی۔ ذہنی بیماریاں نیچے جنم لیتی ہیں۔ وادیوں میں میدانوں میں ایک بات یقینی ہے۔ ذہنی بیماریاں نیچے جنم لیتی ہیں۔ وادیوں میں میدانوں میں ایک بات یقینی ہے۔ ذہنی بیماری ”میں“ سے پھوٹتی ہے۔ ”میں“ میں گرہیں لگ جاتی ہیں۔ آپ ایک سال یہاں قیام کریں۔ ساری گرہیں کھل جائیں گی۔ آپ ہی آپ ڈنک نکل جائیں گے۔ دھاریں کند ہو جائیں گی۔“

میں خالد کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس میں سے ایک عجیب سا اطمینان چھن چھن کر کمرے کی فضا کو منور کئے جا رہا تھا۔

اس کی باتیں میرے لئے بہت انوکھی تھیں۔ میری ”میں“ پہلی ہوئی جارہی تھی۔ میں نے ایک شدید کوشش کی۔ اٹھ بیٹھی۔ ”تھینک یو“ اس رات میں اپنے کمرے کی لیرس پر بیٹھی رہی۔ بیٹھی رہی۔ پتا نہیں کب تک بیٹھی رہی۔ میں محسوس کر رہی تھی جیسے میرا وزن کم ہوتا جا رہا ہو۔ میرا تعلق دھرتی سے کتنا جا رہا ہو۔

اگلے روز ڈاکٹر خالد نے کہا۔ ”مسنے آپ کا کیس سنڈی کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ دو ہفتے میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ آج سے آپ کا علاج شروع ہو جائے گا۔ علاج شروع کرنے سے پہلے آپ کو ایک فارمیسی ادا کرنی ہوگی۔ یہ ایک حلف ہے۔“ اس نے ایک چھپا ہوا کاغذ اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ایک تو بات تھ اٹھا کر یہ حلف پڑھئے اور دوسرے اس فارم پر دستخط کر دیجئے۔“

”نہیں ڈاکٹر صاحب“ میں نے کہا۔ ”میں اپنی میں کسی کے حوالے نہیں کر سکتی۔“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اس حیرت میں ستائش بھی شامل تھی۔ میں نے جواب میں ایک بھرپور نگاہ چھلکائی لیکن خالد پر کلف تھا ہی نہیں جو ٹوٹتا۔ ہاں ذرا سا لڑکھڑایا ضرور۔

کہنے لگا ”مسز سلمان“ تمام ذہنی بیماریاں ”میں“ سے پھوٹی ہیں۔ یا تو میں میں گرہیں لگ جاتی ہیں یا دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ یا کانٹے اگ آتے ہیں۔ اس لئے میں کو تیا گے بغیر شفا نہیں ہوتی۔“

”نہ ہو شفا“ میں نے جواب دیا۔

وہ مجھے سمجھانے لگا۔ بولا ”سائیکلی ایئری میں بھی ڈاکٹر مریض کی توجہ ذات کی جانب سے ہٹا کر اپنی جانب مبذول کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر مریض لڑکیوں کو ڈاکٹر سے محبت ہو جاتی ہے۔“

مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر خالد! میں اتنی دور چل کر آپ سے محبت رچانے نہیں آئی۔“ پھر میں نے ایک ایسی نظر اس پر ڈالی جس کا مطلب تھا۔ ”آپ بے شک مجھ سے محبت رچائیں۔“

وہ گھبرا گیا۔ کہنے لگا ”اچھا آپ یوں کریں کہ آٹھ دس روز یہاں قیام کریں اور اس مسئلہ پر سوچیں۔ شاید۔۔۔۔۔“ وہ رک گیا۔

”کیا آپ حلف لئے بغیر علاج شروع نہیں کر سکتے؟“ میں نے پوچھا۔

”حلف علاج کا ایک حصہ ہے۔ اہم ترین حصہ۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”خدا حافظ“ میں اٹھ بیٹھی۔

شام کے وقت جب میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی تو دروازہ بجا۔ میں نے بن سوچے سمجھے کہہ دیا۔ ”کم ان“ میرے سامنے ڈاکٹر خالد کھڑا تھا۔

”بیٹھے“ میں نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پوچھے گا کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا۔ لیکن اس نے آتے ہی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ بولا ”وہ سامنے ٹیلے پر جو جنگل ہے اس جنگل میں عجیب و غریب قسم کے مشروم اگتے ہیں۔ مثلاً ایک مشروم ہے جو ٹہلتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک فٹ کے دائرے میں ٹہلتا ہے۔ صبح یہاں ہے دوپہر کو آدھ فٹ سرکا ہوا۔ شام کو پورا ایک فٹ۔“

وہ مسکرایا۔ بولا ”حقیقت ریپٹی آدھی سے زیادہ الف لیلوی ہے۔ آپ خود الف لیلوی برتاؤ بیت رہی ہیں۔“

”کون سا برتاؤ؟“

”دورخی برتاؤ۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کے بعد دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وہ مجھے عجیب و غریب قسم کے مشرومز کے متعلق بتاتا رہا۔

جب وہ جانے لگا تو میں نے پوچھا۔ ”آپ مشرومز سے علاج کرتے ہیں؟“

کہنے لگا۔ ”ہاں، بیشتر“

میں نے پوچھا۔ ”مشروم کیسا اثر رکھتے ہیں؟“

کہنے لگا۔ ”سب سے پہلے مریض کو ہم وہ مشروم دیتے ہیں جو مریض کی میں سے پھونک نکال دے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسی رات خانساں کھانا لے کر آیا تو کہنے لگا۔ ”بیگم صاحبہ ڈاکٹر خالد کبھی ہوٹل میں نہیں آئے تھے۔ آج پہلی مرتبہ انہیں ہوٹل میں دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا۔“ خانساں کی بات سن کر میری ”میں“ میں پھونک اور بڑھ گئی۔ اگلے روز شام کو وہ پھر آ گیا۔

میں نے پوچھا۔ ”ڈاکٹر آپ شادی شدہ ہیں کیا؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کہنے لگا ”میں لیڈی ڈاکٹر سے شادی کروں گا۔ جو ہمارے طریق علاج کو اپنالے۔“

میں نے اسے چھیڑا۔ ”اور اپنی ”میں“ چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر آپ کو بھیٹ کر دے۔“

”نہیں“ وہ مسکرایا۔ ”میں اپنی“ میں“ چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر اسے پیش کر دوں۔ وہ اسے قبول کر لے محترمہ“ وہ بولا ”محبت کیا ہے؟ اپنی ول سرنڈر کر دینا۔ اپنی میں دوسرے کے تابع کر دینا۔“

”ساری دنیا محبت کرتی ہے۔“ میں نے طنزاً کہا۔ ”لیکن۔۔۔۔۔“

”اُنہوں‘ وہ محبت نہیں ہوتی۔ خواہش ہوتی ہے‘ حرص ہوتی ہے ورزِ زیادہ تر محبوب سے نہیں بلکہ اپنی انا سے محبت ہوتی ہے۔ محبوب تو ایک بہانہ ہوتا ہے۔ ایک پردہ ہوتا ہے۔ ایک ڈیلوژن۔ آپ سمجھتی ہیں کہ آپ نے سلمان سے محبت کی ہے۔ اگر آپ سچے دل سے سلمان سے محبت کرتیں تو دورخی مدت سے ختم ہو چکی ہوتی۔ آپ کو تیاگ میں آنے کی زحمت نہ کرنا پڑتی۔“

پھر دفعتاً اس نے موضوع بدلا۔ کہنے لگا۔ ”صبح کے وقت آپ کیا کرتی ہیں؟ کلینک میں آ جایا کیجئے۔ مریضوں کی کیس ہسٹری بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ دلچسپ اور بصیرت افروز۔“

اگلے روز میں کلینک میں جا بیٹھی۔ ڈاکٹر خالد مجھے دیکھ کر خوش ہوا لیکن اس نے اس کا اظہار نہ کیا۔ کہنے لگا۔ ”آج ایک ہی مریض ہے۔ بہت دور سے آیا ہے۔ بہت بڑا عابد ہے۔“

”کیا تکلیف ہے اسے؟“ میں نے پوچھا۔

”پتا نہیں“ وہ بولا ”ابھی آ کر آپ کے سامنے بیان کرے گا۔“

عین اسی وقت ایک باریش نورانی شخص کمرے میں داخل ہوا۔ ”السلام علیکم“

”وعلیکم السلام“ ڈاکٹر نے جواب دیا ”تشریف رکھئے“ فرمائے آپ کس طرح تشریف لائے ہیں؟“

بوڑھے نے بامعنی نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

”میری اسٹنٹ ہیں۔“ ڈاکٹر خالد نے کہا۔

سہ سن کر بوڑھا مطمئن ہو گیا۔

”فرمائے؟“ ڈاکٹر نے کہا۔

لوڑھے نے اپنی بھاری بھر کم آواز میں کہا۔ ”میری آب بقی مختصر ہے۔“

”جی فرمائے“ خالد بولا۔

”میں نے گزشتہ بیس سال تھکے میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کی ہے۔ بیس سال۔“ اس کی آواز حذرات کی شدت سے کانہی۔ وہ رک

گیا۔ کمرے میں گہری بوجھل خاموشی چھا گئی۔ ”صدیاں بیت گزریں۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔“ اس کی آواز پھر گونجی۔ ”لیکن۔۔۔۔۔ میں آج تک اللہ کو نہیں مان پایا۔ کوشش کے باوجود نہیں مان پایا۔ میں اس کے وجود کو دل سے قبول نہیں کر سکا۔“ کمرے میں پھر سے بوجھل خاموشی چھا گئی۔

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر پر پتھر دے مارا ہو۔ میری آنکھوں میں تارے ناچے اور پھر گھپ اندھیرا چھا گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ بوڑھا جاچکا تھا اور خالد سر جھکائے بیٹھا ہے۔

”ڈاکٹر خالد“ میں نے کہا۔

وہ چونکا۔ بولا ”فرمائیے“

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا؟“ وہ پولا

”میں کل صبح واپس جا رہی ہوں“

”میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے۔“ ڈاکٹر خالد نے کہا۔

”کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم حلف لئے بغیر آپ کا علاج کریں گے۔“

میں اٹھ بیٹھی۔ ”شکریہ ڈاکٹر اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔“

”تو کیا آپ علاج نہیں کرائیں گی؟“

”نہیں“ میں دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ ”اگر اپنی دل ہی سرنڈر کرنا ہے تو میں اس کی بھینٹ کیوں نہ کروں جس کے پروے میں میں نے دو سال ٹوٹ کر اپنی اتنا سے محبت کی ہے۔ خدا حافظ ڈاکٹر۔“



کہانی کی تلاش

تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ تھک کر چور ہو گیا تو میں رک گیا۔ وہ بھی رک گیا۔ سڑک کے کنارے ایک تھڑے پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گیا۔

مجھے اس کا ساتھ پسند نہیں۔ بڑا کتہ چمیں ہے۔ بات بات پر ٹوکتا ہے۔ لیکن وہ میری مجبوری ہے۔ میں اس کا پیچھا چھڑا نہیں سکتا۔ میں نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی۔ پاکستان کا حسین ترین شہر اسلام آباد میرے ارد گرد پھیلا ہوا تھا۔ کیوں نا اسلام آباد پر ایک کہانی لکھوں۔ دفعتاً مجھے خیال آیا۔

”اوپہوں“ وہ بولا ”یہ ہمارا شہر نہیں ہے۔“

”کیوں؟“ میں نے غصے سے اسے دیکھا۔

”اس میں اپنوں کا رنگ نہیں ہے۔ بیگانہ ہے۔“

”اسلامی مملکت کا دار الخلافہ ہے بھی“

”صرف نام کا اسلامی ہے۔ مساوات کا بیری ہے۔“

”ذات پات کا شوقین، اونچ نیچ کا مارا ہوا۔“

”کون سی ذات پات؟“ میں نے پوچھا۔

”عہدوں کی گریڈوں کی۔ تم اس پر کہانی نہیں لکھ سکتے۔“

”کہانی تو اپنوں کی ہوتی ہے۔ بے گانوں کی نہیں“

میں نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔

دیر تک ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

میری مشکل یہ ہے کہ جب تک مرکزی خیال نہ ہو میں کہانی نہیں لکھ سکتا۔ اگر کہانی کے پاس کچھ کہنے کو نہیں تو کیا فائدہ۔ گوئی کہانی کو کوئی کیا کرے۔ پھر یہ بھی ہے کہ کہانی چیخ کر نہ بولے۔ لب نہ کھولے۔ آنکھ سے بولے۔ اکھ نال گل کر گئی۔

کئی ایک دن سے میں کہانی کی تلاش میں تھا۔ کیا لکھوں۔ کس موضوع پر لکھوں۔ ایسی بین بجاؤں کہ سانپ نکل آئے۔ وہ ہنسا بولا ”بغل میں کٹورہ“

”کہاں ہے کٹورہ؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم اس موضوع پر کیوں نہیں لکھتے؟ سارے لکھاڑ اس پر لکھتے ہیں۔ آج کے دور کا من بھاتا موضوع ہے۔ آج کے بوٹے پر لگا ہوا پھل ہے۔“

میں نے مڑ کر دیکھا درختوں کے پیچھے کچی آبادی تھی۔ انتظامیہ نے اسے درختوں اور دیواروں کے پیچھے چھپا رکھا تھا تاکہ دودھ میں مکھی ہوئی دیکھ نہ لے۔

میں سڑک کے نیچے اتر گیا۔ درختوں کے جھنڈ سے دیکھا۔ وہاں بیس تیس جھونپڑے تھے۔ دو روپہ مکانوں کے درمیان کھلا میدان تھا۔ میدان میں یہاں وہاں چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ لوگ بیٹھے تھے۔ حقے چل رہے تھے۔ بچے چار پائیوں کے ارد گرد دوڑ رہے تھے۔ چنچ رہے تھے۔ چلا رہے تھے۔ عورت اوپن ایئر باورچی خانوں میں چولہوں پر ہانڈیاں چڑھائے بیٹھی تھیں۔ ہاتھ چل رہے تھے۔ چوڑیاں چھنک رہی تھیں۔ باتیں ہو رہی تھیں۔

”اے باؤجی“ قریب ہی آواز آئی۔ دیکھا تو پاس ہی ایک بڑھا بیٹھا جوتے گانٹھ رہا تھا۔ ”کس سے ملنا ہے؟“ مجھے اس نے پوچھا۔

”کسی سے بھی نہیں۔“

”پھر کیا دیکھ رہا ہے تو؟“

”دیکھ رہا ہوں، کتنی غربت ہے، کتنا دکھ ہے۔“

”کہاں ہے دکھ؟“ وہ بولا ”یہاں تو میلا لگا ہوا ہے۔ بابو جا۔ سارے اسلام آباد کا چکر لگا۔ گھوم پھر کے دیکھ۔ کہیں بھی ایسا میلہ نہیں لگا ہوگا۔ سب کمروں میں بند ہیں۔ نہ بول نہ بلارہ۔ بو ہے بند ہونٹ بند دل بند۔“

اور بابو یہ کچی آبادی جو تو دیکھ رہا ہے۔ یہ آبادی نہیں ہے۔ یہ تو ایک کنبہ ہے۔ ایک کو پیڑ ہووے تو دو جا درد سے ہائے ہائے کرے ہے۔ ایک کا چولہا نہیں جلے ہے تو دو جا ہانڈی میں ایک مٹھ دال اور ڈال لے ہے۔ تو غربت کو کیا سمجھے ہے بابو۔ غربت میں لوگ اک دو بے کے نیڑے آ جاویں ہیں۔ امارت میں دور ہٹ جاویں ہیں۔ اور تجھے پتہ ہے بابو۔ پاکستان پر کیا پتا پڑی ہوئی

ہے۔ ہمیں جنے کی ضرورت تھی اس سے زیادہ مل گیا ہے۔ زیادہ مل جائے تو شر جاگ اٹھتے ہیں۔ فساد کے بلبلے پیدا ہو جاویں ہیں۔

”تو مسلمان ہے کیا؟“ بڈھے نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”پھر تو اس کو جانتا ہے؟“

”کس کو؟“

”وہ جو سب سے بڑا بندہ تھا۔ جو اللہ کا پیارا تھا۔ اللہ نے کہا میرے پیارے بندے بول تو کیا چاہتا ہے۔ تو جو مانگے گا ملے گا۔ جو چاہے گا ہوگا۔ بتا امارت میں رہنا چاہے گا یا غربت میں۔ اس نے غربت مانگ لی۔ غربت میں کوئی صفت ہوگی تو اس نے غربت مانگی۔“

مایوس ہو کر میں چل پڑا۔ کہانی کی ڈھونڈ میرے سر پر جنون بن کر سوار تھی۔ چلتے چلتے میں رک گیا۔ وہ بھی رک گیا۔ میرے سامنے وہ کھڑی تھی۔

گلاب کا ایک بوٹا اوپر ایک ڈوڈی۔ ادھ کھلی ادھ بند۔ ادھ گلابی ادھ ہری۔ ہونٹ بند تھے۔ آنکھیں باتیں کر رہی تھیں۔ انگلیوں سے میگنٹک لہریں نکل رہی تھیں۔

”آؤ“ وہ بولی ”میں ہوں وہ کہانی جسے تم ڈھونڈ رہے ہو۔“

”اوہوں مت جاؤ مت جاؤ۔“ میرا ساقھی زیر لبی میں بولا ”اس کی کہانی تو تم سا لہا سال سے لکھ رہے ہو۔“

”میری کہانی؟“ وہ بولی ”سبھی لکھی رہے ہیں۔ نہ جانے کب سے لکھ رہے ہیں لیکن کوئی لکھ نہیں پایا۔“

اگر میری کہانی لکھی جاتی تو آج میں صرف آرائش و زیبائش نہ سمجھی جاتی۔ میری حیثیت دیکھن دکھن تک محدود نہ ہوتی۔ تیرے بھائی بند مجھے خوش وقتی نہ سمجھتے۔“

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ مجھے سب باہر سے دیکھتے ہیں۔

کسی نے میرے اندر جھانک کر نہیں دیکھا۔ کسی نے مجھے نہیں جانا۔

وہ خاموش ہو گئی۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

دفعتاً اس نے سر اٹھایا اور میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

”میں تجھے جانتی ہوں۔“ وہ بولی ”تو ایلی ہے نا۔ میں ایلیں ہوں۔ سنا تو نے“ میں ایلیں ہوں۔“

اس نے ایک پوز بنایا اور یوں کھڑی ہو گئی جیسے مٹھاس کی ایک پھوار ہو۔

مجھے ایسے لگا جیسے ورق میں لپٹی ہوئی مصری کی ڈالی ہو۔ جی میں آیا کہ منہ میں ڈال کر چوس جاؤں۔ دفعتاً میرا ساتھی بولا ”ہوش کر“ میرا تو منہ ہی نہیں۔ جب تھا تب جرات نہ تھی۔ اب خالی جرات کا جھنجھنا بجانے سے فائدہ؟“

”دیکھا“ وہ بولی ”مجھ میں دونوں روپ ہی۔ دیوی بھی ہوں، ناری بھی ہوں۔ انگاروں سے بھسم بھی کر سکتی ہوں، سوکھے کو ہر ابھی کر سکتی ہوں۔ میں تیری کہانی ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے تو کسی اور پر کہانی نہیں لکھ سکتے۔“

”میں لکھوں گا تجھ پر کہانی۔“ میں نے کہا۔

”رک جا۔“ میرا ساتھی بولا، اس نے میرا بازو تھام لیا۔

”بے شک، یہ رنگ رس بھری کہانی ہے لیکن یہ ایسی کہانی ہے جسے صرف بتا جاسکتا ہے، لکھا نہیں جاسکتا۔ تو بیٹے میں کھوجائے گا“ لکھنے کا ہوش نہیں رہے گا۔“

شام پڑ چکی تھی۔ پتہ نہیں شام اتنی اداس کیوں ہوتی ہے۔ مدھم اداسی، میٹھی اداسی۔ ایسے لگتا ہے جیسے شام نے بال بکھیر رکھے ہیں۔ چہرہ سا ہوا ہو۔ انتظار۔ مایوسی بھر انتظار۔

راگ ودھیا والوں نے شام کے راگ میں آگ لگا رکھی ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ وہ تو بڑے سیانے ہیں۔ پر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے شام آگ نہیں، سلگن ہے۔ مدھم سلگن جیسے دیئے میں تیل نہ رہا ہو۔ سوکھی بتی سلگ رہی ہو۔

دکان میں اندھیرا گاڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک بتی سلگ رہی تھی۔ وہ تجوری کھولے بیٹھا گن رہا تھا۔

میرا ساتھی بولا ”رک جاؤ اس سیٹھ کو دیکھ رہے ہونا“

”دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم نے اس پر کبھی کہانی نہیں لکھی۔“

”اس کی کوئی کہانی ہو تو لکھوں۔“

”سبھی لکھتے ہیں۔“

”ہاں لکھنے ہیں پر وہ کہانی نہیں ہوتی۔ غم و غصے کا اظہار کہانی نہیں ہوتی۔ کہانی نعرے نہیں لگاتی۔ اودھم نہیں مچاتی۔ اشتعال پر

نہیں ابھارتی۔ مزاحمت کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتی۔

کہانی تو ایک چھوٹا سا چشمہ ہوتی ہے۔ جو دھرتی سے ابلتا نہیں۔ رستا ہے۔ بوند بوند رستا ہے۔ ہمدردی کا چشمہ۔ دکھ بھرے لگاؤ کا چشمہ۔ بھیگ ہی بھیگ۔

”جھوٹ بولتے ہو۔“ اس نے مجھے ڈانٹا۔ ”تمہاری کسی کہانی میں بھیگ نہیں ہوتی۔ سوکھی کاٹھ۔“

”سچ کہتے ہو، میں اپنی کسی کہانی میں بھیگ پیدا نہ کر سکا۔ قاری کو بھگو نہ سکا۔ لاکھ کوششیں کیں پر بات نہ بنی۔ بیسیوں لکھیں پر کہانی نہ لکھ سکا۔“

”جھک مارتے رہے۔“ وہ بولا۔

”نہیں جھک نہیں مارا۔“

”تو پھر۔۔۔۔۔“

”چٹکیلی باتیں کرتا رہا۔ دکھاوے کی باتیں۔ توجہ طلبی کی باتیں۔ پھلجڑیاں چلاتا رہا۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔

اپنی ڈگڈگی بجاتا رہا۔ کہانی اپنی بات نہیں ہوتی۔ وہ بولا ”دوجوں کی بات ہوتی ہے۔ کیا تم اپنی بات کرنے سے بھی نہیں اکتائے؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”اب بھی تو کہانی کے پردے میں تم اپنی بات کر رہے ہو۔ سیٹھ کی بات کیوں نہیں کرتے۔“

”کیوں کہتے ہو کہ اس میں کوئی کہانی نہیں ہے۔“

”یہ تو دولت کا قیدی ہے۔ دولت نے اسے ہائی جیک کر رکھا ہے۔ اس بے چارے میں تو میں بھی نہیں رہی۔ دل کی جگہ پیسہ تک

تک کر رہا ہے۔ دنیا سے بھی گیا۔ خود سے بھی گیا۔ بے چارہ مظلوم۔“

”اس کی مظلومیت پر کہانی لکھو۔“

”نہ نہ نہ۔“

”کیوں کیا لکھ نہیں سکتے؟“

”لکھ سکتا ہوں۔“

دیکھن دکھن

لڑکیوں کا آخری ٹولہ کٹیا سے نکلا۔ ٹیلے سے نیچے اترتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے کتر کتر باتیں کر رہی تھیں۔ شوخیاں کر رہی تھیں۔ فضا ان کے قہقہوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور تھیں۔ لگتا تھا۔ جیسے دکھ درد سے قطعی طور پر ناواقف ہوں۔ لیکن جب وہ باری باری ہاتھ دکھانے کے لئے اکیلے میں جگن جوتشی سے ملتی تھیں، تو دکھ سے بھگی ہوتیں۔

ایک آہ بھر کر کہتی۔ ”جوتشی جی، دیکھو تو میرا بیاہ ہوگا یا زندگی یونہی اکیلے میں بسر ہوگی۔“ دوسری کہتی ”کیا وہ مجھے مل جائے گا جسے میں چاہتی ہوں۔“ کوئی اپنے مجازی خدا کی بے وفائی کی کتھا سناتی۔ کوئی ظالم سماج کار و ناروتی۔ کوئی سخت ماں باپ کا۔

جگن جوتشی سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ مل بیٹھنے میں تو زندگی شوخی سے بھرپور ہوتی ہے لیکن اکیلے میں دکھ سے چور چور۔ یہ کیا بھید ہے۔ سوچتے سوچتے وہ کٹیا سے باہر نکل آیا۔

سامنے بچ پر بنواری بیٹھا تھا۔ ٹھوڑی ہاتھ میں پکڑے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا۔ ارے یہ کس سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ تو جذبے کا غلام ہے۔ اسے سوچ سے کا واسطہ۔

پندرہ بیس دنوں کی بات ہے کہ بنواری اپنی قسمت کا حال جاننے کے لئے جگن جوتشی کی کٹیا میں آیا تھا۔ اس نے ایک انوکھا سوال پوچھا تھا۔ کہنے لگا ”جوتشی جی میرا ہاتھ دیکھ کر یہ بتاؤ کہ مجھے کوئی ایسی زنانی ملے گی جو جیسی دکھتی ہو ویسی ہی ہو۔ میں اس زنانی کو ڈھونڈ میں ہوں۔“ اس سوال پر جگن حیران ہوا۔ ایسی بات تو کسی نے کبھی پوچھی نہ تھی۔ جگن نے غور سے بنواری کا جائزہ لیا۔ وہ ایک خوبصورت جوان تھا۔ لیکن اس کا حسن پوری طرح سے دکھتا نہ تھا۔ بن ٹھن سے بے نیاز، منہ ان دھلا بال بکھرے ہوئے۔ موٹا لباس۔

جگن جوتشی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس گاہک سے کیسے نمٹا جائے۔ اس نے سوچا کہ کنفیوژڈ آدمی ہے۔ اسے مزید کنفیوژڈ کر دوں تو شاید بات بن جائے۔ بولا ”پہلے یہ بتا کہ تیرے دیکھن میں خرابی ہے یا اس کے دکھن میں۔“

”نہ نہ نہ“ بنواری نے کہا۔ میرے دیکھن میں تو خرابی نہیں، میں عینک لگا کر نہیں دیکھتا۔ سارا جھگڑا زنانی کے دکھن کا ہے۔“

جگن بولا ”بھائی میرے دیکھن اور دکھن کچھڑی سامان نہیں ہوتے کہ دال الگ کر لو اور چاول الگ۔ وہ تو شربت سامان ہوتے ہیں۔“

بیٹھا اور پانی یوں گھل مل جاتے ہیں کہ الگ نہیں ہو سکتے۔“ جگن نے اسے کنفیوژ تو کیا مگر ساتھ بہلا یا بھی۔ جیسے ہر جوتشی پر گاہک کو بہلانا لازم ہوتا ہے۔ آخر میں جگن بولا۔ ”تجھے ایسی عورت ضرور ملے گی جو ویسی ہی ہوگی جیسے دکھے گی اور تم دونوں ہنسی خوشی دن گزارو گے۔“

”کب ملے گی؟“ وہ بولا ”میں تو پانچ سال سے گلیوں اور محلوں میں در بدر ہورہا ہوں لیکن آج تک نہیں ملی۔“

”مل جائے گی، جلدی مل جائے گی۔“ جگن بولا ”پر تو در بدر کیوں ہوتا ہے؟ یہاں آ کر بیٹھا کر۔ یہاں عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔“

”اچھا“ بنواری بولا ”پر یہاں بیٹھ کر کروں گا کیا؟“

”کرنا کیا ہے۔ در بدر ہو کر نہیں بیٹھ کر ڈھونڈ۔ میرا بالکا بن جا۔ جو عورت آئے اس کا انٹرویو کر۔ اسے پوچھ کہ وہ چاہتی کیا ہے۔ پھر اس کی پرچی بنادے اور میں صرف سے ملوں گا جس کے ہاتھ میں تیری دی ہوئی پرچی ہوگی۔“

بنواری کی باچھیں کھل گئیں۔

جگن نے بات پکی کرنے کے لئے کہا۔ ”اور جس روز تجھے وہ مل جائے بے شک لے جانا۔“

”بول تیری فیس کیا ہے؟“ بنواری نے پوچھا۔

”او نہوں“ جگن بولا ”کبھی بالکے سے بھی فیس لیا کرتے ہیں؟“

”عجیب آدمی نے بنواری“ جگن نے سوچا۔ ”پر یہ کس سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ جگن بنواری کے قریب جا بیٹھا۔ بولا ”کس سوچ میں پڑا ہوا ہے تو؟“

بنواری نے ٹھنڈی آہ بھری۔ بولا ”اپنے نصیبے میں تو سوچیں ہیں۔“

”کیوں؟ کیا پیسے کی تنگی ہے؟“

”نہیں جوتشی پیسہ تو بنواری کے ہاتھ کا میل ہے۔ جتنا چاہوں کمالوں۔ کل رات تین سو کمایا تھا۔“

”کیا کام کرتا ہے تو؟“

”چھابڑی لگاتا ہوں۔ دو گھنٹے میں سارا مال بک جاتا ہے۔ چاہے جتنا بناؤں۔ اللہ کا کچھ ایسا کرم ہے کہ گاہک انتظار کرتے ہیں کہ کب بنواری چھابڑی لگائے۔“

”کیا بنانا ہے تو؟“ جگن نے پوچھا۔

”پہل کلفی بنانا تھا۔ پھر ایک رات خواب میں ایک بابا کو دیکھا۔ بابا نے کہا، دیکھ بنواری، وہ چیز نہ بنا جس کی مانگ گھٹ رہی ہے۔ وہ بنا جو فیشن میں ہے۔ میں نے کہا، کیا بناؤں؟ بابا بولا۔ تجھے خود پتہ لگ جائے گا۔“ پھر پتہ لگا کیا؟“ جگن نے پوچھا۔

بنواری بولا ”اگلے دن جی اداس تھا۔ باہر جانے کا موڈ نہ تھا۔ بل ٹاپ پر ہوٹل کا بیرا ادھر سے گزرا تو میں نے کہا۔ یار کچھ کھانے کو بھیج لڑکے کے ہاتھ۔ باہر جانے کا موڈ نہیں ہے آج۔ تو اس نے برگر بھیج دی۔ اسے کھانے لگا تو بابا کی بات یاد آ گئی۔ فٹ اسے کھول کر دیکھا کہ کیا کیا مصالحہ پڑا ہے اس میں۔ پھر ایک ہفتہ برگر بناتا رہا آخر زمانے کے لئے۔ پہلے روز چھابڑی لگائی تو گوروں کے بچوں نے بھیڑ لگا دی۔ ہوٹل والے بیس روپے لیتے تھے میں نے دس کا لگا دیا۔ جوتھی! پیسے کا معاملے میں اللہ نے مجھے دین دے رکھی ہے کہ جتنا چاہے کمالے۔ پر کمائی کا فیدہ؟ جب گھر ہی نہ بنا تو کمائی کس کام کی؟“

”پرتو اتنا مایوس کیوں ہے؟“ جگن نے پوچھا۔

”تجھے نہیں پتہ جوتھی کہ میں وہ بوٹ ہوں جو آٹھنے سے گر پڑا ہے۔ اور جو آٹھنے سے گرا وہ سدا رہے گا۔“

”یہ پہیلیاں کیوں بھجوا رہا ہے مجھ سے؟ مجھے بتا کہ تیرے ساتھ کیا بیٹی؟“ ”کیا بتاؤں جوتھی، پہلا قدم ہی غلط پڑا۔ یوں سمجھ لے کہ پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھ دی۔ اب جو اس پر مینار بناؤں تو وہ ٹیڑھا ہی ہو گا نا۔“

”تجھے محبت ہو گئی کیا؟“ جوتھی نے پوچھا۔

”ہاں، بری طرح گھائل ہوا۔ پر میری بد قسمتی۔ کسی جیتی جاگتی زنانی سے گھائل ہوتا تو نہ لیتا، کسی نہ کسی طرح۔ پر وہ زنانی تو وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔“

”ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ جگن بولا۔

”ارے یہی تو ہوا۔“ بنواری نے جواب دیا۔ ”وہ زنانی نالک میں جیتی تھی۔ جب جب نالک چلاتا۔ وہ اٹھتی بیٹھتی۔ چلتی پھرتی۔ بولتی چالتی تھی۔ نالک ختم ہو جاتا تو ساتھ ساتھ وہ بھی ختم ہو جاتی۔ پر جوتھی، میری عقل پر پتھر پڑ گئے۔ میں سمجھا کہ جو لڑکی نالک میں کماری بنتی ہے، وہی کماری ہے۔ بس جی اس کے مکان کے پھیرے لیتا رہا۔ بڑا اھمیل ہوا۔“ بنواری چپ ہو گیا۔ دیر تک وہ بیٹی ہوئی باتوں کو پھر سے بتاتا رہا۔

جگن سمجھ گیا کہ بنواری پھوڑا بنا بیٹھا ہے۔ اسے چھیڑنا اچھا نہیں۔ جگن خود زخم خوردہ تھا۔ اسے پتہ تھا کہ جوانی کی بھول کا زخم زندگی

بھروسہ رہتا ہے۔ اس لئے وہ بھی چپ بیٹھا رہا۔ صدیاں بیت گئیں۔

پھر بنواری نے سراٹھایا۔ آہ بھر کر بولا۔

”اگر وہ مجھے نہ ملتی تو اچھا ہوتا۔ ملی تو ایک ہی نظر میں پتہ چل گیا کہ وہ تو رنڈی ہے، کماری نہیں۔ اور رنڈی بھی دو ٹکے والی۔ مردار جس کے پنڈے پر گدھوں کی چونچوں کے نشان تھے۔ بس سمجھ میں آ گیا کہ کماری اور ہے روزی اور ہے۔ اور کماری تو وجود ہی نہیں رکھتی۔ اسے کیسے ڈھونڈوں؟“ وہ پھر خاموش ہو گیا۔

ٹیلے کے ارد گرد کی بتیاں بجھ گئی تھیں۔ ہوا چلنے لگی تھی۔ رات نے اپنا کالا تمبوٹان لیا تھا۔ مال روڈ کی فیشن پریذ ختم ہو چکی تھی۔ صدیاں بیت گئیں۔ وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر بنواری نے سر اٹھایا اور اپنی ہی لگن میں گنگنانے لگا۔ پھر آہ بھر کر بولا ”ناک میں کماری اک گیت گا یا کرتی تھی۔۔۔۔۔ کا مکھ لے گھر جاؤں“

وہ اپنی بھدی مگر بیگی آواز میں مکھڑے کو گنتنا تا رہا۔ بس یہ گیت جب وہ گاتی تو سمجھو میں مرجاتا تھا۔ روز نائک دیکھتا۔ روز مرتا۔ پھر اک دن نائک یہاں سے چلا گیا اور جاتے ہوئے مجھے یہ بول دے گیا۔ دو سال میں یہ بول گنتنا تا پھرا۔ پاگلوں کی طرح گلیوں میں۔ ایک دن جب میں تھک کر بنگلے کی ایک کھڑکی کے نیچے سستا رہا تھا تو کیا سنتا ہوں کہ بنگلے میں کوئی یہی بول گنتنا رہی ہے۔ سن کر میں تو پاگل ہو گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے کماری میں جان پڑ گئی ہو۔

بنگلے کے چوکیدار سے ملا۔ پتہ چلا کہ بنگلے میں کوئی وڈیرا اور اس کی بیگم رہتے ہیں۔ میں نے چوکیدار کی منتیں کیں کہ ایک بار مجھے بیگم سے ملا دے۔ وہ نہ مانا۔ پھر میں نے اس کی مٹھی گرم کی اور وہ مان گیا۔

بیگم باہر دروازے پر آ گئی۔ غصے میں بولی۔ کون ہے اور تو کیا چاہتا ہے؟ میں نے کہا، بیگم صاحبہ! غصہ نہ کھائیں۔ میں کچھ نہیں کہتا۔ ابھی ابھی جو گیت آپ گنگنا رہی تھی، میں اس گیت کا دیوانہ ہوں۔

”پھر میں کیا کروں؟“ وہ غصے سے بولی۔

جو تو کبھی کبھی یہ بول گنگنا دیا کرے تو میرا جیون پھل ہو جائے۔ غصے میں لوٹ جانے کے لئے مڑی تو میں نے منت کی۔ میں نے کہا، دیکھ میں ہنگلے میں نہیں آؤں گا۔ باہر کھڑکی تلے بیٹھ کر سن لیا کروں گا۔ تیری مہربانی ہوگی۔ تو صرف اک بار گنگنا دیا کر روز کے روز۔ حسہ نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ اس کا نام حسہ تھا۔ پورا ایک ہفتہ میں نے اس کی کھڑکی کے نیچے بیٹھ کر گزار دیا۔ لیکن اس نے مجھے گھاس نہ ڈالی۔“

بنواری نے ایک لمبی آہ بھری۔ بولا ”پھر اسے مجھ پر ترس آ گیا۔ ایک روز وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی اور۔۔۔۔۔۔“ کا کھلے گھر جاؤں“ گنگناتنے لگی۔ اتنا بھیگ کر گایا کہ میرا دل ڈوب گیا۔

پھریوں ہوا کہ جب بھی میں وہاں پہنچتا۔ کھڑکی بجا دیتا اور وہ گیت سنا دیتی۔ پھر وہ کھڑکی کھول کر مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ اور ایک دن جب وڈیرا شہر سے باہر گیا ہوا تھا، اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ باتیں کرتی رہی۔ اس روز مجھے پتہ چلا کہ وہ بیگم نہیں ہے۔ وڈیرے نے اسے گھر میں ڈال رکھا ہے۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ جی چاہا کہ اسے کچھ دوں۔ دو دن شہر میں گھوم پھر کر میں نے اس کے لئے ایک ہار خریدا۔

ہار کو دیکھ کر حسد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولی ”نہ بنواری“ تو تو ایسے نہ کر جیسے دوسرے مرد کرتے ہیں۔ تو پہلا مرد ہے جس نے مجھے دیکھا نہیں، محسوس کیا ہے۔ جانا ہے۔ تو نے اس حسد کو جانا ہے جسے کسی مرد نے بھی نہیں جانا تھا۔ تو نے تو مجھے یہ بات بھلا دی ہے کہ میں بکاؤ مال ہوں۔ تو مجھے تحفے دینا اچھا نہیں لگتا۔“

”جوتشی۔۔۔۔۔“ بنواری بولا ”دومہینے ہم ملتے رہے۔ روز کے روز۔ وہ بھی کیا دن تھے۔“ آہ بھر کر پھر خاموش ہو گیا۔

”ایک دن وہ بڑے پیار سے کہنے لگی۔ ”بنواری کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہے۔ تجھے مجھ میں کیا نظر آتا ہے؟“

میں نے کہا ”کچھ نظر آتا ہی ہے تو شمار ہو رہا ہوں۔“

بولی ”دیکھ بنواری‘ میں وہ نہیں ہوں جو تجھے دکھتی ہوں۔“

میں نے کہا ”کیوں نہیں وہ تو؟“

بولی ”صرف میں ہی نہیں، کوئی عورت بھی وہ نہیں جو دکھتی ہے۔“

”پر کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتہ کیوں۔ عورت دکھن پر مجبور ہے۔ کوئی اس کے اندر لٹھ لئے بیٹھا ہے۔ کہتا ہے دکھ اکٹائی ہوئی بیٹھی خود کو نہ دکھانا

جائے۔ پھر بھی دکھنے پر مجبور کر دی جاتی ہے اور اکیلی بیٹھی ہو تو بھی زبردستی ہونٹوں پر مسکان آ جاتی ہے۔“

پھر جب وہ آخری بار مجھ سے ملی تو کہنے لگی ”بنواری“ تو واحد مرد ہے جو مرد بن کر مجھ سے نہیں ملا۔ مجھے دیکھن دکھن کے چکر میں نہیں ڈالا۔“

میں نے کہا ”دیکھ حسنی“ میں نے اس روز پہلی بار اسے حسنی کہہ کر بلا یا تھا۔ ”حسنی میں نے کبھی تجھے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ میں تو

آنکھیں بند کر کے تیرے پاس بیٹھ جاتا ہوں اور مجھے لگتا ہے جیسے میرے قریب کوئی ہے۔ کوئی میرا ساتھ دے رہی ہے۔ گھر پر بھی جب میں بیٹھتا ہوں تو تو ساتھ ہوتی ہے۔ میں تو کبھی اکیلا نہیں ہوا ان دنوں۔“ جواب میں وہ بولی ”بنواری تو تو میری ہڈیوں میں بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں میں تیرے بغیر رہ بھی سکوں گی یا نہیں۔ اگر تو دیکھن دکھن کا چکر چلا دیتا تو میری ہڈیوں میں نہ بیٹھتا۔“

مجھے نہیں پتہ تھا کہ حسنی آخری بار مجھ سے مل رہی ہے۔“ بنواری نے آہ بھر کر کہا۔ ”اگلے روز میں بنگلے پر گیا تو بنگلہ خالی پڑا تھا۔ پھر آوارہ پھرتے پھرتے میں تیرے پاس آیا۔ میں نے سوچا۔ چلو جوتشی سے پوچھ دیکھو۔ تو نے میرا حوصلہ بندھایا کہ وہ ضرور ملے گی۔ تو میں اس آس کی دھونی رما کر یہاں بیٹھ گیا۔“

اس نے ایک لمبی آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔ دیر تک دونوں یونہی بیٹھے رہے۔

دفعۃً جلگن چلا یا۔ نہیں نہیں نہیں، جیسے اسے کسی نے زبردستی بولنے پر مجبور کر دیا ہو۔ ہنواری چونکا ”کیا نہیں؟“

”میں بھی وہ نہیں۔“ جگن بولا ”جو تجھے دکھتا ہوں“ میں جوتشی نہیں ہوں۔ مجھے نہیں پتہ کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ مجھے نہیں پتہ کہ ہاتھ کی لکیریں کیا کہتی ہیں۔ میں نے جوتشی کا سوانگ بھر رکھا ہے۔ میں تو لوگوں کو وہ کچھ بتاتا ہوں جو وہ سننا چاہتے ہیں۔ تیرا دل رکھنے کے لئے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ تجھے ضرور ملے گی۔“ یہ سن کر بنواری کو دھچکا لگا۔ بولا ”جو یہ بات ہے تو میں یہاں کس آس پر بیٹھا ہوں۔“

[illegible]

اے دیکھتے ہی تن من و دھن سے اس کا ہو گیا۔ وہ بھی میری ہو گئی۔ ہم روز ملتے تھے۔ ایک سال بعد اس نے میری بات مان لی۔ وہ میری ہو گئی۔ ہم نے بیاہ کر لیا۔ ایک سال ہم اکٹھے رہے یوں جیسے دو بچل کر کھیلتے ہیں۔

پھر ایک دن وہ مجھے چھوڑ کر دو بجے کے ساتھ چلی گئی۔ پیچھے ایک رقعہ چھوڑ گئی۔ لکھا تھا: ”اب میں نے جانا ہے کہ تو“ وہ“ نہیں ہے جو دکھتا ہے۔ میں نے دیکھن میں بھول کی۔ میں جا رہی ہوں۔ میرا پیچھا نہ کرنا۔“ جگن خاموش ہو گیا۔ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر جگن نے بات شروع کی۔ بولا ”ماں نے کہا“ بیٹے میں تیرا دو جا بیا بن کر دیتی ہوں۔ گھر بسا کر بیٹھ جا۔“ میں نے کہا ”نہیں ماں“ میرا دل ٹھکانے پر نہیں رہا۔ مجھے جانے دو۔ آوارہ پھروں کا تو شاید دل ٹھکانے لگ جائے۔ پھر گاؤں کا بابا فقیر آ گیا۔ ماں نے

اسے ساری بات سنائی۔ کہنے لگی ”بابا“ اسے سمجھا کہ یہ بیاہ کر لے۔ گھر بسالے۔ در بدر نہ پھرے۔“ بابا فقیرانہ ساری بات سن کر سر جھکا لیا۔ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا ”نہ بی بی اسے نہ روک۔ اسے جانے دو۔ شاید باہر جا کر دیکھن دکھن کے چکر میں پھنس جائے۔ جب تک یہ دیکھن دکھن کے چکر میں نہیں پھنسے گا“ آباؤ نہیں ہوگا۔“

”بابا“ میں نے پوچھا۔ ”یہ دیکھن دکھن کا چکر ہے؟“

بولا ”پتر یہ دیکھن دکھن کا چکر اک پردہ ہے۔“

”پردہ کس کا پردہ؟“

بولا ”پتر وہ جو ڈال ڈال پات پات میں دکھتا ہے۔ جو ذرے ذرے میں دکھتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ہم اسے دیکھیں۔ اس لئے اس نے ہمیں دیکھن دکھن کے چکر میں ڈال رکھا ہے کہ ہمارا دھیان ادھر لگا رہے۔ ادھر نہ جائے۔“

”اور جس کا دھیان دیکھن دکھن کے چکر سے نکل جائے اسے کیا ہوتا ہے بابا؟“

”جو دیکھن دکھن کے چکر سے نکل جاؤ تو پھر کچھ نہیں رہتا۔ نہ میں رہتا ہے نہ تو۔ نہ دکھ نہ سکھ۔ نہ روشنی نہ اندھیرا۔ کچھ بھی نہیں رہتا۔ صرف وہ رہ جاتا ہے۔ صرف وہ۔“ جگن کی بات سن کر بنواری کی گردن لٹک گئی۔ اسے ایسے لگا جیسے کچھ بھی نہ رہا ہو۔ کچھ بھی نہیں۔

عین اس وقت روشنی کی ایک کرن چمکی۔ کوئی آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ بنگلے کا چوکیدار بنواری کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بولا ”یہ تجھے شام سے ڈھونڈ رہی ہے۔“ حسہ بنواری کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ بولی ”بنواری میں آ گئی۔ آئے بغیر رہا نہ گیا۔ مجبور ہو گئی۔ اب تو جان نہ جان۔“ وہ بچ پر بیٹھ گئی۔ بولی ”میں نے خود کو بہت سمجھایا کہ نہ جا۔“

”کیوں؟“ بنواری نے پوچھا۔

حسہ نے اپنا سر بنواری کے کندھے پر رکھ دیا اور گنگنانے لگی۔

”کاکھ لے گھر جاؤں“

اس کی آواز میں اتنی بھیگ تھی کہ یوں لگا جیسے ٹیلے پر بوندیاں برس رہی ہوں۔



چوہا

اس بنے سچے آرام دہ کمرے میں ہم دو تھے۔ لیکن دونوں ہی اکیلے تھے۔ اگر ہم دونوں اکیلے اکیلے ہوتے تو یقیناً اس قدر اکیلے نہ ہوتے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ بہت دور۔ وہ مجھ سے بیزار تھی۔ میں اس سے بیزار تھا۔ چالیس سال ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے آئے تھے۔

چالیس سال پہلے ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی، عشق تھا۔ ایک دوسرے کے بغیر دم نکلتا تھا۔ مجھے ایک فکر دامن گیر تھا، اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں کیا کروں گا۔ اسے ایک غم تھا، اگر ناپ نہ ہو تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ خوش قسمتی سے بات بن گئی۔ ہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ایک پھلجڑی سی چل گئی۔ پھر کئی ایک سال ہم محبت میں لت پت رہے، لت پت وہ میرے لئے جیتی تھی، میں اس کے لئے جیتا تھا۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ آہستہ آہستہ اسے پتہ چلتا گیا کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھتی تھی کہ ہوں۔ آہستہ آہستہ مجھ پر انکشاف ہوتا رہا کہ اس کی کچھ عادتیں ناقابل برداشت ہیں۔ پھر جھگڑے شروع ہو گئے۔ کئی ایک سال ہم ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ لڑتے جھگڑتے رہے۔ یہ صورت حال اس قدر بڑھ گئی کہ لڑنے جھگڑنے کے سوا ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی سروکار نہ رہا۔

اور اب اب ہم دونوں بوڑھے ہو چکے ہیں۔ لڑاؤ، جھگڑا، جھگڑ کر تھک گئے ہیں۔ اب اتنا تعلق بھی نہیں رہا کہ ایک دوسرے سے لڑیں جھگڑیں۔ اب ہم ایک دوسرے کو برداشت کر رہے ہیں۔ وہ مجھے گوارا کر رہی ہے۔ مجبوراً میں اسے گوارا کر رہا ہوں۔ مجبوراً وہ کہتی ہے اس کا تو دماغ خراب ہے۔ یہ سمجھے گا؟ میں کہتا ہوں۔ اس کا تو دماغ سرے سے ہے ہی نہیں۔ سمجھانے کی کوشش عبث ہے۔

یوں ہم ایک دوسرے کے ساتھ لیکن ایک دوسرے سے دور گاؤں کی حویلی میں بڑے سکون سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ میرے پاس اسے کہنے کے لئے کوئی بات نہ تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنے کی روادار نہ تھی۔ دن میں دو ایک بار بات کرنے کی ضرورت پڑ جاتی۔ وہ آلو پھیلے ہوئے چاقو سے مخاطب ہو کر کہتی ”آلو میں بیٹنگن ڈال لوں۔“ میں شیو کرتے ہوئے استرے سے کہتا۔ ”ڈال“ اکثر بولنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ بات اشاروں کی مدد سے ہو جاتی۔ وہ بن بولے سمجھا دیتی۔ میں بن کہے سمجھا دیتا۔

اب جب سے ہم دونوں کراہی اپنی اپنے بیٹے سکندر کے گھر آئے ہیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ وہ

چپ چاپ اپنے بستر پر بیٹھ کر کھڑکی کو گھورتی رہتی ہے۔ میں کرسی میں بیٹھ کر نیچے سڑک پر چلنے والی ٹریفک کو دیکھتا رہتا ہوں۔ کتنا سکون ہے۔ کتنا اطمینان ہے۔

کے رابا کے کارے نہ باشد

پہلے ہم گاؤں میں رہتے تھے۔ تھی تو حویلی لیکن سالہا سال سے مرمت نہیں ہوئی تھی۔ ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ سکندر سے کئی بار مرمت کے لئے کہا۔ اس نے پروا نہ کی۔ بات ٹال دی۔ سکندر ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ گاؤں میں زیادہ دیر نہیں رہا۔ پہلے شہر میں پڑھنے کے لئے بورڈنگ میں رہا۔ پھر بڑا افسر بن گیا۔ بیوی بھی شہر کی ملی۔ اس نے ہم سے پوچھے بنا خود ڈھونڈ لی جیسے میں نے ڈھونڈ لی تھی۔ اور اب اس کی محبت میں لت پت ہو رہا تھا جس طرح میں ہوا تھا۔ سکندر اور اس کی بیوی دونوں کراچی میں صاحبوں کی طرح ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ بال بچہ ہے نہیں۔ بس ایک دوسرے میں ہی ڈوبے رہتے ہیں۔

گاؤں کی حویلی کے تین کمرے ٹھیک ٹھاک ہیں۔ وہاں ہم دونوں رہتے تھے۔ گاؤں سے ذرا فاصلے پر شور شرابے سے دور حویلی سے سو پچاس قدم پر سائیکس دروٹ کا مزار تھا۔ ہماری کھڑکیوں سے صاف نظر آتا تھا۔ انہیں چائیں چپ شاہ بھی کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کسی سے بات نہیں کی تھی۔ بس اشاروں سے ہی بات کہہ دیتے تھے۔ میں پیروں فقیروں کی نہیں مانتا لیکن دو ایک بار میں اتنا پتا لگانے کے لئے مزار پر گیا تھا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ سائیکس جی کا اصل نام دڑوٹ تھا۔ جو غلط العام ہو کر دروٹ بن گیا۔ سائیکس جی نے عمر دڑوٹی رکھی تھی۔ یہ جان کر مجھے سائیکس جی سے دلچسپی ہو گئی۔ اس لئے کہ ہم بھی سائیکس جی کی طرح دڑوٹی زندگی بسر کر رہے تھے۔

مزار پر ایک شخص باقاعدہ حاضری دیتا تھا۔ اور جھاڑ پونچھ میں لگا رہتا تھا۔ اس کا نام فضلا تھا۔ فضلا شہر میں رہتا تھا مگر جب بھی چھٹی ملتی، مزار کی طرف چل پڑتا۔ مجھے فضلے پر بڑا ترس آتا ہے۔ بے چارہ احمق خواہ مخواہ سائیکس کی لگن لگائے بیٹھا ہے۔ پھر ہم دونوں میں اور میری بیوی میں چوہے کی بات چل نکلی۔ ایسی چلی۔ ایسی چلی کہ سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ پتہ نہیں نہ وہ وہ رہی نہ میں رہا۔ چوہے کی بات ابھی چل ہی رہی تھی کہ سکندر آ گیا اور ہمیں زبردستی کراچی لے آیا۔

کراچی میں تین چار ہفتے تو ہم جگہیں دیکھنے میں مصروف رہے۔ ہوا بندر، منگھوپر، کیمڑی اور پتہ نہیں کیا کیا۔ لیکن آخر جگہیں ختم ہو گئیں۔ اور ہم اس بنی سبھی انڈے کی طرح چمکتی ہوئی فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔ سکندر اور اس کی بیگم صبح اپنے اپنے دفتر چلے جاتے۔ شام کو کوئی پارٹی یا ڈنر ہوتا۔ گھر میں صرف ہم ہوتے یا نوکر ہوتے۔

پھر وہ بنی سچی تنہائی کھلنے لگی۔ وہ کمرے کی سجاوٹ، وہ آرام زدہ صبح و شام، وہ تکلف، وہ رکھ رکھاؤ۔ وہ سب کچھ اک بوجھ بن جاتا۔ دم گھٹنے لگتا۔ گاؤں میں یہ بات نہ تھی۔ وہاں تنہائی تو تھی پر دم نہیں گھٹتا تھا۔ وہاں ہم دونوں اس قدر اکیلے نہ تھے۔ بے زاری اتنی گاڑھی نہ تھی۔

گاؤں میں وہ میرے لئے چائے بناتی تھی۔ کھانا پکاتی تھی۔ میں کبھی کبھار بازار سے سودا لے آتا۔ کراچی میں نہ کھانا پکانے کی بات تھی نہ سودا لانے کی۔ اس لئے ہم ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہو گئے تھے۔ میں سارا دن برآمدے میں بیٹھ کر نیچے چلتی ہوئی شاہراہ کا نظارہ کرتا رہتا۔ وہ پتہ نہیں اندر بیٹھی کیا کرتی رہتی۔

ایک دن جب میں سڑک کا نظارہ کر رہا تھا تو اس کی آواز سنائی دی۔ بولی ”شہروں میں چوہے نہیں ہوتے کیا؟“ میں نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔ وہ ٹائیلوں کے فرش پر نگاہیں گاڑھے بیٹھی تھی جیسے مجھ سے نہیں بلکہ ان سے پوچھ رہی ہو۔ چوہے کی بات سن کر میرا دل ڈوب گیا۔ ”لو یہاں بھی چوہا آ پہنچا۔ کتنی مشکل سے گاؤں میں اس سے جان چھڑائی تھی۔“

”ہوتے ہوں گے۔“ میں نے سڑک سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔
 دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس کی آواز آئی۔ ”یہاں تو چوہا نہیں آیا کوئی۔“
 ”یہاں نہیں آیا تو میں کیا کروں۔ یہ کیا میرا قصور ہے؟“ مجھے غصہ آ گیا۔ مڑ کر دیکھا۔ عابدہ گملے پر جھکی ہوئی تھی۔ یوں جیسے یہ سوال اس نے گملے سے کیا ہو۔

میں نے اپنے سلیپر کو مخاطب کر کے کہا۔ ”چوہا یہاں ٹانکوں میں بل کیسے بنائے۔“
 کمرے میں دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

پھر وہ چھت سے مخاطب ہو کر بولی ”بے شک بل نہ بنائے پر آئے تو سہی۔“
 اس پر مجھے بہت غصہ آیا۔ اس عورت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ جب گاؤں میں تھی تو کہتی تھی۔ ”چوہا کیوں آتا ہے؟“ اب کہہ رہی ہے چوہا کیوں نہیں آتا؟

گاؤں میں چوہے کی بات اچانک چل پڑی تھی۔ ہوا یوں کہ گاؤں میں ایک رات میں جاگا تو دیکھا کہ عابدہ چار پائی پر گھڑی بن کر بیٹھی ہے۔ میں نے سوچا، چلو بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے۔ اپنا کیا جاتا ہے۔ پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔
 ”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”خوفزدہ آواز میں بولی۔ ”چوہا ہے۔“

اس پر مجھے غصہ آ گیا۔ ”چوہا ہے تو پڑا ہے۔ گاؤں میں چوہا تو ہوگا۔“ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ رضائی لی اور پھر سے سو گیا۔ دوبارہ جاگا تو دیکھا کہ وہ جوں کی توں بیٹھی ہے۔

”سوتی کیوں نہیں؟“ میں نے کہا۔

”نیند نہیں آتی۔“

”کیوں نہیں آتی؟“

”ڈر لگتا ہے۔“

”ڈر کیسا؟“

”چوہا جو ہے۔“

”کیا کرے گا؟“

”کاٹ لے گا۔“

”لاحول ولا قوۃ..... یہ محترمہ سمجھتی ہے کہ اس کا گوشت اس قدر لذیذ ہے کہ چوہا اسے کاٹنے کے لئے اتنی دور سے چل کر آیا ہے۔“

اگلے روز اس نے مجھے ایک سوراخ دکھایا۔ کہنے لگی۔ ”چوہا یہاں سے آتا ہے۔“ میں نے اس سوراخ کے مطابق ایک پتھر تلاش کیا اور ہتھوڑے سے پتھر کو اس سوراخ میں ٹھونک دیا۔

”لو“ میں نے اسے مخاطب کئے بغیر کہا۔ ”اب چوہا نہیں آئے گا۔“

رات کو اس نے مجھے جگا دیا۔ بولی ”چوہا تو آیا ہوا ہے۔ ذرا سنو تو“

میں نے سنا۔ واقعی ٹک ٹک کی آواز آرہی تھی۔

اگلے دن اس نے ایک اور سوراخ ڈھونڈ لیا۔ بولی ”یہاں سے آتا ہے۔“ آٹھ دس دن ہم سوراخ ڈھونڈتے اور بند کرتے رہے۔ اس کے باوجود چوہا آتا رہا۔

پھر میں نے ایک ترکیب سوچی۔ میں نے کہا ”دیکھ چوہا تجھے کاٹنے کے لئے نہیں آتا بلکہ کچھ کھانے کے لئے آتا ہے۔ اگر

ڈیوڑھی میں کھانے کے لئے کوئی چیز رکھ دی جائے تو وہ نہ باورچی خانے میں جائے گا نہ ہمارے کمرے میں آئے گا۔“

اس نے میری بات مان لی۔ دو تین دن وہ سارے گھر میں بڑبڑ کرتی پھری۔ چوہا کون سی چیز خوشی سے کھاتا ہے۔ مجھے کیا پتہ کہ چوہا کیا کھاتا ہے۔ اس لئے میں خاموش رہا۔ تیسرے دن پتہ نہیں وہ کہاں سے سن آئی کہ چوہا پنیر بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ روز وہ رومال میں وہی باندھ کر لٹکا دیتی تاکہ شام تک پنیر تیار ہو جائے۔

اگلے روز صبح سویرے وہ دوڑی دوڑی آئی۔ بولی ”چوہے نے سارا پنیر کھا لیا ہے۔“ اس کے بعد جب بھی میں باہر نکلتا تو ڈیوڑھی میں چوہے کی تھالی کو غور سے دیکھتا کہ چوہے نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ رات کو آنکھ کھلتی تو کان لگا کر آواز سننا رہتا کہ چوہا ٹک ٹک کر رہا ہے یا نہیں۔

دس پندرہ دنوں کے بعد عابدہ منہ لٹکائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ بولی ”چوہا نہیں آیا۔“

”چوہا نہیں آیا؟“ میرے منہ سے نکل گیا۔ ”کیوں نہیں آیا؟“

”دیکھ تو“ وہ بولی ”روٹی اور پنیر ویسے ہی پڑے ہیں تھالی میں۔“

میں اٹھ کر ڈیوڑھی میں گیا۔ دیکھا تو چوہے کی تھالی پر ایک چڑیا بیٹھی ٹھونگے مار رہی ہے۔ میں نے عابدہ کو آواز دی۔ ”یہ دیکھو چوہے کا پنیر چڑیا کھا رہی ہے۔“

وہ دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ بولی ”کھانے دو بے چاری بھوکی ہے۔“

اس کے بعد روز صبح عابدہ مجھے آواز دیتی۔ ”چوہا آج بھی نہیں آیا۔“ انہی دنوں سکندر آگیا اور زبردستی کراچی لے گیا۔ کراچی میں آنے کے بعد چوہے کو بالکل بھول چکا تھا۔ اس روز اچانک اس نے چوہے کی بات چھیڑ کر مجھے پریشان کر دیا۔ دراصل میں اس بات پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ گاؤں میں اس نے چوہے کی بات چلا کر مجھے احمق بنایا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چوہے کی بات کا جواب نہیں دوں گا۔

دو روز وہ کس نہ کسی بہانے چوہے کی بات کرتی رہی مگر میں نے جواب نہ دیا۔ تیسرے دن وہ واپس گاؤں جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ سکندر نے بڑی کوشش کی کہ وہ رک جائے لیکن وہ نہ مانی۔ اگلے روز ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔ راستے میں وہ بار بار اپنے آپ سے کہتی رہی۔ ”چوہا ہماری راہ دیکھ رہا ہوگا۔“ لیکن میں نے جواب نہ دیا۔

اگلے روز ہم ریل گاڑی سے اسٹیشن پر اتارے جہاں سے تانگہ پر بیٹھ کر گاؤں جانا تھا تو وہاں فضائل گیا۔

میں نے کہا ”فضلے تو کہاں سے آ رہا ہے؟“

وہ بولا ”شہر سے آیا ہوں، سائیں جی کی حاضری دینے گاؤں جا رہا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”فضلے تو سائیں دروٹ کو مانتا ہے کیا؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بولا ”میں نے سائیں کو دیکھا ہی نہیں تو ماننا کیسا؟“

”تو پھر مزار پر حاضری کیوں دیتا ہے باقاعدہ؟“ میں نے پوچھا۔

”اس میں ایک بھید ہے۔“ وہ بولا

”کیا بھید ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بس اتنا بھید ہے۔“ فضلے نے کہا۔ ”کہ دھیان خود سے ہٹا کر دو جے پر لگا دو۔ چاہے وہ پیر ہو، فقیر ہو یا چوہا ہو۔“

”چوہا ہو۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں“ وہ بولا ”چاہے چوہا ہو۔“ اور پھر معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔ بولا ”آپ چلیں چودھری جی“ میں نذر نیاز لے

کرگاؤں پہنچ جاؤں گا۔“

تائنگہ چلنے لگا تو میں نے صوبہ تائنگہ والے سے کہا ”ذرا رک جاؤ“ اور پھر سوچے سمجھے بولا ”عابدہ۔۔۔۔۔“

عابدہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کتنے سالوں بعد میں نے نام لے کر اسے بلایا تھا۔ میں نے کہا۔ ”عابدہ! اس

کے لئے کچھ لے جائیں یہاں سے۔“ اس کی آنکھوں میں تبسم کی ایک لہر جھلکی۔ بولی ”میں لے آئی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے تھیلے سے

ولایتی پنیر کا ایک ڈبہ نکالا۔ اور فکر مند آرزو سے بولی۔ ”سکندر کے ابا وہ ولایتی پنیر کھالے گا کیا؟“



بھور سے

پیاری انو۔۔۔۔۔

دیکھ تو بھور سے آرہا ہے۔ دبے پاؤں۔ پگ پگ مدھم مدھم۔ پتہ نہیں کون گوری پائل کی جھنکار کے بغیر کس پتہ سے ملنے آرہی ہے۔ دیکھو تو کیا مدھ بھری چال ہے۔ کیا چھب ہے۔

یہ بھور سے بھی کیا سے ہے انو۔ مہک میں رچا بسا ہوا۔ تازگی شگفتگی کی پھوار اڑاتا ہوا۔ مدھم دھڑکنوں سے بھرپور۔ بے نام سکون کبھیرتا ہوا دو دھیا سویرا جیسے ماں کی گود کھل کھل کر دھرتی پر چھائے جارہی ہو۔ جیسے اجابت دعا کے لئے اپنے مندر کے دو رکھول رہی ہو۔ جیسے اللہ میاں آکاش سے نیچے اتر آئے ہوں۔ زیرِ لبی میں کہہ رہے ہوں۔ ”بندے آ مجھ سے باتیں کر۔“

کاش کہ تو یہاں ہوتی انو اور میرے پاس بیٹھ کر دیکھتی۔ ہم ہاتھ میں ہاتھ دیئے اکٹھی دیکھتیں۔

صبح کے چار بجے ہیں انو۔ اور میں گھر کے باہر باغیچے میں بیٹھی تجھ خط لکھ رہی ہوں۔ گھر والے گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔ رفیق پہل پہرے ہیں۔ رات دیر تک جاگتے ہیں۔ جوں جوں رات بھگتی ہے ان کی حیات جاگتی ہیں۔ پھر دو بجے کے قریب گویا غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے۔ صبح دیر تک بے خبر پڑے رہتے ہیں۔ انہوں نے کبھی بھور سے نہیں دیکھا۔

میں کچھل پھری ہوں۔ جب پوچھتی ہے تو مجھے جگا دیتی ہے اٹھ صواٹھ۔ دیکھو۔

میں کیا کیا دیکھوں انو۔ ہر طرف سے زیرِ لبی اٹھتی ہے۔ ادھر دیکھ ادھر دیکھ۔ دیکھ دیکھ کر میں بوند بوند بھر جاتی ہوں۔ پھر جی چاہتا ہے کوئی ہو جسے میں دکھاؤں اور ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے اکٹھے دیکھتے رہیں۔ دیکھتے رہیں۔

وہ دیکھ انو۔ پھول انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھے۔ سہی سٹی ہوئی پتیوں نے سبز چنیاں اوڑھ لیں۔ آنے والے سے کے سوا گت کے لئے۔

دیکھ انو دیکھ۔ کھگوں نے بوہے کھول دیئے۔ کھیاں نکل آئیں۔ پھولوں نے سفید لباس اوڑھ لئے کہ کھیاں دیکھ لیں۔ کھیاں کا پریم سندیس بن کر اپنی سونا بھری کٹوریوں کے سرپوش اتار دیئے۔

لو ہوا جھولنے اٹھائے آگئی کہ بھور سے کو جھولن سے بنا دیا۔ انو ایک ایسا ہی بھور سے میرے اندر چھایا ہوا ہے۔ دل کے انگ

انگ میں رچا بسا ہوا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی اندر جھانکے۔ دیکھے، جانے۔ اس آرزو نے مجھے اکیلی کر دیا ہے انو۔ اکیلی تنہا۔ اک میں ہی نہیں انو۔ تو بھی اکیلی ہے۔ ہم سب اکیلیاں ہیں۔ کوئی جان لیتی ہے کہ اکیلی ہوں۔ کوئی نہیں جانتی۔ کوئی سمجھ لیتی ہے کہ یہی ہمارا مقدر ہے۔ کوئی نہیں سمجھتی۔ کیوں سمجھے۔ کیوں خود کو دکھی کرے۔ پر سمجھنے نہ سمجھنے سے مقدر نہیں بدلتے۔

انو۔۔۔۔۔

پتا نہیں یہ بھور سے دیکھن کب دبے پاؤں میرے اندر آ بسا۔ جیسے دریا نیچے ہی نیچے سے آتا ہے اور پھر ”سیما“ بن کر باہر نکل آتا ہے۔ اس سیما نے مجھے بھگودیا، ڈبودیا۔ اب میں نے جانا ہے انو کہ یہ دیکھن باہر سے نہیں آیا۔ اندر سے پھوٹا ہے۔ اب میں نے جانا ہے کہ یہ دیکھن عورت کا نصیب ہے۔ پہلے دبا دبا بیٹھ رہتا ہے۔ پھر ہولے ہولے نکلتا ہے۔ چھا جاتا ہے۔

جب میں جوان ہوئی تھی تو ایک دم مجھ پر دکھن کا جنون طاری ہوا تھا۔ میں دکھوں، روشنیوں میں دکھوں، اندھیروں میں دکھوں، بیٹھی ہوئی دکھوں، چلوں تو دکھوں، بولوں تو دکھوں، جھر مٹ میں دکھوں، اکیلے میں دکھوں، ایسی دکھوں کہ دو جا چونک جائے۔ انو میں دکھنے کی اتنی دیوانی ہوئی کہ بار بار دیکھتی، کیسی دکھتی ہوں۔

میں سمجھی، عورت کے جیون کا مقصد صرف دکھنا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ دکھنا تو پہلی جوانی کا ایک پڑاؤ ہے، منزل نہیں۔ چار سال میں دکھتی رہی۔

تو بہ ایسی جوانی آئی کہ جو بھی سامنے آتا، جو توں میں کھڑا حیرت سے دیکھتا۔ جو گزر جاتا، مڑ مڑ کر دیکھتا۔ جو بات کرنے کے لئے آتا، بات بھول بھول جاتا۔ انو تو تو جانتی ہے کہ نگاہوں کی گود میں ایک جھولن ہوتا ہے۔ میں اس جھولن پر ایسی چڑھی کہ سدھ بدھ کھو بیٹھی۔ چار سال ہلا روں میں جیتی رہی۔

پھر رفیق آ گئے۔ رفیق میرے کزن تھے۔ ولایت پڑھنے گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔ کئی دن بے پتوار کی ناؤ کی طرح ڈولتے رہے۔ ڈگمگاتے رہے۔ پھر انہوں نے نگاہوں کا ایسا تار باندھ دیا کہ میں ان جانے میں پروئی گئی۔ جھولن میں ایسی لے آ گئی کہ رنگ پیدا ہو گیا۔ اس کی بوندیوں کی پھوار پڑنے لگی۔ مجھے بھگودیا۔ میں سمجھی، یہی محبت ہے۔

پھر ہماری شادی ہو گئی۔

شادی ہو گئی تو پتا نہیں کیا ہوا، کچھ ہو گیا۔ آنا فانا ہو گیا جیسے بھڑ پروانہ جائے۔ ساری دنیا ہی بدل گئی۔ دکھن دیکھن میں بدل گیا۔ انہیں دیکھ دیکھ کر جینے لگی۔ انہیں بت بنالیا۔ خود بھینٹ چڑھ گئی۔ ہر وقت آرتی اٹھائے رکھتی۔ پھول برساتی رہتی۔

پھر آہستہ آہستہ وہ بت پھیل کر گرد و پیش پر چھا گیا۔ ہر چیز میں انہیں دکھن لگی۔ پھولوں میں پتیوں میں بادلوں میں ہوا کے جھونکوں میں ہر جگہ۔ اور ان وہ میرے بند بند میں سما گئے اور میرے اندر بھور سے پیدا ہو گیا۔

میری سہیلیاں کہتی ہیں۔ صبو تو بڑی خوش نصیب ہے۔ تجھے ان کی محبت حاصل ہے۔ دو سال میں بھی یہی سمجھتی رہی۔ پھر جیسے میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ نہیں یہ تو محبت نہیں۔

ہماری شادی کو تین سال ہو چکے ہیں۔ اب ان کی نگاہوں کا تار اٹوٹ چکا ہے۔ میں انہیں وقفوں سے دکھتی ہوں۔ لیکن جب دیکھتے ہیں آنکھوں پر اٹھالیتے ہیں۔ پھر ایک شرارہ اڑتا ہے۔ بھس میں آگ لگ جاتی ہے۔ اک بھانیزا بھرتا ہے۔ جوا لاکھی جاگتا ہے۔ ان کی آغوش میں میرے اندر پھلجڑیاں چلتی ہیں۔ گھنٹیاں بجتی ہیں۔ رنگ رس پچکاریاں چھوٹی ہیں۔ پھر اک ہوائی شوں کر کے چل جاتی ہے۔ وہ دھم سے زمین پر آگرتے ہیں۔ یوں آنکھ کھل جاتی ہے جیسے خواب سے بیدار ہوتے ہیں۔ پھر میں انہیں نہیں دکھتی۔ ان کی وہ نگاہ سوچ آف ہو جاتی ہے۔ میں پیش منظر سے پس منظر میں چلی جاتی ہوں۔ لیکن میری نگاہ میں وہ کبھی پس منظر میں نہیں جاتے۔ سدا پیش منظر میں رہتے ہیں۔

اب میں نے جانا ہے انو! یہ آگ اگن تو محبت نہیں۔ یہ تو لگن کی شدت کو ختم کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ خود کو دو بجے سے الگ کرنے، محفوظ کر لینے کی اک چال ہے۔

مرد کے دل میں محبت کا بھور سے پیدا نہیں ہوتا۔ انو وہ تو جلا دیتا ہے۔ محبت تو بناتی ہے بگاڑتی نہیں۔ یہ تو کپا لنڈھا دینے والی بات ہے۔ محبت تو پلی پلی جوڑن کا نام ہے۔ انگ انگ میں دیپ جلانے رکھنے کا نام ہے۔ ایسے دیپ جو ان بجھ ہوں۔ ہلکی ہلکی لہروں کا نام ہے جو بند بند میں رواں دواں رہیں۔ جوار بھالنے کا نام نہیں۔

اب مجھے یاد آتا ہے انو! باجی کہا کرتی تھیں۔ صبو عورت سے دھوکہ ہوا ہے۔ مرد کا پریم تو جیون پیالی بھری رکھنے کے لئے قدرت کی اک چال ہے۔

اب میں نے جانا انو! باجی سچ کہتی تھی۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ محبت کی دین تو صرف عورت کو ملی ہے۔ مرد تو خالی جوار بھاتا ہے۔ سکندر ہے۔ آتا ہے۔ فتح کرتا ہے۔ چلا جاتا ہے۔ مرد تو انو مداری کا طوطا ہے۔ توپ چلاتا ہے اور پھر آرام سے بے تعلق جھولنے پر جا بیٹھتا ہے اور عورت اپنے بند بند میں متا کے دیپ جلانے بیٹھی رہتی ہے۔ بیٹھی رہتی ہے۔

نہیں انو! نہیں میں قدرت کی چال کے جال میں پھنسنے والا پنچھی نہیں بنوں گی۔ مجھے تو اک ساتھی چاہیے جس کے انگ انگ میں

محبت کی بھیگ رچی بسی ہو۔ تار بندھا رہے۔ مدھم لہریں رواں دواں رہیں۔ بند بند میں دیپ جلتے رہیں۔ محبت بھرے دیپ جیسے بھور سے میں جلتے ہیں۔

مجھے ایسا لگتا ہے انو جیسے یہ بھور سے چاروں اور چھایا ہوا بھور سے سے بنانے والے کا اپنے بندوں کے نام محبت بھرا پیغام ہے۔ اسے سو کے مت گنوا۔ اٹھ اٹھ کر میرے ساتھ باتیں کر۔ محبت بھری باتیں۔

انو میرا جی چاہتا ہے کوئی ہو۔ جو میرے ساتھ بھور سے کو دیکھے۔ اس کے پیغام کو سننے سے اسے بیتے اور ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے دیکھتے رہیں۔ دیکھتے رہیں۔



آدھے چہرے

”میں سمجھتا ہوں کہ آج کی دنیا میں سب سے اہم مسئلہ ایڈوشنل سٹریس اور سٹریس کا ہے۔“ اسلم نے کہا ”اگر ہم ایڈوشنل سٹریس کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو بہت سی کمپلی کیشنز سے نجات مل سکتی ہے۔“

آپ کا مطلب ہے ٹرائکولائزر قسم کی چیز۔“ رشید نے پوچھا۔

”نہیں نہیں۔“ اسلم نے کہا۔ ”ٹرائکولائزر نے مزید پیچیدگیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ ایلوپیٹھی نے جو مرض کو دبا دینے کی رسم پیدا کی ہے اس سے امراض میں اضافہ ہو گیا ہے اور صرف اضافہ ہی نہیں اس پریشر کی وجہ سے مرض نے کیوفلاج کرنا سیکھ لیا ہے۔ لہذا مرض بھیس بدل بدل کر خود کو ظاہر کرتا ہے۔ اس وجہ سے اس میں اسرار کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے۔ تشخیص کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ کیوں طاؤس تمہارا کیا خیال ہے؟“ اسلم نے پوچھا۔

”میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں۔“ طاؤس بولا ”ہمارا طریقہ علاج یعنی ہومیوپیٹھی یقیناً روحانی طریقہ علاج ہے۔ ہماری ادویات مادے کی نہیں بلکہ انرجی کی صورت میں ہوتی ہیں جتنی دوا کم ہو اس میں اتنی ہی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ یہی اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔“

”وہ تو ہے۔“ عظیم نے کہا ”یقیناً یہ طریق علاج اپنی نوعیت میں روحانی ہے لیکن ہمارے پریکننگ ہومیوپیٹھس کا نقطہ نظر ابھی مادیت سے نکل نہیں سکا۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔“

”ڈاکٹر صاحبان“ رشید ہنس کر بولا ”آپ لاکھ کوشش کریں لیکن ایلوپیٹھی کو رپلیس نہیں کر سکتے۔“

”وہ کیوں؟“ حامد نے جواب دیا۔

”سیدھی بات ہے۔“ رشید نے جواب دیا۔ ”آج کل مریض کیور نہیں چاہتا۔ وہ صرف ریلیف چاہتا ہے۔ کیور کے لئے صبر چاہیے۔ استقلال چاہیے۔ آج کل لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ کیور کا انتظار کریں۔ بس ایک گولی ہو ایک ٹیکہ لگے اور شام کو انزکان کی محفل میں شو آف کا موقعہ ہاتھ سے نہ جائے۔“

”سچ کہتے ہو بھائی۔“ حامد نے آہ بھری۔

”اسلم صاحب“ طاؤس نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی آئیڈنٹیٹ کھو چکے ہیں۔ ماڈرن ایج کی یہ ایک ڈریز ہے۔ کینٹینس ڈریز۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ حامد بولا۔

”میرا مطلب ہے۔ آج کل کے نوجوانوں کو پتہ نہیں کہ وہ کون ہیں۔ پتہ نہیں وہ چاہتے کیا ہیں۔ موومنٹ کے دیوانے تو ہیں۔ چلتے رہنے کا بھوت سوار ہے لیکن انہیں پتہ نہیں کہ ہم کیوں چل رہے ہیں۔ ہمیں کہاں پہنچنا ہے۔ ہمارے نوجوان میڈکراؤڈ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اندر کے فرد کو دوبار کھا ہے۔ بالکل ایسے جیسے اینٹی بائیوٹکس اندر کی بیماری کو دبا دیتے ہیں۔ وہ اکیلے ہونے سے ڈرتے ہیں۔“ طاؤس نے ایک لمبی آہ بھری اور گویا اپنے آپ سے بولا ”کاش کہ میں کوئی ایسی دوا بنانے میں کامیاب ہو سکتا جو اندر کے فرد کو ریلیز کر سکتی۔ میڈکراؤڈ کی نفی کر سکتی۔“

”ہوں دلچسپ بات ہے۔“ عظیم نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو اس کا خیال کیسے آیا؟“ حامد نے طاؤس سے پوچھا۔

”دو سال ہوئے۔“ طاؤس کہنے لگا۔ ”جب میں نے پریکٹس شروع کی تو پہلا مریض جو میرے پاس آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا ڈاکٹر صاحب یہ بتائیے کہ میں کون ہوں؟“

”عجیب بات ہے۔“ رشید زیر لب بولا۔

”اور وہ مریض مکمل ہوش و حواس میں تھا کیا؟“ اسلم نے پوچھا۔

”بالکل“ طاؤس نے جواب دیا۔

”شاید ڈس ہیلمنڈ ہو۔“ عظیم نے گویا اپنے آپ سے پوچھا۔

”بظاہر تو نہیں لگتا تھا۔“ طاؤس نے جواب دیا۔

”حیرت کی بات ہے۔“ رشید نے دہرایا۔ اس وقت یہ سب لوگ رشید کے مکان سے ملحقہ لان میں بیٹھے تھے۔

دراصل رشید ہومیو پیتھی کا بہت دلدادہ تھا۔ ہومیو پیتھ ڈاکٹروں سے اس کے بڑے مراسم تھے۔ اس روز اس نے چار ہومیو پیتھ ڈاکٹروں کو اپنے گھر پر مدعو کر رکھا تھا۔ غالباً کوئی تقریب تھی یا ویسے ہی۔ رشید خود ہومیو پیتھ نہیں تھا لیکن اسے ہومیو پیتھی کے کیس سننے کا بڑا شوق تھا۔ بہر حال کھانا کھانے کے بعد وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے بزر چائے پی رہے تھے کہ دور حاضرہ کی بات چل نکلی تھی۔

طاؤس کے اس کیس پر ڈاکٹر تو نہیں البتہ رشید بہت متاثر ہوا۔ اس کے اصرار طاؤس نے انہیں اس نوجوان کا واقعہ سنایا۔ طاؤس

نے بات شروع کی۔

”ان دنوں میں نے نیا نیا معمل کھولا تھا۔ اور معمل بھی کیا۔ میں نے گھر کے ایک کمرے پر بورڈ لگایا تھا۔ اور وہاں چند ایک ضروری کتابیں اور دو ایمیں رکھ لی تھیں۔

شام کا وقت تھا۔ میں اپنے معمل میں بیٹھا ایک رسالے کا مطالعہ کر رہا تھا کہ دروازے پر ٹک ٹک کی آواز آئی۔ دیکھا تو دروازے پر ایک خوش بوش نوجوان کھڑا ہے۔ ”میں اندر آ سکتا ہوں؟“ اس نے کہا۔

”تشریف لائیے۔“ میں نے رسالہ ایک طرف رکھا۔ ”بیٹھئے“

”آپ ہو میو پیٹھ ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”جی“ میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کی شکل و شباهت ایک پریکیٹکل نوجوان جیسی تھی۔ سمارٹ، ذہین، مضطرب، شوخ، لالہالی، چمکتی آنکھیں، چوڑا منہ، لنگتی موچمیں اور سریر بالوں کا ٹوکرا۔

”دراصل میں آپ سے ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔“ نوجوان نے کہا۔

”پوچھئے“ میں نے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ غالباً اس سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بات شروع کرے۔

پھر وہ ایک دم کہنے لگا۔ ”میری ایک پر اہلم ہے۔ جناب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا میں حمید ہوں یا اختر ہوں۔“

طاؤس رک گیا۔ حاضرین حیرت سے طاؤس کی طرف دیکھنے لگے۔

”ہاں ہاں“ یہ کیا بات ہوئی۔ رشید بے صبراً ہورہا تھا۔ ”یہ کیا بات ہوئی بھلا میں حمید ہوں یا اختر۔“

طاؤس نے بات شروع کی۔ بولا۔۔۔۔۔ نوجوان کی بات سن کر میں گھبرا گیا۔ سمجھا شاید اس کا ذہن گڈمڈ ہے لیکن میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ پھر نوجوان خود ہی بولا ”آئی ایم ناٹ اے مینٹل کیس سر“ میرا ذہن بالکل ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر دراصل مجھے سمجھ نہیں آ رہا ہے کیسے بات کروں؟“

”یہ بتائیے کہ حمید کون ہے، اختر کون ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں ہوں۔ میں حمید بھی ہوں اختر بھی۔ میرا نام حمید اختر ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو کیا حمید اختر ایک ہی فرد کا نام ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”جی، ایک ہی فرد کا۔“ اس نے جواب دیا۔

”پھر آپ نے یہ کیوں پوچھا کہ میں حمید ہوں یا اختر؟“

”میں نے بالکل ٹھیک پوچھا۔ ڈاکٹر یہی میری پرابلم ہے۔ لیکن میں اپنی پرابلم کسی کو بھی نہیں سمجھا سکتا۔ میں اس امید پر یہاں آیا تھا کہ شاید ہو موڈ تھی میں کوئی ایسی دوا ہو جو میری پرابلم کو حل کر سکے۔ لیکن اس نو یوز۔“ وہ جانے کے لئے مڑا۔ ”معاف کیجئے“ میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔“

”ذرا ٹھہرے تو بیٹھ جائے۔“ میں نے اٹھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

”فائدہ؟“ وہ پولا۔

”نقصان بھی نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”جب میں اپنی پرا بلم پیش ہی نہیں کر سکتا تو۔۔۔۔۔“

”گولی مارے پر اہل کم کو۔“ میں نے کہا ”آئیے اکٹھے بیٹھ کر چائے کا پیالہ پیتے ہیں۔ دنیا میں سب سے عمدہ دوا اکٹھے بیٹھ کر باتیں کرنا ہے۔“

”لیکن آپ کا وقت؟“ اس نے کہا۔

”بے فکر رہیے۔ میں بالکل فارغ ہوں۔ احمد دین۔۔۔۔۔“ میں نے با آواز بلند اپنے ملازم کو پکارا۔ ”بھئی چائے لے آؤ۔“ اس پر وہ فوجوان رک گیا۔

”بیٹھے نا“ میں نے نوجوان کو صوفے پر بٹھا دیا۔ ”دیکھئے موسم کتنا خوشگوار ہے اور یہاں سے پہاڑوں کا منظر کتنا اچھا لگتا ہے۔“

میں نے اس سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ دیر تک بیٹھے ہم دونوں چائے پیتے رہے۔ اس دوران میں دو ایک مرتبہ اس نے اپنی پر اہلم کی بات شروع کرنے کی پھر کوشش کی۔ آخر میں نے اس سے کہا۔ ”حمید صاحب آپ اپنی پر اہلم پیش نہ کریں بلکہ اپنی آپ جتنی سنا لیں۔ آپ کی پر اہلم آپ ہی آپ باہر نکل آئے گی۔“

بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے مجھے اپنی کہانی سنانا شروع کر دی۔

کہنے لگا۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب میرا نام حمید اختر ہے، لیکن گھر میں مجھے سب حمید کہتے ہیں۔ ہم شہر کے پرانے حصے کو چھ قاضیاں میں رہتے ہیں۔ میرے آباء و اجداد نہ جانے کب سے اس محلے میں رہتے ہیں۔ یہ محلہ ایک کوچہ بند محلہ ہے۔ میرا مطلب ہے۔

چاروں طرف سے بند ہے۔ اندر جانے کے لئے ایک بہت بڑی ڈیوڑھی بنی ہوئی ہے۔ جانے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ محلے میں صرف قاضی آباد ہے جو ایک دوسرے کے عزیز یا رشتہ دار ہیں۔ ”وہ رک گیا اور کچھ دیر توقف کے بعد بولا۔

”آپ چونکہ شہر کے جدید حصے میں رہتے ہیں، آپ نہیں سمجھ سکیں گے کہ محلے میں رہنے کا مطلب کیا ہے۔ محلے میں ہر شخص ہر دوسرے شخص کو جانتا ہے۔ جونہی آپ محلے میں داخل ہوتے ہیں، لوگوں کی نظریں آپ پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ بولتا کس طرح ہے۔ سر اٹھا کر یا نیوا کے لڑکیوں کی طرف کن نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

ہم لوگ جو پشتوں سے محلے میں رہتے آئے ہیں، محلہ ہماری ہڈیوں میں رچ بس گیا ہے۔ جونہی ہم محلے میں داخل ہوتے ہیں، اپنے آپ آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ گفتگو میں شوخی ختم ہو جاتی ہے۔ اندر کا غنڈہ پن دھل جاتا ہے۔ لڑکیاں نگاہ میں لڑکیاں نہیں رہتیں، بڑوں کے لئے ادب و احترام کا ایک خول چڑھ جاتا ہے۔

اگرچہ اب محلے میں بڑی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ برفقے اتر گئے ہیں۔ لباس بدل گئے ہیں۔ کاریں آگئی ہیں۔ ڈرائنگ روم سج گئے ہیں۔ لیکن محلے والوں کا رخ نہیں بدلا۔ اگر بدلا بھی ہے تو یہ تبدیلی باہر تک محدود ہے۔ محلے میں داخل ہوتے ہی کایا پلٹ جاتی ہے۔ کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں، ویسے ہی بے اختیاری طور پر۔

ہاں میں اس محلے میں پلا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب، سمجھے آپ اور مجھے اپنی ماں سے محبت ہے۔ نہیں محبت نہیں، عشق ہے عشق۔ میری ماں نے جتنی محبت مجھے دی ہے، اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ میں اپنی ماں کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں، ڈاکٹر“

ماں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ جذباتی ہو گیا۔ طاؤس ایک ساعت کے لئے رک گیا۔ پھر بولا۔

”آپ کا باپ؟“ میں نے پوچھا۔

”اب تو میرا باپ ایک اچھی خاصی نوکری پر ہے۔ پہلے وہ ایک معمولی سے عہدے پر کام کرتے تھے۔ آج کل تو ہمارا گھر ایک اچھا خاصا مڈل کلاس گھرانا ہے۔ اچھا گزارہ ہو رہا ہے۔ پہلے یہ بات نہ تھی۔ بہت مشکل سے پورا ہوتا تھا۔

پھر ہم پر ایک مصیبت نازل ہو گئی۔ ابا بیمار پڑ گئے۔ وہ ایک عجیب سی بیماری تھی۔ انہیں ریڑھ کی ہڈی میں شدت کا درد اٹھتا تھا۔ ہم نے انہیں ہسپتال میں داخل کر دیا۔ ہسپتال والوں نے انہیں درد سے بچانے کے لئے نشے والے ٹیکے لگانے شروع کر دیئے۔ دو سال بعد وہ صحت مند ہو کر گھر آئے تو ان ٹیکوں کے عادی ہو چکے تھے۔ ایڈکٹ ہونے کے وجہ سے ان کی نوکری چھوٹ گئی۔ بد مزاجی حد سے بڑھ گئی۔ جیسے کہ ہر اس ڈرگ ایڈکٹ کی ہوتی ہے جس کے پاس نشہ پورا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔

اف وہ چار سال ہم پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہماری ہڈیاں توڑ دیں۔ امی، چھوٹی بہن اور میں پس کر رہ گئے۔ ہم تینوں نے مزدوروں کی طرح کام کیا۔ ریڈی میڈ کپڑے سیئے۔ بیچے۔ دیسی نائیوں کو سپلائی کرنے کے لئے فیس کریمیں بنائیں۔ تھیلے سیئے، سیلو فین کے لفافے بنائے۔ ان دنوں ہمیں کئی کئی روز فاقے آئے لیکن امی نے ابا کے علاج اور ہماری تعلیم کو ہر قیمت پر جاری رکھا۔ اگر امی نہ ہوتیں تو گھر کے پر نچے اڑ جاتے۔ امی ایک بہت بڑی عورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔ اس نے ہم سب کا ہوصلہ بندھائے رکھا۔ ہم میں مصیبتیں سہنے کی ہمت پیدا کی۔ ابا کی دیوانگی برداشت کی۔ خیر وہ دن بیت گئے۔ ابا کی وہ عادت چھوٹ گئی اور پھر انہیں پہلے سے بھی بہتر ملازمت مل گئی۔ ایسی کہ ہم خاصے خوشحال ہو گئے ہیں۔

گھر میں مجھے سب حمید کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب، کبھی کسی نے اختر کہہ کر نہیں بلایا۔ محلے میں بھی مجھے سب حمید کے نام سے بلاتے ہیں۔ جب کوئی حمید کے نام سے بلاتا ہے تو آواز میرے کانوں سے داخل ہو کر گویا سیدھی دل میں پہنچ جاتی ہے اور میرے دل میں گھر اور محلے کی یادیں یوں جھمن جھمن کرنے لگتی ہیں جیسے ساز کی تاریں۔ گھر سے وابستہ جذبات ابھرتے ہیں۔ ادب، احترام، عجز، خدمت برداشت۔ ایک مٹھاسی پیدا ہو جاتی ہے۔ میری گردن جھک جاتی ہے۔ نگاہیں بھیگ جاتی ہیں۔ منہ سے جی ہاں جی ہاں نکلتا ہے۔ ایک عجیب سا سرور، عجیب سا سکون۔ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر صاحب۔ ”نوجوان نے جھر جھری لے کر کہا۔

”میں سمجھتا ہوں آپ کی بات کو۔“ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”اسے صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو پشت در پشت سے محلے میں رہتا آیا ہو۔ ڈاکٹر“ نوجوان نے پھر بات شروع کی۔ ”جب میں کالج میں داخل ہوا۔ ان دنوں ہماری گھریلو مصیبت نئی نئی ختم ہوئی تھی۔ محنت و مشقت اور غربت کا دور دور ہوا تھا۔ کالج میں میرا جی چاہتا تھا کہ الٹی چھلانگیں لگاؤں۔ ہنسوں، کھیلوں، قہقہے لگاؤں۔ اس کو چھیڑوں، اس سے الجھوں۔ پھر وہاں محلے کی بندشیں بھی تو نہ تھیں۔ ایک عجیب سی آزادی کا احساس ہوا مجھے۔ مادر پدر آزاد پھر یہ بھی تھا کہ وہاں مجھے کوئی حمید کے نام سے پکارنے والا نہ تھا۔ پتہ نہیں کیسے وہاں کالج میں سبھی مجھے اختر کہہ کر بلاتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے میں محسوس کرنے لگا تھا کہ ایک نیا کورنوجوان ہوں جسے حمید سے دور کا تعلق نہیں۔ یعنی یوں سمجھ لیجئے کہ کالج میں یوں تھا جیسے بوتل سے نکلا ہوا جن ہو۔ میں نے بال بڑھائے، مونچھیں لڑکا لیں۔ جیکٹ اور جین پہن لئے۔ میرا بولنے کا انداز بدل گیا۔ سوچنے کا انداز بدل گیا۔ جینے کا انداز یوں بدل گیا جیسے کوئی چٹ سے پٹ ہو جائے۔

ایک ہی سال میں میں کالج کی ہر ایک ٹیوٹی میں پیش پیش ہو گیا۔ آزادی کے نعرے لگانے میں، پروفیسروں کا مذاق اڑانے میں،

گرل اسٹوڈنٹس کو چھیڑنے میں، گلیڈ آئی چکانے میں۔ چمکیلی باتیں کر کے اپنی دھاک جمانے میں، سٹرائیک کرنے میں، جلسہ جلوس آرگنائز کرنے میں، ہاتھ پائی کرنے میں، لڑکیوں سے رومان لڑانے میں۔ میں ڈبیٹ کلب کا سیکرٹری بن گیا۔ سپورٹس میں کھلاڑی تو نہ بن سکا۔ لیکن پنڈال میں کھڑا ہو کر جس کو چاہتا، سپورٹ کر کے ہیر و بنا دیتا۔ جس لڑکی پر توجہ دیتا، وہ ابھر کر کالج کی فضا پر چھا جاتی۔ جس پارٹی کو چاہتا، اسے کامیاب بنا دیتا۔ جسے نہ چاہتا، اسے یوں توڑ کر رکھ دیتا جیسے ہاتھ کا کھلونا ہو۔

یعنی تین سالوں میں اختر کالج کی آنکھ کا تارابن گیا۔ سب سے بڑا بلی بن گیا۔ ڈینڈی بن گیا۔

اب پروفیسر اس سے دبتے ہیں۔ لڑکے اس کے پیچھے چلنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ لڑکیاں اس سے خائف ہیں۔ ساتھ ہی اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔ ”بولتے بولتے نوجوان رک گیا۔

”اور۔۔۔۔۔ حمید؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”حمید“ وہ مسکرایا۔ ”حمید اپنی جگہ جوں کا توں قائم ہے۔ جب بھی اختر محلے میں داخل ہوتا ہے تو اس کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ اوپر سے اختر کا چھلکا اتر جاتا ہے اور نیچے سے حمید نکل آتا ہے۔ گردن جھک جاتی ہے۔ تنے ہوئے سینے میں کچک پیدا ہو جاتی ہے۔ نگاہوں میں ادب اور لحاظ کا لگاؤ ابھر آتا ہے۔ لڑکی کو دیکھ کر وہ مہتابی نہیں چھوٹی جس سے کالج کی فضا تارے تارے ہوئی ہے۔ الٹا لڑکیاں ماں بہنوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ بڑے بوڑھوں کے لئے وہ تحقیر نہیں رہتی بلکہ اس کی جگہ احترام اور ادب کا جذبہ ابھرتا ہے اور جب وہ گھر میں داخل ہوتا ہے تو ماں ماں نظر آتی ہے جیسے دیوی ہو اور اس کا جی چاہتا ہے کہ ساری دنیا کو اٹھا کر دیوی کے قدموں کی بھینٹ کر دے۔“ نوجوان خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے پیار بھری پھوار نکل رہی تھی۔

دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ آخر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ طاؤس نے کہا اور بن سوچے سمجھے ایک ایسا سوال کر دیا کہ میں خود حیران رہ گیا۔ میں نے کہا ”آپ کو کیا یہ احساس شروع سے ہی تھا کہ حمید اور اختر دو مختلف افراد ہیں یا۔۔۔۔۔۔“

”نہیں نہیں“ نوجوان نے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”مجھے اس کا قطعی احساس نہیں تھا۔ اگر کل وہ واقعہ نہ ہوتا تو شاید میں بے خبری ہی میں رہتا۔

کل دوپہر کے وقت کالج کے کھلے میدان میں ہم ایک بڑے فنکشن کا انتظام کر رہے تھے۔ اختر اس فنکشن کا ناظم بھی تھا اور روح رواں بھی۔ اس وقت وہ لڑکیوں کو ہدایات دے رہا تھا کہ ہمارے محلے کا چچا غفور اداہاں آ گیا۔ اس نے آوازیں دینی شروع کر دیں۔

”حمید حمید“ اختر نے وہ آواز سنی بھی لیکن اس وقت اس کے لئے حمید کا کوئی مفہوم نہ تھا۔ پتہ نہیں حمید کون تھا۔

پھر لڑکوں نے شور مچا دیا۔ ”بھئی اختر“ یہ صاحب کسی حمید کا پوچھ رہے ہیں۔“
”یہی تو اپنا حمید ہے۔“ چاچا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

دفعۃً میں نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے چچا غفور اکھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر اختر کا ذہن گڈمڈ ہو گیا۔ شدید دھکا لگا۔ جب چچا نے بتایا کہ ماں بیمار ہے تو اختر کی نگاہ میں وہ میدان، وہ کالج اور لڑکے سب دھندلا گئے۔ ایک خانے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر حمید جاگ اٹھا۔ یوں جیسے بٹن دبانے سے جی جل اٹھتی ہے۔“

نو جوان خاموش ہو گیا۔ کافی دیر خاموش رہا۔ پھر گویا اپنے آپ سے کہنے لگا۔ ”آج سارا دن میرے ذہن میں یہی سوال گھومتا رہا کہ میں کون ہوں۔ اختر یا حمید؟“ پھر میری ہومیو پیتھک کتابوں کی طرف دیکھ کر بولا ”میری ماں ہومیو پیتھکی کی بڑی قائل ہے۔ یہاں سے گزر رہا تھا کہ آپ کا بورڈ دیکھ کر خیال آیا۔ کیوں نہ آپ سے پوچھوں۔ کیا آپ کے ہاں کوئی ایسی دوا ہے جو میری اصلیت کو ظاہر کر دے۔ سامنے لے آئے تاکہ پتہ چلے کہ مجھے حمید بن کر زندگی گزارنی ہے یا اختر بن کر۔ یہ میری پرابلم ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟“

نو جوان نے جلتی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

طاؤس رک گیا اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ اسلم چھت کی طرف گھور رہا تھا۔ حامد ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی ٹیکے بیٹھا سوچ رہا تھا۔ عظیم بظاہر پھٹی پھٹی آنکھوں سے طاؤس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کی سوچ نہ جانے کن خلاؤں میں بھٹک رہی تھی۔ رشید منہ میں پسل ڈالے بیٹھا تھا۔

”بڑا دلچسپ کیس ہے۔“ اسلم نے چھائی ہوئی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

”اسے صرف سپلٹ پر سنلٹی تو نہیں کہہ سکتے۔“ عظیم بولا ”ڈول پر سنلٹی بھی نہیں۔“

”کیا یہ صرف حمید اختر کا خصوصی کیس ہے یا ہر ماڈرن نو جوان کا لچٹ کا جو پشتوں سے محلے میں رہتا آیا ہے۔“ حامد نے پوچھا۔
”کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ طاؤس نے جواب دیا۔

”چھوڑو یاران باتوں کو۔“ رشید بولا ”یہ بتاؤ کہ تم نے حمید اختر کو کیا جواب دیا؟“

”وہی جو معالج دیا کرتے ہیں۔“ طاؤس نے جواب دیا۔ ”میں نے کہا میں آپ کا کیس سنڈی کروں گا۔ مجھے چار ایک دن کی محنت دیجئے۔“ اس پر نو جوان اٹھ بیٹھا۔ ”میں پھر آؤں گا۔ شاید اتوار کے دن۔ امید تو ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔“ یہ کہہ کر اس

نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا۔

”کیا وہ اگلی اتوار کو آیا؟“ رشید نے پوچھا۔

طاؤس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”یعنی بات ختم ہو گئی۔“

”نہیں“ طاؤس بولا ”بلکہ بات شروع ہو گئی۔“

”کیا مطلب؟“ عظیم نے پوچھا۔

”میرے دل میں ایک سوال کھڑا ہو گیا۔“ طاؤس بولا ”کہا اگر اس کیس کو ہومیوپیٹھی حل نہیں کر سکتی تو ہومیوپیٹھی کے قیام کا کوئی جواز نہیں۔“

”بالکل“ اسلم بولا ”ایسے کیسے کو صرف ہومیوپیٹھی ہی حل کر سکتی ہے۔“

”اگر ہومیوپیٹھی سپر سلف کو باہر نہیں لاسکتی تو یہ ہمارا قصور ہے۔ سسٹم کا نہیں۔“ طاؤس نے کہا ”اگر ہومیوپیٹھی ہپو کریسی کی عادت کو

نہیں توڑ سکتی تو یہ ایک افسوسناک بات ہے۔ قصور ہمارا ہے کہ ہم نے ہومیوپیٹھی کو اس زاویے سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ میٹریا میڈیکا میں زیادہ تر Symptoms ایسے درج ہیں جو جسم نہیں، شخصیت کی حد میں آتے ہیں۔“ طاؤس جوش میں آ گیا۔

”وہ تو سب ٹھیک ہے۔“ حامد نے کہا ”لیکن ہمیں یہ بتائیے کہ کیا مریض پھر کبھی آپ سے ملا؟“

”ہاں ملا“ طاؤس نے بات شروع کی۔ ”مگر اتفاقاً تقریباً چھ مہینے بعد۔ اس روز میں اتفاقاً میونسپل پارک میں جا نکلا تھا۔ وہاں

گھومتے پھرتے دفعتاً میں نے دیکھا کہ وہ اکیلا ایک بچہ پر بیٹھا گہری سوچ میں کھویا ہوا ہے۔“

”ہیلو“ میں نے کہا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ ”شاید آپ کو یاد نہ ہو۔ میں طاؤس ہومیوپیٹھ ہوں۔“

”اوہ“ وہ اٹھ بیٹھا۔

”کہئے آپ وعدہ کے مطابق تشریف نہ لائے۔“ میں نے پوچھا۔

”امی کی بیماری کی وجہ سے میں سب کچھ بھول گیا“ ڈاکٹر“ وہ بولا

”اب کیا حال ہے ان کا؟“ میں نے پوچھا۔

”ٹھیک ہو گئی ہیں لیکن ڈاکٹر میں ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔“ اس نے آہ بھر کر کہا۔

ہے۔ دوسری نگاہ ڈالتے ہیں تو کوسوں دور چلی جاتی ہے۔ بڑی چالاک ہے وہ ڈاکٹر۔ لیکن ہے جادو گرئی۔“ نوجوان ہنسنے لگا۔

اس وقت اس کی آنکھوں سے پھواری نکل رہی تھی۔ یوں جیسے پھلجڑیاں چل رہی ہوں۔ ایک ساعت کے لئے رکا۔ پھر از خود بات شروع کر دی۔

”قصہ مختصر یہ کہ چھ سات مہینے میں سنبل نے سب لڑکوں کو گھائل کر کے رکھ دیا لیکن کسی کے ہاتھ نہ آئی۔ اس پر اختر کی انا جاگی۔ وہ سنبل کے قریب ہو گیا۔ اسے جیتنے کے لئے نہیں بلکہ قابو میں لا کر دکھانے کے لئے۔ خیر دو چار روز تو سنبل نے وہ وہ نگاہ ڈالی کہ اختر پگھل کر رہ گیا۔ چھینٹے اڑنے لگے۔ پھر سنبل پیچھے ہٹ گئی اور اس نے ”ذرا ہٹ کر چھلکو مسٹر“ کا انداز اپنایا۔ بس کیا بتاؤں ڈاکٹر! اختر اور سنبل میں بڑی لڑائی ہوئی۔ گھسان کارن پڑا۔ اختر بری طرح گھائل ہوا۔ اپنا جج بن کر رہ گیا۔“

میں نے اس کی بات ٹوک کر کہا ”آپ تو کہتے ہیں وہ بڑی مکار ہے چالاک ہے حرام زادی ہے پھر آپ کو اس سے محبت کیسے ہو گئی؟“

”اسی لئے ہوئی ڈاکٹر۔ وہ مکار ہے چالاک ہے حرام زادی ہے۔ اگر وہ سیدھی سادھی معصوم لڑکی ہوتی تو میں اس سے کھیلتا اور پھریوں پھینک دیتا جیسے کھلونا ہو۔“

”اوہ یہ بات ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اچھا تو کیا آپ نے اظہار محبت کیا؟“

”پیشتر اس کے کہ اظہار کرتا۔“ نوجوان نے جواب دیا ”ایک مشکل پڑ گئی۔ ویسے اظہار کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اسے سب پتہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میری کیا کیفیت ہے۔ اور یہ بھی کہ میں نے واپسی کی سب کشتیاں اپنے ہاتھوں سے جلادی ہیں۔“ وہ رک گیا۔

”ہاں تو وہ مشکل کیا تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک دن امی جان نے مجھے بلایا۔ کہنے لگی ’حمید تو نوشابہ کو جانتا ہی ہے۔‘“

نوشابہ امی کی واحد سہیلی تھی۔ جس زمانے میں ہم پر مصیبت پڑی تھی اس بھری دنیا میں نوشابہ ہماری واحد ہمدرد تھی۔ اس نے ہم پر بڑے احسان کئے تھے۔ میں ان احسانات کو اچھی طرح جانتا تھا۔

”ہاں امی! میں نوشابہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے امی سے کہا۔ امی بولی ”نوشابہ کے میاں فوت ہو چکے ہیں۔ اس کی اکلوتی بچی صفیہ اب جوان ہے۔ کالج میں پڑھتی ہے۔ خوش شکل ہے۔ سمارٹ ہے۔ ماڈرن بھی ہے لیکن گھبراہٹنی اتنی سلیقے والی اتنی خدمت گزار کہ یوں لگتا ہے جیسے اس زمانے کی ہوا بھی نہیں لگی۔ میں چاہتی ہوں بیٹے کہ اسے بہو بنا کر گھر لے آؤ۔ ارے تو تو گھبرا گیا۔“ امی نے غالباً میری حالت بھانپ کر کہا۔ ”نہیں نہیں! کوئی زبردستی نہیں۔ اگر تیرا جی نہیں چاہتا تو نہ سہی۔ یہ تو میری آرزو ہے۔ اگر تو مان جائے

تو میری زندگی سہل ہو جائے گی۔ سوچ لے۔ کوئی جلدی نہیں۔ سوچ کر مجھے بتا دینا۔“

”پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”فیصلہ۔۔۔۔۔۔“ ”نو جوان ہونے لگا۔“ اس کی ہنسی ٹوٹ کی آواز تھی۔ ”جس وقت سے امی نے شادی کی بات کی ہے۔ سنبل کے لئے میرا جذبہ یوں ابھر آیا ہے جیسے دودھ کی کڑاہی پر ملائی آ جاتی ہے۔ اب مجھے پتہ چلا کہ سنبل سے مجھے لگاؤ ہی نہیں، عشق ہے عشق۔ اس کے بغیر زندگی بے مصرف نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب، پھانسی پر لٹکا ہوا ہوں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ امی کی خواہش پر میں اپنی ہر خواہش قربان کر سکتا ہوں۔ لیکن اب۔۔۔۔۔۔“ ”نو جوان نے بے بسی سے دونوں ہاتھ اٹھائے اور پھر چپ ہو گیا۔

طاؤس نے چاروں طرف دیکھا۔

”کتنی انوکھی بات ہے۔“ رشید بولا۔

”انوکھی نہیں۔“ اسلم نے کہا۔ ”عام سی بات ہے۔ ایسے واقعات روز ہوتے ہیں۔“

”ہاں تو پھر نو جوان نے کیا فیصلہ کیا؟“ عظیم نے پوچھا۔

”ہماری وہ مختصر سی ملاقات تھی۔“ طاؤس نے بات جاری کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم دونوں بچ پر بیٹھے تقریباً ایک گھنٹہ باتیں کرتے رہے تھے۔

وہ سخت کشمکش میں مبتلا تھا۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ اس کے ذہنی کرب کو محسوس کر کے میں سخت گھبرا گیا اور اسے چھوڑ کر چلا آیا۔“

”ہاں“ اسلم بولا ”ذہنی کرب متعدی ہوتا ہے۔“

”اس کے بعد وہ نو جوان آپ سے ملا کیا؟“ حامد نے پوچھا۔

”ہاں چھ مہینے بعد۔“ طاؤس نے جواب دیا۔

”تو کیا اس نے آپ کو بتایا۔۔۔۔۔۔؟“ رشید نے بے تابی سے پوچھا۔

”ہاں“ طاؤس نے پھر بات شروع کی۔ ”اس روز میں سینما کا سیشن شوق کیہنے گیا تھا۔ بڑی آؤٹ سٹینڈنگ کچھ لگی تھی۔

ہال میں خاصا لیٹ پہنچا۔ سیٹ پر بیٹھ کر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حمید اختر مجھ سے اگلی رو میں بیٹھا ہے۔

اس کے ساتھ ایک لڑکی ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ نئی بیابھی ہوئی دلہن ہے۔ یعنی اس کی شادی ہو چکی ہے۔ میرے دل میں کھسر پھسر ہونے لگی کہ وہ لڑکی کون ہے۔ سنبل یا صفیہ۔ سچی بات یہ ہے کہ فلم پر میری توجہ نہ جمی۔ بس یہی سوچتا رہا۔

پھر جب انٹرول ہوا اور حمید اختر باہر نکلا تو میں بھی پیچھے پیچھے باہر نکل گیا۔ اس نے جلد ہی مجھے دیکھ لیا۔ ”ہیلو ڈاکٹر“ وہ چلایا۔

”کہئے“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ”آپ نے کوئی فیصلہ کیا؟“

”میری تو شادی بھی ہوگئی ڈاکٹر صاحب۔“ وہ چلایا۔

”سنبل سے یا صفیہ سے؟“ میں نے پوچھا۔ ”مجھے ساری بات سنائیے۔“

اس نے ایک بھر پور قہقہہ لگایا۔ ”ڈاکٹر صاحب امی کی خواہش کو رد کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ لیا اور امی

سے کہہ دیا۔ امی میں وہاں بیاہ کروں گا جہاں آپ چاہتی ہیں۔ بس یہی میرا فیصلہ ہے۔“

”پھر کیا تھا ڈاکٹر امی نے جھٹ مٹگنی پٹ بیاہ کرنے والی بات کی۔ اور اس طرح صفیہ سے میری شادی ہوگئی۔ پھر سہاگ رات

جب میں نے صفیہ کا گھونگھٹ اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے سنبل بیٹھی ہوئی ہے۔“

”ارے“ میرے منہ سے چیخ سی نکلی۔ طاؤس رک گیا۔

سبھی لوگ حیرت سے طاؤس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”صفیہ۔۔۔۔۔۔ سنبل نکلی۔ مطلب کیا ہوا؟“ رشید چلایا۔

”مجھے تو ساری بات ہی گپ نظر آتی ہے۔“ اسلم نے کہا۔

”آپ نے حمید اختر سے نہیں پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟“ عظیم بولا۔

”ہاں پوچھا تھا۔“ طاؤس نے کہا۔

”تو پھر کیا بتایا اس نے؟“ رشید نے پوچھا۔

”پوچھا تو حمید اختر نے کہا۔“ ڈاکٹر صاحب وہ بھی میری طرح حمید اختر تھی۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ صفیہ سنبل تھی۔“



سبز پتا

سیانے کہتے ہیں بڑے بڑے واقعات چھوٹی چھوٹی باتوں کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ سچ کہتے ہی۔ کتنی چھوٹی سی چیز تھی سبز پتا۔ سبز پتے نے ایک رستے بستے خاندان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

سبز پتا ایک کتاب کا عنوان تھا جو علم النبات کے ایک مشاہیر نے لکھی تھی۔ اتفاق سے یہ کتاب رفیق کے ہاتھ لگ گئی۔ جوں جوں وہ سبز پتے میں قدرت کے حیرت انگیز نظام کے بارے میں پڑھتا گیا، توں توں اس کے دل میں شعور پیدا ہوتا گیا کہ سچ ایک جن ہے جسے قدرت نے بوتل میں بند کر رکھا ہے۔ گویا روئیدگی کی طاقت کو سر بہر کر دیا گیا ہے۔ جوں جوں وہ سبز پتے کے اسرار و رموز سے واقف ہوتا گیا، توں توں اس کے دل میں کونپلیں پھوٹی گئیں۔ پھول کھلتے گئے۔ ایک ایسا سبزہ زار ابھرتا گیا جہاں روئیدگی تھی، تازگی تھی، امن تھا، سکون تھا۔ ایسا سکون جو بھور سے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اللہ میاں اتنے قریب آ جاتے ہیں۔ اتنے قریب کہ سب کچھ ان کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔

رفیق کے دل میں سبز پتے کا ایسا عشق جاگا کہ اسے شہر کی شورا شوریٰ، افراتفری اور روپیہ کمانے کی اندھی دوڑ سے نفرت ہو گئی۔ اس پر دونوں بھائیوں کے راستے الگ ہو گئے۔

بڑا بھائی اعظم علی شہر میں جا کر کارخانہ دار بن گیا۔ اس کا گھر مغربی رنگ میں رنگ گیا۔ اور اس کی زندگی پر حصول زر کے جنون کا تمبو تن گیا۔ اور چھوٹے بھائی رفیق علی نے اپنے آبائی گاؤں سے بہت دور ایک فارم قائم کر لیا۔

یہ فارم ایک انوکھا فارم تھا۔ ایک طرف مرغی خانہ تھا جس میں دو ہزار مرغیاں تھیں۔ دوسری طرف ایک تالاب تھا۔ جس میں تالابیہ مچھلیاں افزائش نسل کے لئے ڈال دی گئی تھیں۔ اس کے قریب ہی شہد کی مکھیوں کے بارہ ڈبے تھے جہاں مکھیاں شہد بنا رہی تھیں۔ وسط میں رہائشی مکان تھا جس کے ارد گرد تین قسم کے گلاب لگے ہوئے تھے جو دنیا کے مختلف ممالک سے منگوائے گئے تھے۔ گھر سے ہٹ کر ایک طرف اپچی کا باغ تھا۔ دوسری جانب مالے، کیو اور گریپ فروٹ تھے۔ ایک کونے میں گھاس پھونس کی چھت تلے پان کی بیلین لگی ہوئی تھیں۔ دوسرے کونے میں تمبو کے پڑھتے۔

رفیق علی کے سر پر یہ دھن سوار تھی کہ ایسے پودے اگائے جو پاکستان میں نہیں ہوتے اور ان کے پھل دساور سے درآمد کئے

جاتے ہیں۔ انہیں اپنے فارم میں لگائے مثلاً سپاری، کالی مرچ، اٹلی۔ اس کے لئے ایک ہاٹ ہاؤس بنوانے کی اشد ضرورت تھی۔ اس کا یہ خواب بڑی دیر تک شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔ بہر حال وہ فارم خود کفیل تھا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز دستیاب تھی۔ دودھ کے لئے گائیاں، بھینس اور بکریاں تھیں۔ کھانے کے لئے پھل تھے۔ سبزیاں تھیں۔ مرغیاں تھیں۔ مچھلی تھی۔ شہد تھا۔ شروع شروع میں دو ایک سال تو رفیق فارم کو تشکیل دینے میں شدت سے مصروف رہا۔ پھر جب فارم کی شکل نکل آئی تو وہ بیٹھ کر اپنی جنت کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے دل میں پودوں کی روئیدگی کی حس جاگی۔ سبز پتے پھول اور پھل اپنی خاموش زبان میں اس سے باتیں کرنے لگے۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا۔ مگر ایسا ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو آسمان کے نیچے بیٹھ کر پودوں کی روئیدگی کو دیکھتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ڈنٹھل سے کوئلیں پھوٹی ہیں۔ کوئلیں کھل کر پتیاں بنتی ہیں۔ پتیاں بڑھ کر پتے بن جاتی ہیں۔ بوٹے پھیل کر درخت بن جاتے ہیں۔ ان کے روبرو کائنات کا خلق آکھڑا ہوتا ہے۔

پھر وہ فرط انبساط سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔ اپنی مخلوق کی محبت کے جذبے سے پگھل کر سارے کھیت میں گھل مل جاتا ہے۔ پتوں میں ہریا دل بن جاتا ہے۔ پھولوں میں رنگ بن جاتا ہے۔ پھلوں میں شیرینی۔

خالق اور مخلوق یوں گھل مل جاتے ہیں کہ وحدت کا احساس ابھرتا ہے۔ پتہ ایسے کیوں ہوتا ہے۔ پر ایسے ہوتا ہے۔ لیکن شہر میں ایسا نہیں ہوتا۔ شہر میں خالق اور مخلوق کے درمیان رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ اس لئے شہر میں گردنیں تنی رہتی ہیں۔ چھاتیاں اکڑی رہتی ہیں۔ مونچھیں مروڑی رہتی ہیں۔ شاید اس لئے کہ شہر میں انسان خود کو خالق سمجھتا ہے۔ بہر حال رفیق اور اس کی بیوی آصفہ دونوں فارم میں سبز پتوں کی روئیدگی کو دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے۔

پھر شفیق کی پیدائش کے بعد دونوں تخلیق کے حیران کن عمل کو دیکھنے لگے۔ یوں آہستہ آہستہ شفیق جوان ہو گیا اور سبز پتے کے سحر میں رنگا گیا۔ اس پر باپ نے اسے ایگر پیکچر یونیورسٹی میں بھیج دیا جہاں سے وہ ڈگری حاصل کر کے واپس فارم میں آ گیا۔ تکمیل تعلیم سے واپس آیا تو شفیق ایک مقصد حیات ساتھ لے آیا۔ اس مقصد میں بے شک سبز پتے کی بہت اہمیت تھی لیکن وہ فارم جس میں وہ پل کر جوان ہوا تھا، جس کی رفق کی نگاہ میں بڑی اہمیت تھی، غیر اہم ہو چکا تھا۔

چار ایک ہفتے فارم میں بسر کرنے کے بعد بیٹے نے باپ سے کہا۔ ”اباجان مجھے اجازت دیجئے میں اپنا کام شروع کروں۔“ باپ نے جواب میں کہا ”بیٹے! تم اپنا کام فارم میں شروع کیوں نہیں کرتے؟“

شفیق نے کہا ”اباجان! میرا کام یہاں نہیں ہو سکتا۔ یہ فارم تو ایک مرغزار ہے۔ میرا کام تو وہاں ہوگا جہاں میلوں سبز پتے کا نشان

تک دکھائی نہ دے۔ ہمارے علاقے میں لاکھوں ایکڑ زمین غیر آباد پڑی ہے۔ کٹاؤ کا یہ علاقہ جو چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر مشتمل ہے بے آب و گیاہ ویران پڑا ہے۔ وہاں کی بھر بھری مٹی مردہ ہو چکی ہے۔ اس میں زندگی نہیں رہی۔ قوت نمونہ نہیں رہی۔ میں چاہتا ہوں کہ تحقیق کروں۔ کوئی ایسا سبز پتا تلاش کروں جو ہلکی بارش میں اپنی جڑیں زمین میں گاڑ دے اور پھر چاروں طرف پھیلتا جائے۔ پھیلتا جائے حتیٰ کہ کٹاؤ کے تمام ٹیلے اور نچان اس کی روئیدگی سے بھر جائیں اور خشک سالی اس پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

اگر مجھے ایسا سبز پتا مل جائے چاہے وہ بوٹا ہو، جھاڑی ہو یا زمین کے ساتھ ساتھ ریگننے والی نیل ہو تو میلوں علاقہ ہرا بھرا ہو جائے۔ اس علاقے کی تقدیر بدل جائے۔“

باپ نے بیٹے کو تحسین بھری نظروں سے دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ”بیٹے ہاں تمہاری ماں اور میں تمہاری اس قدر جستجو میں حائل نہیں ہوں گے۔ بلکہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی اس کام میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں۔ لیکن بیٹے تمہاری ماں کی خواہش ہے کہ وہ تمہاری شادی کے فرض سے سبکدوش ہو جائے۔“

شفیق ہنس کر بولا ”ابا جان یہ کام شادی کے بعد نہیں ہو سکتا۔“

”تمہاری ماں کی خواہش ہے بیٹے“

”ابا جان“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے شادی سے انکار نہیں لیکن مجھے ایسی جیون ساتھی کہاں سے ملے گی جو اس کام میں میرے ساتھ ویرانوں میں کھیل ہونے کے لئے تیار ہو۔“

عین اس وقت ڈاکیہ تار ہاتھ میں پکڑے داخل ہوا۔ بولا ”چودھری جی آپ کا تار آیا ہے۔“

تار کا نام سن کر شفیق کی ماں آصفہ دوڑی دوڑی آگئی۔ ”اللہ خیر کرے۔ کس کا تار ہے؟“

”بڑے بھائی آرہے ہیں۔“ رفیق نے تار پڑھتے ہوئے کہا۔

”یہاں آرہے ہیں کیا؟“ آصفہ حیرت سے چلائی۔ ”فارم پر؟“

”وہ تو یہاں کبھی نہیں آئے۔“

”بہر حال وہ آرہے ہیں۔ ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا جائے۔ انہیں کھانے میں کوئی ایسی چیز پیش نہ کی جائے جس سے شہر کی

خوشبو آتی ہو۔ خالص دیہاتی چیزیں کھلائی جائیں۔ رس کی کھیر، کڑھی، گھٹا ہوا ساگ، دودھ میں پکا ہوا گوشت، لسی، مکھن، شہد۔“

آصفہ بولی ”ان باتوں کو چھوڑیئے۔ سوال یہ ہے کہ وہ یہاں کیوں آرہے ہیں۔ وہ تو فارم پر ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے۔“

ہمیں پینڈو سمجھتے تھے۔“

اس پر رفیق نے قہقہہ لگایا۔ بولا ”مجھے پینڈو ہونے پر فخر ہے۔ اچھا ہے کہ وہ آرہے ہیں۔ میں انہیں اپنی حیثیت دکھاؤں گا۔ اگر کچھ دیر ہمارے ساتھ رہیں تو شاید سبز پتے کا سحران پر اثر انداز ہو جائے۔“

اعظم علی کی آمد پر فارم قہقہوں سے گونج اٹھا۔

رفیق نے انہیں فارم کی ایک ایک چیز دکھائی۔

اعظم علی کی بیوی بانو تو رسمی طور پر واہ واہ کرتی رہی لیکن ان کی اکلوتی بیٹی اسارہ حیرت سے ایک ایک چیز دیکھتی۔ تالیاں بھاتی اور قہقہے لگاتی رہی۔

اسارہ شفیق سے کافی بے تکلف رہی تھی جیسے کزن ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ کبھی فارم پر نہیں آئی تھی لیکن شفیق جب بھی شہر جاتا ان کے ہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ اسارہ ہمیشہ اس کے سبز پتے کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ کہتی ”تمہارا بھی جواب نہیں۔ فیقو لوگ پھول تلاش کرتے ہیں اور تم سبز پتے کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہو۔“ وہ شفیق کو فیقو کہہ کر بلایا کرتی تھی۔

اسارہ ایک ماڈرن لڑکی تھی جیسے کالج والیاں ہوتی ہیں۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اسے بات کہہ دینا آتا تھا۔ بات میں ایسا رنگ بھر دیتی کہ وہ رنگ پککاری بن جاتی اور محفل کو شرابور کر دیتی۔ وہ جھینپنے یا جھکنے سے قطعی طور پر ناواقف تھی اور اس کی گفتگو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ برملا سچی بات کہہ دیتی۔ چاہے بات خود اس کے خلاف جاتی۔

ماڈرن لڑکی کی طرح اس کے خدو خال جاذب تو تھے مگر انہیں حسین نہیں کہا جاسکتا تھا۔ لیکن اس کی حرکات اور انداز بہت جاذب نظر تھے۔ آج کل خدو خال کا حسن نہیں چلتا۔ انداز کا حسن چلتا ہے۔ اسارہ کے انداز میں بڑی گریس تھی۔ حرکت میں ردھم تھا اور بات میں رنگ۔

شفیق اسارہ کو بہت پسند کرتا تھا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ وہ کھڑٹس میں پٹی ہے اور یوں زندگی بتانے کی آرزو مند ہے جیسے جھیل میں اگا ہوا کنول ہو۔ اس میں جدوجہد کی آرزو نہیں۔ زندگی مقصد سے خالی ہے بیگانہ ہے۔

اس روز اسارہ کو فارم دکھاتے ہوئے اس نے بڑی کوشش کی کہ اسارہ کے دل میں سبز پتے کی جوت جگا دے۔ مقصد کا دیا جلا دے لیکن جھیل میں اگا ہوا کنول گرد و پیش سے متاثر نہ ہوا۔ اپنے ہی عکس کو دیکھنے میں کھویا رہا۔

رات پڑی تو بڑے بھائی نے رفیق کو اپنے کمرے میں بلایا۔ کہنے لگا ”دیکھو رفیق تم نے اپنی زندگی تو سبز پتے کے لئے تباہ کر

دی۔ اب کم از کم شفیق کی زندگی کو تو بچالو۔“ رفیق نے کہا ”بھائی جان! میری زندگی تباہ تو نہیں ہوئی۔ میں تو جنت میں رہتا ہوں۔“

اعظم علی ہنسے لگا۔ ”اب احمقوں کی جنت سے باہر نکلو رفیق۔ حقائق کی دنیا کو اپناؤ۔ تمہارا شہر کو چھوڑ کر یہاں فارم میں آ بیٹھنا زندگی سے فرار کے مترادف ہے۔ خیر تم نے جو چاہا کر گزرا۔ جو ہوا سو ہوا۔ اچھا چھوڑو۔ اب شفیق کی زندگی کا سوال ہے۔ اگر وہ بھی اسی فارم پر بیٹھا رہا تو زندگی سے ایڈ جسٹ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جائے گا۔“

رفیق نے کچھ کہنے کے کوشش کی لیکن اعظم علی نے اسے چپ کر دیا۔ بولے۔ ”میں یہاں اس لئے آیا ہوں کہ تم شفیق کو ہمارے ساتھ شہر بھیج دو۔ ہم اسے بزنس کی ٹریننگ دیں گے اور اپنا حصہ دار بنائیں گے۔“

کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہو گئے۔ پھر کہنے لگے ”تمہیں معلوم ہے کہ اسما رہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔ اگر شفیق بزنس میں چل نکلتا تو شاید ان دونوں کی شادی ہو جائے۔ لیکن اسے وعدہ مت سمجھنا۔ شاید۔۔۔۔۔۔ بہر حال ہماری خواہش ہے کہ شفیق ہمارے ہاں رہے۔ یہاں فارم میں رہ کر اپنی زندگی تباہ نہ کرے اور ہاں کل رات تک ہم اس کا جواب چاہتے ہیں۔ ہاں یا نہ۔ چونکہ پرسوں صبح ہم واپس چلے جائیں گے۔“

رفیق بڑے بھائی سے مل کر اپنے کمرے میں واپس آیا تو آصفہ سے بحث چھڑ گئی۔ آصفہ اس صورت حال پر بہت خوش تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شفیق چچا کی خواہش کے مطابق شہر چلا جائے۔ کاروبار میں حصہ دار بن جائے اور اسمارہ سے اس کی شادی ہو جائے۔

رفیق آصفہ کا ہم خیال نہ تھا۔ وہ بولا ”شفیق نہیں مانے گا۔ وہ کسی صورت اپنا مقصد حیات نہیں چھوڑے گا۔ اسے روپیہ کمانے کا نہیں کچھ کر دکھانے کا شوق ہے۔“

آصفہ بولی ”آپ اسے شہ دیتے ہیں نا۔“

”نہیں نہیں“ رفیق نے جواب دیا ”اگر شفیق کا روبرو میں حصہ دار بننا چاہتا ہے تو مجھے قطعی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں اس معاملے میں دخل نہیں دوں گا۔“

آصفہ کہنے لگی۔ ”ہاں، آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ میں اکیلی شفیق سے بات کروں گی۔ آپ جائیں اور اسے یہاں بھیج دیں۔“

شفیق کمرے میں داخل ہوا تو ماں نے چھوٹے ہی اس پر بھرپور جذباتی وار کیا۔ کہنے لگی۔ ”شفیق! اب اس گھر کی عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔ چاہے بنادے یا بگاڑ دے۔ تو ہاں کر دے تو دونوں بھائی پھر سے مل بیٹھیں گے اور جو تو نے نہ کر دی تو خاندان میں

ہمیشہ کے لئے پھوٹ پڑ جائے گی اور تیرا ابا اکیلا رہ جائے گا۔ تنہا“

شفیق نے کہا۔ ”اماں یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ بات کیا ہے؟“ اماں نے اسے ساری بات سنائی۔ ساتھ ہی کہنے لگی ”دیکھو شفیق، تجھے اسمارہ سے اچھی بیوی نہیں ملے گی۔ وہ تمہیں بہت چاہتی ہے۔ بس اب ہماری عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔“

اماں کی جذباتی ایبل سن کر شفیق کنکشن میں پڑ گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہی کرے جو اماں باپ چاہتے ہیں اور اپنے مقصد حیات کو ان کی خاطر قربان کر دے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد اس کے سامنے ایک خوفناک مستقبل کا نقشہ کھینچ جاتا۔ ایک بے حس سرمایہ دار ابھرتا جس کا مقصد حیات صرف دولت اکٹھی کرنا تھا۔ وہ لرز جاتا۔ اور اس کا فیصلہ پھر سے ڈگر کا جاتا۔

گھبرا کر وہ اپنے کمرے سے باہر لان میں نکل گیا۔ لان چاندنی سے بھرا ہوا تھا۔ مطلع صاف تھا۔ لیکن اس رات وہ منظر کے حسن سے بے خبر تھا۔ رات دیر تک وہ لان میں بے تابانہ ٹھلتا رہا۔ سوچتا رہا۔

دفعاً وہ چونکا۔ وہ رک گیا۔

اس کے سامنے وہ چادر لپٹی ہوئی کھڑی تھی۔

”تم تو کہتے تھے یہ فارم تمہاری جنت ہے۔“ وہ بولی

”ہاں جنت ہی تو ہے۔“

”کیا جنت میں لوگ یونہی بے قرار رہتے ہیں جیسے کہ تم ہو۔“ وہ ہنسی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”ایک گھنٹے سے اپنی کھڑکی سے تمہاری بے چین ٹہل کود دیکھ رہی تھی۔“ اسمارہ نے کہا۔ ”پھر میں نے سوچا چلو پوچھوں تو۔“

”دیکھو اسمارہ“ وہ سنجیدگی سے بولا ”اس وقت میں زندگی کے دورا ہے پر کھڑا ہوں۔“

وہ ہنسی بولی۔ ”ہاں ایک طرف سبز پتا ہے دوسری طرف پھول ہے۔ کتنی مشکل میں گرفتار ہو تم۔ ت ت ت ت“

”بات مذاق میں نہ ٹالو اسمارے۔“ وہ بولا ”میری مدد کرو۔“

”بولو کیسے؟“

”کیا تم میرا جیون ساتھی بنو گی اسمارے۔“ اس نے پوچھا۔

اسمارہ کی بھنویں تن گئیں۔ آنکھ میں پھلجھری چل گئی۔ زبان گال میں ٹھونس کر بولی۔ ”اچھا تو پر پوز کر رہے ہو۔ اونہوں ہوں یوں نہیں۔ دونوں پاؤں ملاؤ۔ گھٹنے زمین پر ٹیش دو۔۔۔۔۔ پھر ہاتھ اٹھاؤ اور کہو۔ ڈارلنگ کیا تم میرا جیون ساتھی بننا قبول کرو گی؟“ اس کا تہتہ لان میں گونجا۔

وہ پتھر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بولا ”یو آ رامپاسمیل“
 ”ہاں“ وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ”یہی چیلنج تو ہے امپاسمیل کو پاسمیل بننا ہے۔ کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ ذرا سی محنت درکار ہے۔ گھبرا نہیں فیتو۔ پھول توڑو گے تو کانا تو چبے گا۔“

وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ ٹپٹنے لگی۔ کچھ دیر خاموش ٹپٹتی رہی پھر قریب آ کر بولی ”فیتو پتا اور پھول ایک ہی ٹپنی پر لگتے ہیں۔ مگر دونوں آپس میں کبھی نہیں ملتے۔ پھول کو پانا ہو تو پتا نہیں بھنورا بنو۔“ یہ کہہ کر وہ خراماں خراماں ٹپٹتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔

شاید اس کی خواہش تھی کہ وہ اٹھ کر اس کو روک لے لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا رہا۔
 اگلی صبح ان کا ملازم گھبرا یا ہوا رفیق کے کمرے میں داخل ہوا۔ بولا ”جی چھوٹے چودھری اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ رات کو بستر میں نہیں سوئے۔“

رفیق یہ سن کر گھبرا گیا۔ بھاگا بھاگا شفیق کے کمرے میں گیا۔ وہاں کتابوں کے شلف پر ایک خط پڑا تھا۔ لکھا تھا۔۔۔۔۔
 ”پیارے ابا جان!

مجھے افسوس ہے کہ میں اپنا مقصد حیات نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ چچا اور آپ کے درمیان ناخوشگوار تعلقات کا باعث بنوں۔ اس لئے میں جارہا ہوں۔ آپ چچا جان کو بتا دیجئے کہ مجھے آپ کی بات منظور نہ تھی۔ لہذا میں گھر چھوڑ کر چلا گیا ہوں۔“
 اعظم علی کو اس حادثہ کا پتہ چلا تو وہ ناراض ہو کر اسی روز شہر واپس چلے گئے۔

رفیق نے بیٹے کو ڈھونڈنے کی دیوانہ وار کوششیں کیں لیکن سب ناکام رہیں۔ آخر وہ تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ اور اس جنت میں یوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگے جیسے جنت سے نکالے ہوئے ہوں۔
 ایک سال گزر گیا۔

ایک روز جب رفیق چپ چاپ حسب دستور باہر دھوپ میں بیٹھا تھا تو ایک اجنبی داخل ہوا۔ چودھری کے قریب آ کر اس نے

سلام کیا اور بولا ”آپ رفیق علی چودھری ہیں کیا؟“

رفیق نے اثبات میں سر ہلایا۔

نودار بولا ”میں کا کڑیاں کے رکھ سے آیا ہوں۔ ہمارے صاحب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے آپ کو بلایا ہے۔“

”مجھے بلایا ہے؟“ رفیق نے حیرت سے کہا۔

”جی“ وہ بولا صاحب نے کہا تھا کہ چودھری صاحب کو ساتھ لے آنا۔ ان سے کہنا کہ آپ کا بیٹا بہت بیمار ہے۔“

”شفیق بیمار ہے۔“ چودھری گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”وہ شفیق نہیں۔“ نودار نے کہا۔ ”وہ تو ہمارا گارڈ اکبر ہے۔ وہیں رکھ میں کام کرتا ہے۔“

رفیق از سر نو گھبرا گیا۔ ”اکبر“ وہ بولا

نودار نے جیب سے ایک تصویر نکالی اور چودھری کو تھادی۔ بولا ”صاحب نے کہا تھا یہ تصویر دکھا دینا۔“

تصویر میں ایک پینڈ ووردی پہنے کھڑا تھا۔ منہ پر گھنی داڑھی اور مونچھیں تھیں اور سر کے بال یوں کھڑے تھے جیسے کانٹے ہوں۔

کا کڑیاں رکھ میں پہنچ کر وہ شخص چودھری کو سیدھا صاحب کے پاس لے گیا۔

”آپ رفیق علی چودھری ہیں؟“ صاحب نے پوچھا۔

رفیق نے اثبات میں سر ہلایا۔

”شاہ کوٹ کے فارم سے آئے ہیں کیا؟“

”جی صاحب“ وہ بولا

”میرا بھی یہی خیال تھا۔ وہ بیمار پڑا ہے۔ دس دن سے بہت کمزور ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ آپ کو ابھی اس سے نہیں ملنا

چاہیے۔ آپ دو چار دن میرے پاس رہیں۔ پھر وہ صحت مند ہو جائے گا تو اسے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔“

”آپ کو میرا پتہ کیسے ملا؟“ چودھری نے پوچھا۔

”اس کے کمرے سے ایک پرانا لفافہ ملا تھا۔ اس پر آپ کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ دراصل شروع سے ہی ہم اکبر کے کوٹنگ و شبہ کی نظر

سے دیکھتے تھے۔ جب وہ گارڈ بھرتی ہونے کے لئے آیا تو صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ لیکن اس نے اپنے کوائف

چھپائے رکھے۔ ہم نے تو اسے کلرک بنانے کی پیشکش کی تھی لیکن وہ نہ مانا۔

یہاں ہمارا ہیڈ گارڈ قادرا ہے۔ اس کی ایک نوجوان لڑکی ہے مومی۔ وہ یہاں رکھ میں مومی کے ساتھ صبح و شام گھوما کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے قادرا سے کہا کہ مومی کو اپنے گاؤں بھیج دے ورنہ تیری بدنامی ہو جائے گی۔ بس جس روز سے وہ لڑکی گئی ہے اس روز سے یہ ڈانوا ڈول پھرتا ہے۔ میں نے مومی کو گاؤں سے بلوایا ہے تاکہ آپ اس کی زبانی ساری بات سن لیں۔“ وہ رک گیا۔

پھر بولا ”ان لوگوں کے سامنے یہ ظاہر نہ کریں کہ آپ اس کے باپ ہیں بلکہ یہ کہیں انکو آڑی کے لئے ہیڈ آفس سے آئے ہیں۔“

عین اس وقت قادرا اپنی بیٹی مومی کے ساتھ داخل ہوا۔ ”بیٹھ جاؤ لڑکی“ صاحب بولا ”قادرا تم چلو۔“ قادرا باہر نکل گیا لیکن مومی جوں کی توں کھڑی رہی۔

وہ سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی تھی۔ پتلی دہلی لیکن بڑی شوخ۔ طبیعت میں جھجک نام کو نہ تھی۔

”بیٹھ جا“ صاحب نے کہا۔

”نہ“ وہ بولی ”ماں نہیں بیٹھی ماں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“

صاحب نے کہا ”دیکھ یہ جو صاحب بیٹھے ہیں۔“ اس نے رفیق کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بڑے دفتر سے آئے ہیں۔ اکبرا گارڈ کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے۔ تجھے اکبرے کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے سچ سچ بتا دے۔ وہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے سب کچھ۔“

”پر۔۔۔۔۔“ مومی بولی ”صاحب مجھے کیا پتہ کہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔ بارہ چودہ مہینے ہوئے۔ وہ ادھر رکھ میں بیٹھا

تھا۔ ماں جو ادھر سے گجری تو بولا ادھر نیزے نیزے کوئی گاؤں ہے کیا؟

منے کہا ”ادھر کوئی گاؤں نہیں۔ جنگل کے صاحب کا دپتھر ہے۔ بس وہ بولا ”مجھے رات گجانی ہے۔“ اس پر مجھے ترس آ گیا۔ ماں سے باپو کے پاس لے آئی۔ باپو نے کہا۔ اسے توڑی وائے جھونپڑے میں ڈال دے۔

اگلے روز باپو نے پچھارے تیرا آگے پیچھے کوئی ہے۔ وہ بولا ”نہیں کوئی نہیں۔ پھر باپو نے پچھیا رہے تو نوخری کرے گا۔ وہ بولا ”کروں گا۔ اس پر باپو سے آپ کے پاس لے آیا۔ ادھراک گارڈ کی جگہوں کھالی تھی۔ آپ نے اسے گارڈ رکھ لیا۔ چلو بات کھتم ہوئی۔ رہنے کو کوٹھڑی مل گئی۔

پر صاحب جی وہ اکبر تو پاگل نکلا۔ اک دم پاگل۔ دسے کچ پتے کا پاگل پنا لگا تھا۔ مجھ سے بولا، مومی مجھے ایسا پتا ڈھونڈ دے جو زمین ماں جڑیں گاڑ دے۔ ایسی جڑیں گاڑ دے کہ وہ سوکھیں نہیں۔ سداہری رہیں چاہے برکھا ہونہ ہو۔ پانی ملے نہ ملے اور یہی نہیں صاحب جی وہ چاہے تھا کہ ایسا سبز پتا جو زمین پر پھیلتا جائے۔ پھیلتا جائے۔ جڑھیں گاڑتا جائے گاڑتا جائے۔

لو صاحب جی یہ کوئی ڈھونڈ تھی کیا۔ یو تو شیدائی پنا تھا۔ اور صاحب جی آپ سے جھوٹ کیوں بولوں۔ مجھے وس کے پاگل پن پر ترس آ گیا۔ ماں رکھ کی دیوانی تو پہلے سے ہی تھی۔ اس لئے اس کے ساتھ مل کر کچ پتا ڈھونڈن لگ گئی۔ آٹھ مہینے ہم دونوں صبح شام اندھیرے سویرے ہر وقت رکھ ماں دو کچ پتا ڈھونڈتے پھرے۔

چچی بات یو ہے صاحب جی کہ پاگل پنا جو وس کا تھا وہ مجھے بھی لگ گیا۔ بس دن رات۔ رات دن ہر وقت ایک دھن سوار تھی۔ ویسے صاحب یو بات تو پہلے روح سے جان گئی تھی کہ اکبراہم ماں سے نہیں۔ وہ وکھرا وکھرا دکھے تھا۔ وکی باتاں کھری وکھری تھیں۔ وکی رہت بہت وکھری تھی۔ وس نے یہاں اکرمندھونا چھوڑ دیا۔ داڑھی بڑھالی۔ سر کے وال یوں کھڑے کر لئے جیسے کانٹے ہوں۔ وس نے ہم سا بننے کے سارے جتنا کئے پروہ ہم سانہ بن سکا۔ پر ایک بات ہے صاحب جی۔ وہ مجھ سے اتنا گھل مل گیا جیسے میرے ساتھ کھیل کھیل کر بڑا ہوا ہو۔ مجھے ایسے لگنے لگا جیسے وہ میرا بچپن کا ساتھی ہو۔ جرا وکھرا نہ لگے تھا مجھے۔

صاحب جی ہم نے جھاڑیوں تلے گھس گھس کر وہ کچ پتا ڈھونڈا۔ کانٹوں والی بیلوں میں ڈھونڈا۔ رکھ کے درکھتوں پر چڑھ کر ڈھونڈا۔

”پھر وہ تمہیں ملا بھی؟“ صاحب نے پوچھا۔

”مل گیا۔ صاحب جی مل گیا۔ پروہ بوٹا نہ تھا۔ پتا نہ تھا۔ وہ ایک ویل تھی جو زمین کے ساتھ ساتھ سنبولے کی طرحیوں ریگے تھی اور پونے پونے پر زمین میں جڑھیں گاڑ دے تھی۔ وہ ویل ہم نے چار پانچ جگہوں پر لگا دی۔ چار جگہوں پر رکھ ماں اور پانچوں جگہ اکبرے کی کوٹھڑی سے باہر۔ اور ماں نے وسے بتا دیا کہ جد توڑی اس ویل کی ڈنڈی پر اک پتی بھی لگی رہے گی ویل مرے گی نہیں۔ پھر صاحب جی باپو میری اوارہ گردی پر غصے ہو گیا۔ بولا، تو اس گاڑ کے ساتھ ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ گاؤں میں برادری والے باتیں کرنے لگے ہیں۔ یا تو تو اس کے ساتھ گھومنا پھرنا چھوڑ دے۔ نہیں تو ماں تجھے گاؤں بھیج دے گا۔

میں نے باپو سے کہا، نہ باپو وس کے ساتھ گھومنا پھرنا نہیں چھوڑوں گی۔ بے شک تو مجھے گاؤں بھیج دے۔ گھسے میں بابا نے مجھے گاؤں بھیج دیا۔ پر جانے سے پہلے منے اکبرے سے کہہ دیا۔ منے کہا، اکبرے دیکھ پت جھڑ کے دن آرہے

ہیں۔ گھبرانہ جایو۔ جد توڑی اک پتی ویل پر لگی رہے گی، تد تک جز نہیں سوکھے گی۔“

صاحب بولا ”مومی تجھے پتہ ہے کہ اکبر تو اس دس روز سے چار پائی پر پڑا ہے۔ بیمار ہے۔ سوکھ کر کاٹا ہو گیا ہے۔“

”ہے اللہ“ وہ چلائی پھر بولی۔ ”نہیں نہیں“ صاحب جی وے کوئی بیماری نہیں۔ بس دس کی ویل کا پتا سوکھ گیا ہوگا۔ ماں ابھی دیکھ کر آئی۔“ یہ کہہ کر وہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

آدھ گھنٹے کے بعد وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ بولی ”منے کہا نہ تھا دس کی ویل کا پتا سوکھ گیا ہوگا۔ اور وہ پتے کے غم میں سوکھ رہا ہوگا۔ منے جا کر دیکھا تو اکبرے کے کوارٹر کی ویل سوکھی وی تھی۔ پھر ماں رکھ کو بھاگی۔ ادھر جا کر دیکھا تو چاروں جگہوں کی ویل ہری بھری تھی۔

پھر ماں اکبرے کے پاس گئی۔ منے کہا ”رے تو تو سچ مچ پاگل ہے۔ غم لگانے سے پہلے رکھ ماں جا کرو ہاں کی ویلیں تو دیکھ لی ہوتیں۔ وہ تو ہری بھری ہیں رے۔ ماں دیکھ آئی ہوں۔ چل تجھے دکھا دوں۔

مجھے دیکھ وہ اٹھ بیٹھا بولا ”سچی مچی ہری بھری ہیں؟“

منے کہا ”اور کیا ماں تجھے سے جھوٹ بولوں ہوں۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ پھر وہ دروازے کی طرف دیکھ کر چیخی۔ ”رے تو کیوں آ گیا میرے پیچھے پیچھے۔“

صاحب اور چودھری نے مڑ کر دیکھا۔

دروازے میں شفیق کھڑا تھا۔ اس نے دیوار کا سہارا لے رکھا تھا۔

”چل اب جا کر پڑ جا اپنی کھاٹ پر۔“ مومی نے اسے ڈانٹا۔

لیکن وہ حیرت سے اپنے باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

